حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۱

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

مرتب

مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ

بانی ومدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج وتحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد ساجد صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم ونگرانی: **مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ**

بیت السلام......اسلام کی ابدی صداقتوں اور سدا بہار تعلیمات سے معاشرے کو روشناس کرانے کیلئے قائم کیا گیا ایک اشاعتی ادارہ ہے

اغراض ومقاصد

■ علماء اسلام کی گرانقدر علمی تالیفات وتصانیف کو عصر حاضر کے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے زیور طبع سے آراستہ کرنا، تاکہ اسلاف کا ایمان افروز تحریری سرمایہ نئی نسل کو منتقل ہو سکے۔

■ اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ اور فروغ کیلئے اہل علم ودانش کی جدید تخلیقات وتحقیقات کو سلیقے اور ڈھنگ سے شائع کرنا۔

■ معاشرے میں امن، انصاف، علم وتحقیق، قومی یکجہتی وباہمی احترام کے جذبات کو فروغ دینا۔

امید ہے کہ! اس سفر میں آپ کی رہنمائی اور دعائیں بیت السلام کے ساتھ رہیں گی

عبدالصبور علوی
مدیر بیت السلام کراچی

◆

نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی فون: 021-32711878 موبائل: 0321-3817119
e-mail: baitussalam_pk@yahoo.com
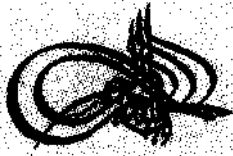
انتساب

خطباتِ حکیمُ الاسلام

کی ترتیب وتدوین کے اس ذرہ بے مقدار کو اپنے اس صاحب عزیمت وعظیم المرتبت استاذ مستقیم الاحوال بزرگ عارف ربانی کے نام منسوب کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمت قرآن حکیم میں مصروف عمل رہے اور طالبان قرآن کریم کی ایک دنیا ان سے اکتساب فیض کرتی رہی، بالآخر چالیس برس کی عظیم جدوجہد کے بعد اسی مسند پر جان جاں آفرین کے سپرد کردی، جہاں روز اول درس قرآن کریم کیلئے تشریف فرمائے ہوئے تھے میری مراد مجدد القرأت، استاذ الاساتذہ شیخ العرب والعجم، عارف باللہ سیدی ومولائی حضرۃ الحاج القاری رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ (خلیفہ ارشد حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ) سے ہے جن کے فیض صحبت، بے پایا عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندۂ ناچیز یہ کام کر پایا۔

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

عارف ربانی حجۃ القرأ، شارح شاطبی حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحبؒ کا

مکتوب گرامی

پیارے عزیز قاری محمد ادریس صاحب نورک اللہ بعلمہ وعوفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ بخیریت ہوں، مرض میں نہ اضافہ ہے اور نہ افاقہ، اللہ پاک سے احباب کی مخلصانہ دعاؤں کی بدولت صحت وقوت کا امیدوار وطلب گار ہوں، الحمدللہ سب نمازیں حرم شریف میں ہورہی ہیں، کبھی کبھی عمرہ بھی نصیب ہوجاتا ہے۔ ذہنی سکون، طبعی بشاشت میسر ہے۔ فللہ الحمد والشکر آپ کی مساعی حسنہ کے ثمرات خطبات حکیم الاسلام جلد اول مکمل سنے، بے حد لطف آیا۔ اللہ پاک حکیم الاسلام دامت برکاتہم اور جامعین خطبات کو اپنی شایانِ شان دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ یہ ایک مبارک اور عظیم کام کررہے ہیں، ان مواعظ، خطبات کا مقصود یعنی رجوع الی اللہ ورسولہ صحیح معنی میں امت مسلمہ کو عطا ہو۔

میرے پیارے! آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ اعراب سے معریٰ ہیں، طبع ثانی میں صحیح اعراب لگادیئے جائیں کہ پڑھنے والے سب حافظ وعالم نہیں ہوتے آج کل خطبات ج ۲ سُن رہا ہوں وعظ ''راہ اعتدال، ص: ۴۰ میں'' ھن ام الکتاب کا ترجمہ شاید لکھنے سے رہ گیا ہے طبع ثانی میں اس کو بھی پورا کردیا جائے۔

(تمام احباب کو بہت بہت سلام اور چھوٹے بچوں کے لئے پیار ودعا پیش ہوں، اس پرچہ کی دعائیں اللہ پاک سب کے حق میں قبول فرمائیں۔)

دعوات فتحیہ

حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو اور پورے خاندان کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو کامل عافیت وراحت اور سکون واطمینان کے ساتھ رکھ کر جملہ ضروریات اپنے غیبی خزانے سے پوری فرماتے رہیں اور آج سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک بے شمار، بے حساب، حلال، بابرکت، باوسعت رزق بھی آپ حضرات کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو عطا فرماتے رہیں، نیز آپ حضرات کو اور ہم سب کو آخرت کی فکر وشوق دنیا کی فکر وشوق سے کروڑ درجے زیادہ نصیب فرمائے، نیز موت اور خاتمے کے دن کو ہم سب کے لئے کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر خوشی کا دن بنا دیں، نیز ہماری قبروں کو اپنی رحمت سے جنت کا باغ بنا دیں اور دوزخ کے گڑھے نہ بنائیں اور سب کی تمام پریشانیوں کو راحتوں سے اور بیماریوں کو شفائے کامل عاجل مستمرہ سے اور مشکلات کو آسانیوں سے اور رنجوں اور غموں کو خوشیوں سے اور قرض داریوں کو سبکدوشیوں سے اور ع تنگیوں کو فراخیوں سے آن کی آن میں اور دم کے دم میں بدل دیں۔

امین یارب العٰلمین ۔بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

از: احقر کاتب السلام علیکم وعرض دعا قبول ہوں
بقلم عبدالقادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما
۱،۳،۱۹۸۲ (بعد عصر حرم نبوی شریف)

◆

کلمات تبرک

الحمدلولیہ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ

امـابـعـد ...... برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے۔علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہل علم، خطباء، آئمہ مساجد اور مقررین ومبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہوگیا۔

الحمدللہ بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظر عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ **وفوق کل ذی علم علیم.**

عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہٗ (فاضل خیرالمدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظر عام پر آگئی۔ دل سے دعاء ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہٗ کی اس محنت وجانفشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے، اور اپنی جناب خاص سے اس کا اجر بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل، صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید بر مزید خدمت دین متین کے مواقع فراہم فرمائے، اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔(آمین) **وھو یھدی السبیل**

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حرف سپاس

ناسپاسی ہوگی اگر اس مجموعہ صد رنگ کا سر نقطۂ آغاز اس بزرگ و مہربان شخصیت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مجھے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کردیا، تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی ہی شخصیت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت و عظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکت اسلوب کا تقاضا کرتا ہے، اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلۂ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کی علمی رہنمائی اور عملی شفقت و عنایت سے ہی میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستہ پند و حکمت کو مرتب کرسکوں۔ دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظل عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جناب خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایان شان اجر و ثواب سے خوش وقت اور شاد کام فرمائے اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ (آمین)

محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

حیاتِ طیبؒ......ایک مختصر خاکہ

- ......۱۳۱۵ھ جمادی الثانی، پیدائش، (تاریخی نام مظفرالدین اور اصلی نام محمد طیب رکھا گیا)
- ......۱۳۳۷ھ تکمیل درس نظامی
- ......۱۳۵۰ھ خرقہ خلافت از حضرت تھانویؒ
- ......۱۳۳۷ھ ابتدائے تدریس (جو ۱۳۴۳ھ تک جاری رہی)
- ......۱۳۴۸ھ سے ''اہتمام دارالعلوم دیوبند'' کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کردی گئیں۔
- ......۱۳۶۰ھ ماہنامہ رسالہ ''دارالعلوم'' کا اجراء
- ......۱۳۶۸ھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لئے حضرت قاری صاحب کا بحیثیت رکن انتخاب
- ......۱۳۹۲ھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے حضرت مہتمم صاحب کا بطور صدر انتخاب۔
- ......۱۴۰۰ھ دوراہتمام کا آخری سال، دارالعلوم کے اہتمام سے علیحدگی۔
- ......۱۴۰۳ھ (۶ شوال/۱۷/ جولائی ۸۳ء) وفات حسرت آیات
- ......تصنیفات وتالیفات کی تعداد ۵۹
- ......دیگر تحریری مواد کی تعداد ۱۷۹ (مقدمات تقریظات اور ملفوظات ومواعظ کی صورت میں)
- ......تقریباً ۳۶ کتب اور رسائل میں آپ کا تذکرہ

مقدمہ

از

ابن الحسن عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام گرامی محتاج تعارف نہیں وہ ازھر ہند دارالعلوم دیو بند کے نصف صدی تک صدر و مہتمم رہے، انہوں نے اپنے دور میں دارالعلوم کو ترقی وشہرت کے بام عروج تک پہنچایا، ان کا دور دارالعلوم دیو بند کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں دارالعلوم کا فیض ہندوستان کے کونے کونے سے لیکر دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلا اور اس دور میں دارالعلوم سے نکلنے والے رجال کار نے ایک عالم کو سیراب کیا۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک باکمال عالم دین، ایک مدبر رہنما و منتظم اور خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسرے اوصاف کے ساتھ ساتھ قوت بیان کا وصف بھی عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک شیریں بیان خطیب وواعظ اور دل کی گہرائیوں تک اپنی آواز اتارنے والے مبلغ وداعی تھے، وہ دھیمے اور سبک رفتار اسلوب میں سچائیوں اور صداقتوں کے دریا بہاتے اور دلوں کے خشک کھیتوں کو سیراب کرتے چلے جاتے، ان کے اس وصف سے متعلق حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ حقائق وواقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور علوم وھبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔ حضرت مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب کیا ہوگا اور بعض

اوقات ایک ایک دن کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی لیکن ان کی ہر تقریر کا موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف و اسرار کے ایسے گل و لالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آ جاتی۔ ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو بلاتکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے؟'' پیش کیا کہ یہ انکار کے لئے بھی ہے اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد و تحسین کے لئے بھی ہے اور تحقیر و تقبیح کے لئے بھی، شاباش اور آفرین کے لئے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لئے بھی۔ الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے؟'' کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے۔ اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔ حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع بھی ہوتی رہیں۔ حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہ (خطیب مسجد غفوریہ، حسن پروانہ کالونی ملتان) نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت کی جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئیں ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں تو امت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔'' (شخصیات و تاثرات، جلد ا، صفحہ: ۲۱۵)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی وصف بیان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر،

دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی، اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر وزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی، اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔ لاہور میں ایک صاحب، علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے، طرح طرح کی بدعات میں مبتلا، بلکہ ان کو کفر وایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے، اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ مس اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا، اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آ گیا، دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آگے موم ہو چکا تھا، میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ، اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔'' (نقوش رفتگان: صفحہ ۱۹۳)

اللہ جل شانہ اپنے نیک بندوں کے آثار وخدمات کی حفاظت کے لئے لوگوں کو مسخر کر دیتے ہیں اور وہ ان آثار وخدمات کی حفاظت کیلئے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو وقف کر دیتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مدیر و مہتمم ہونے کی حیثیت سے حضرت حکیم الاسلام کو دنیا کے مختلف خطوں میں جانے اور وہاں دین اسلام کی دعوت وتبلیغ کی صدا لگانے کا موقع ملا، ان کے یہ خطبات ومواعظ کہیں قلم وقرطاس کے ذریعے اور کہیں ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ ہوتے رہے۔

حضرت مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری مدظلہ کے دل میں اللہ جل شانہ نے ان مواعظ وخطبات کو جمع کرنے اور کتابی شکل میں لانے کا داعیہ پیدا فرمایا اور انہوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگی کے ماہ وسال وقف کئے، وہ قرآن کریم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ برسوں اس عظیم کام میں لگے رہے اور یوں امت کے لئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات ومواعظ کا قیمتی اثاثہ محفوظ کر گئے...... حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ خطبات، اسلام کے عقائد وعبادات، معاشرت ومعیشت، اخلاق واعمال، تہذیب وتمدن اور تاریخ وروایات کی تشریحات وحکمتوں کا گنج ہائے گراں مایہ ہیں......

مولانا قاری محمد ادریس صاحب صاحب کی مرتب کردہ ان خطبات کی اب تک شائع ہونے والی جلدوں میں مندرجہ ذیل ایک سو بیس خطبات وموضوعات آ گئے ہیں:

1 ......خطبات حکیم الاسلام ۔ جلد اول......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ تک ② مقام نبوت اور اس کے آثار ومقاصد ③ کتاب خداوندی اور شخصیات مقدسہ ④ معجزہ علمی ⑤ جہلائے عرب سے مقام صحابیت تک ⑥ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ⑦ حیوٰۃ طیبہ ⑧ فلسفہ علم ⑨ وعظ یوسفی

2 ......خطبات حکیم الاسلام ۔ جلد دوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① معارف القرآن ② رحمۃ للعالمین ③ بیت اللہ الکریم ④ عبادت وخلافت ⑤ اخلاص فی الدین ⑥ صحبت صالح ⑦ راہ نجات ⑧ راہ اعتدال ⑨ مقصد حیات ⑩ فلسفہ موت ⑪ اسلام میں تصور آخرت ⑫ فضیلت یوم الجمعہ ⑬ سنت حضرت خلیل علیہ السلام ⑭ حقیقت نکاح۔

3 ......خطبات حکیم الاسلام ۔ جلد سوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① ذکر اللہ ② معرفت باری تعالیٰ ③ رضائے الٰہی ④ طریق اصلاح ⑤ تعارف اہل حق ⑥ تسکین فطرت ⑦ ادب اور اختلاف رائے ⑧ حقوق مالیہ ⑨ خطبہ طیبہ۔

4 ......خطبات حکیم الاسلام ۔ جلد چہارم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① مقصود بعثت ② یاد حق ③ نبوت وملوکیت ④ ثمرات علم ⑤ عمل صالح ⑥ انسانی زندگی کا نصب العین ⑦ پرسکون زندگی ⑧

سیرت اور صورت ⑨ شعب الایمان ⑩ تعلیم وتبلیغ ⑪ تبلیغی جماعت اور اصلاح ⑫ جماعتی تبلیغ ⑬ فضیلت النساء ⑭ پیغام ہدایت ⑮ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ⑯ اسلامی تمدن ⑰ درس ختم بخاری ⑱ اظہار تشکر۔

5 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد پنجم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① شان بعثت ② عناصر سیرت ③ اسلام عالمی مذہب ہے ④ انسانی فضیلت کا راز ⑤ مقصد نعمت ومصیبت ⑥ افادات بخاری (حصہ اول) ⑦ افادات بخاری (حصہ دوم)

6 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ششم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① علمی معجزہ ② خلافت تجوید ③ نجوم ہدایت ④ آغاز بخاری ⑤ تعلیم وتدریس ⑥ تاثیر الاعمال ⑦ آداب دعاء ⑧ الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم ⑨ سائنس اور اسلام۔

7 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہفتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① خطبہ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند ② اساس توحید ③ حج بین الاقوامی عبادت ④ اہمیت تزکیہ ⑤ جواہر انسانیت ⑥ ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج ⑦ تعلیم نسواں ⑧ افادات علم وحکمت۔

8 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہشتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں خطاب ② موتمر اسلامی قاہرہ میں خطاب ③ عالمی موتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب ④ تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار ⑤ مذہب اور سیاست ⑥ مسلم پرسنل لاء ⑦ اسلام اور آزادی ⑧ عروج وزوال ⑨ تیونس اور مراکش کی جدوجہد آزادی ⑩ آئینہ خدمت جمعیۃ علمائے ہند ⑪ نصاب تعلیم کی تدوین ⑫ تصویر سازی کی مذہبی اور تمدنی حیثیت ⑬ اشتراک مذہب ⑭ دنیا وآخرت ⑮ عالم اصغر ⑯ افادات علم وحکمت۔

9 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد نہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① اساسی عبادات ② اہمیت نماز ③ رمضان اور اس کے مقاصد وبرکات ④ فضیلت تقویٰ ⑤ اسلام میں عید کا تصور ⑥ محبت ومعیت ⑦ تعلیم جدید ⑧ مرکز سعادت ⑨ امتیاز دار العلوم ⑩ آزادی ہند کا خاموش رہنما ⑪ اکابر دیوبند اور آزادی ہند ⑫ حدیث پاکستان ⑬ امارت شرعیہ ⑭ الواعظ ⑮ اظہار تعزیت ⑯ جامع مذہب ⑰ افادات علم وحکمت۔

10 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد دہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام ② راہنمائے انقلاب ③ عظمت حفظ ④ آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب ⑤ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام ⑥ تکمیل انسانیت ⑦ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ⑧ افادات علم وحکمت۔

11 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد یازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① فلسفہ نماز ②

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰-۴۸۔

تفسیر سورۃ ملک ③ افادات علم وحکمت۔

12 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد دوازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① تفسیر سورہ قلم ② آثار صحبت

ان خطبات میں بیان ہونے والی احادیث وروایات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے، خطبات کے مرتب مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہ کی سوانح پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ ان کا حق ہے، حضرت قاری ہوشیار پوری صاحب ہمارے بزرگ استاد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں، مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنی کے شاگرد اور دارالعلوم کراچی کے ہردل عزیز استاذ تھے، وہ ہرفن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، مجھ ناکارہ پر ان کی خصوصی شفقت نظر اس لئے تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمٰن تکرار کی جماعت میں میرے ساتھ تھے، ایک بار نماز مغرب کے بعد جب مسجد میں تکرار کی جماعتیں لگ گئیں تو حضرت تشریف لائے، مجھے بلا کر فرمایا، ہم عمرے کے لئے جارہے ہیں، آپ حبیب کے ساتھ محنت کریں، ہم آپ کے لئے وہاں جا کر دعا کریں گے......ان کا یہ جملہ آج تک کانوں میں رس گھول رہا ہے اور جو تھوڑی بہت خدمتِ دین کی توفیق مل رہی ہے یہ ان رجالِ باصفا اساتذہ اور بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے! حضرت قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب نے ہمارے کہنے پر اپنے جو حالات بھیجے ہیں وہ نذر قارئین ہیں:

> ’’خطباتِ حکیم الاسلام‘‘ کی ترتیب وتدوین محض اور محض فضل خداوندی کا مظہر اور ایک نااہل کی ستاری کے علاوہ اس کی تعبیر میرے لئے ممکن نہیں۔تاہم اس کی نسبت سے قارئین ’’خطبات‘‘ مجھے جانتے ہیں، شکل وشباہت سے شناسائی نہیں۔آپ کے حسب ارشاد اپنے احوال کے سلسلہ میں چند حروف لکھ دیتا ہوں، اس لئے کہ اصل کام ہے نہ کہ نام۔
>
> خاندانی پس منظر......میرے والد گرامی مرحوم نے ایک کاشت کار گھرانے میں آنکھ کھولی تاہم گھر کی فضا مذہب کے قریب اور دین دار تھی اور اہل حق سے گہرا تعلق تھا، اسی جذبے کی وجہ سے دادا مرحوم حاجی شیر محمد صاحب نے اپنی اولاد کے لئے دینی تعلیم دلوانے کا راستہ چنا۔والد مرحوم نے مختلف مدارس میں پڑھا، گوجرانوالہ کے کسی مدرسہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہ وہاں سے تعلم حاصل کی، پھر دارالعلوم دیو بند بڑے درجات کے اسباق کے لئے حاضری کا شرف نصیب ہوا۔داخلہ امتحان حضرت اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کے سپرد ہوا ’’ہدایہ اولین‘‘ میں سے کسی مقام کا انتخاب کر کے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ’’یہاں سے یہاں

تک مطالعہ کر کے لاؤ۔'' والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تعلیمی زمانہ میں مجھے کاپیوں سے دلچسپی کم اور نفسِ کتاب سے مناسبت زیادہ تھی، چنانچہ میں نے مطالعہ کرلیا اور عرض کیا کہ: ''حضرت! میں حاضر ہوں۔'' فرماتے تھے کہ جب میں نے عبارت پڑھی تو حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''کافی ہے، مزید ضرورت نہیں۔'' اندازِ عبارت سے داخلہ مرحمت فرمانے کا فیصلہ فرمالیا تھا۔

الحمدللہ! اس کے بعد والد گرامی ان طلباء کرام کی فہرست میں شامل ہوگئے، جن کے لئے'' منجانب اللہ القا' وانتخاب'' کے مبارک الفاظ حلقۂ دیوبند میں مصروف ومتعارف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں دورۂ حدیث شریف شیخ الاسلام حضرت محترم شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی، والد صاحب مرحوم کے ہم درسوں میں چند نمایاں حضرات یہ ہیں:

۱...... حضرت اقدس صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان محترم ومکرم مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ العالی۔

۲...... حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔

۳...... برادر محترم جناب مولانا مفتی خالد محمود صاحب زید مجدہم، مدیر اقرأ روضۃ الاطفال پاکستان کے والد گرامی حضرت محترم مولانا عبدالمجید صاحب سکھروی مرحوم۔

دارالعلوم دیوبند میں ختم بخاری شریف کے موقع پر ہمارے نانا مرحوم داعی کبیر حضرت محترم مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب ہوشیارپوری جو کہ خاتم المحدثین حضرت اقدس مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید نیز حضرت اقدس امام القرأ قاری محی الاسلام عثمانی نور اللہ مرقدہ (استاذ محترم حضرت اقدس شاطبی وقت قاری فتح محمد صاحب نوراللہ مرقدہ) کے بھی شاگرد رشید تھے۔

ان حضراتِ اہل اللہ سے تعلق کی بنا پر دنیوی رسوم ورواج سے طبیعت میں بہت تنفر تھا، چنانچہ بخاری شریف کے اختتامی سبق کے موقع پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اس سال تکمیل کرنے والے طلباء کرام میں اگر ''جٹ'' برادری کا کوئی طالب علم آپ کے ہاں سند فراغت حاصل کررہا ہو تو میں چاہتا ہوں کہ اپنی بچی کا نکاح اسی مبارک مجلس میں اس سے کردوں۔''

آسمانی فیصلوں کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے، والد مرحوم کا نکاح دارالعلوم دیوبند کے

دارالحدیث میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا اور اس پر تقریر فرمائی کہ: ’’لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں کے کام نہیں ہوتے، مولویوں کے کام تو اس طرح آسانی ہوتے ہیں۔‘‘

بہر حال یہ ’’خاندانی جوڑ‘‘ خالص دینی بنیادوں پر تھا، اس میں کوئی دنیوی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ چنانچہ اس کا ثمر یہ نکلا کہ نانا مرحوم کی نسبت سے ہمارے گھرانے میں ’’شغف بالقرآن الکریم‘‘ اور حفظ وقرأت کا اس قدر چرچا ہوا اور فضا تیار ہوئی کہ والدہ مرحومہ کے بعد بھی ان کی تمام اولاد قرآن حکیم کی تعلیم وتعلم میں بفضلہ تعالیٰ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد آئندہ نسل بھی حفظ وضبط کے ساتھ ساتھ قرأت عشرہ تک حاصل کر چکی ہے۔ والد مرحوم کی نسبت سے شعبہ کتب سے مناسبت ہوئی اور الحمد للہ! ہم چار بھائی عالم ہیں اور درجۂ کتب سے تھوڑی بہت شدبد رکھتے ہیں۔

چنانچہ والد صاحب مرحوم نے پاکستان آ کر حضرت فخر الفقہاء مولانا خیر محمد صاحب مرحوم (بانی جامعہ خیر المدارس ملتان) کی زیر نگرانی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بورے والا، جہانیاں کے مدارس میں کچھ وقت پڑھانے کے بعد فیصل آباد کے پسماندہ علاقہ ’’ماموں کانجن‘‘ میں تقریباً بائیس سال پڑھایا۔ مشکوٰۃ کے بعد یہاں کے طلبا کرام جامعہ خیر المدارس ملتان میں دورۂ حدیث شریف کرتے، ازاں بعد دارالعلوم کورنگی کراچی میں بیس سال سے زیادہ تدریس سے وابستہ رہے۔

میری پیدائش ملتان شہر میں ہمارے نانا مرحوم کے گھر اندرون حرم گیٹ ۱۹۵۱ء بوقت سحر ہوئی، نانا مرحوم جس مسجد (بیری والی مسجد حرم گیٹ) میں نماز کے لئے جاتے تھے، وہاں اعلان کروا کر دعا کروائی۔ نیز والد گرامی مرحوم نے میرا نام اپنے استاذ محترم کی محبت میں ’’محمد ادریس‘‘ رکھا کہ ان کی ابتدائی شفقت دارالعلوم دیوبند کے مبارک قافلہ میں شرکت کا سبب بنی تھی۔ والد مرحوم اپنے تدریسی سلسلہ میں مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ماموں کانجن (فیصل آباد اس وقت لائل پور) میں تشریف لے گئے اس لئے ابتدائی تعلیم حفظ قرآن کریم وہاں ہوئی، اس وقت وہاں یہ حضرات جامعہ خیر المدارس کے توسط سے تشریف لاتے تھے، حسب مقدور ان سے قرآن کریم پڑھا:

۱.....قاری محمد یعقوب صاحب ملتانی۔

۲.....قاری محمد دین صاحب مرحوم جو بلوچستان کے تھے، والد صاحب مرحوم کے کتب

میں شاگرد بھی تھے، بہت بلند پایہ مدرس تھے، چھوٹے بچوں کے لہجہ اور تصحیح حروف میں امتیازی خصوصیات رکھتے تھے۔ (چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ خیر المدارس نے ان کو پھر اپنے ہاں بلوالیا اور عرصہ دراز تک خیر المدارس میں ایک منجھے ہوئے استاذ کی طرح خیر المدارس پر اپنی جان نچھاور کی اور اچھے اچھے حفاظ تیار کر کے شعبہ گردان میں بھیجے)۔

۳.....محترم حضرت حافظ اللہ بخش صاحب ملتانی۔

۴.....اور ان کے شاگرد حافظ فیض بخش صاحب مرحوم۔

ان سے تکمیل قرآن کریم کے بعد خیر المدارس ملتان میں مقری اعظم حضرت اقدس مولانا قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہ کے درجہ ضبط وتجوید میں بذریعہ قرعہ اندازی داخلہ مل سکا اور حسب ہدایت ڈاک کارڈ لے کر شوال المکرم ۱۳۷۸ھ میں حضرت اقدس کے اقدام عالیہ میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ یہاں کے تعلیمی معیار تک پہنچنے کے لئے دو سال ضبط میں صرف ہوئے، ہمارے رفقاء کرام میں خود صاحبزادہ محترم قاری محمد عبید اللہ بن قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

شعبہ تحفیظ سے فراغت کے بعد والد مرحوم نے اپنی نگرانی میں ماموں کانجن میں کتب کا آغاز کرایا، ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ درجہ کتب کے ابتدائی مدرس کی حیثیت سے حسب ارشاد حضرت بانی جامعہ خیر المدارس ملتان جلوہ افروز تھے، والد مرحوم صدر مدرس تھے اور دیگر اساتذہ کرام بھی تھے۔

اس لئے تقسیم اسباق کے مطابق علم صرف حضرت اقدس لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی، اجرأ صرف اور صرف میں بندہ کو دو حرف آنے لگے۔ البتہ نحو کے اسباق زیادہ تر والد صاحب مرحوم سے پڑھے، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح جامی والد مرحوم سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لئے والد مرحوم نے بندہ کو جامعہ خیر المدارس میں داخلہ دلوایا۔ اس وقت کے اکابر میں ہدایہ اولین حضرت اقدس مولانا محمد شریف صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ مہتمم جامعہ کے پاس، شرح جامی حضرت شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد (بانی جامعہ امدادیہ، فیصل آباد) کے پاس پڑھی۔

شرح جامی کا امتحان حضرت اقدس بانی جامعہ خیر المدارس نے خود لیا اور میرے سے

الف لام کی اقسام پوچھیں، مجھے شرح جامی از بر اس لئے تھی کہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کے پاس پڑھ کر آیا تھا اور یہاں نظم جماعت کی وجہ سے دوبارہ اس کا پڑھنا ضروری تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے استفسار پر جب میں نے اس کی تمام اقسام اچھی طرح سنا دیں تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا: ''توں کتھوں آیاں؟'' (تم کہاں سے آئے ہو؟)، میں نے عرض کیا: ''ماموں کانجن سے۔'' فرمانے لگے: توں مولوی شفیع کا منڈا؟ (آپ مولانا محمد شفیع صاحب کے بیٹے ہو؟)، میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمانے لگے: ''تااِیں وسدا پیا'' (اسی لئے صحیح بتا رہے ہو)۔ میری یادداشت کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس میں ۵۲ نمبر دیئے، مع انعامی ۲ نمبرات۔ اس لئے کہ اس وقت درجہ کتب میں ۵۰ نمبر آخری حد ہوتے تھے۔ ۴۰ سے کم ہو جاتے تو طالب علم ناکام شمار ہوتا تھا۔

اس کے بعد اگلے سال دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا میں داخلہ لیا، اس وقت یہاں اجلہ علماء رونق افروز تھے، معقولات اور فنون کی کتب کا بڑا چرچا تھا اور حقیقی تھا، بغیر کسی پابندی اور ضوابط کے طلباء کرام میں بڑا تعلیمی انہماک اور ذوق مطالعہ تھا، یہاں حضرت اقدس علامہ صوفی محمد سرور صاحب زید مجدہم (حال جامعہ اشرفیہ لاہور) کے پاس مختصر المعانی، جلالین شریف اور حضرت العلام مولانا ظہور الحق صاحب مرحوم کے پاس حسامی اور دیوانِ حماسہ پڑھیں، مولانا محمد امین صاحب کے پاس متنبّی اور مقامات حریری پڑھیں، اور اس سے آئندہ برس مشکوٰۃ شریف حضرت اقدس محدث جلیل مولانا عبدالمجید صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم (بانی جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا، حال امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان) کے پاس اور ہدایہ رابع بھی انہیں سے پڑھا۔ نیز بیضاوی شریف اور ہدایہ ثالث حضرت العلام شہنشاہ تدریس مولانا منظور الحق صاحب مغفور کے پاس پڑھیں اور حضرت العلام مولانا علی محمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا کے پاس توضیح وتلویح اور مسلم الثبوت پڑھیں۔ یہاں موقوف علیہ کے سال سہ ماہی امتحان کے موقع پر بندہ کی الحمدللہ پہلی پوزیشن آئی اور اساتذہ کرام کی نظرِ عنایت نصیب ہوئی۔

آئندہ سال دورۂ حدیث شریف کے لئے کبیر والا سے ایک بڑی تعداد جامعہ خیر المدارس ملتان آ گئی، یہ ناکارہ بھی اس میں شامل تھا، چنانچہ یہاں بخاری وترمذی

حضرت العلام جامع المعقول والمنقول مولانا محمد شریف کشمیری صاحب مرحوم کے پاس، مسلم شریف حضرت اقدس مولانا مفتی محمد عبداللہ ڈیروی صاحب مرحوم کے پاس، سنن ابی داؤد حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی عبدالستار صاحب مرحوم کے پاس، طحاوی شریف حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کے پاس، سنن نسائی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے پاس اور ابنِ ماجہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے پاس پڑھی۔ اس تمام تر تفصیل کے بعد بندہ نے بھی ''مولوی'' بن کر ۱۳۹۳ھ میں سند فراغت وتکمیل جامعہ خیر المدارس سے حاصل کر لی جبکہ قاری الحمد للہ پہلے ہی بن چکا تھا۔

مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے ساتھ ہمارا ایک دیوار کے اشتراک کے ساتھ ۱۲ سال ہمسایہ داری کا یادگار اور محبت بھرا تعلق رہا) کے قلم نے ہمارے سامنے اپنے سفر کا آغاز کیا اور خوب یاد ہے کہ بعض اوقات آسان مسائل وعنوانات پر حضرت والا مشق کیا کرتے تھے اور ہم طلبا دور دور سے ان کی نشست و برخاست کے انداز اور قلم وقرطاس کے ساتھ انہماک کے طریقے دیکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ''ماڈرن اسلام'' کے فتنہ نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندر چھپے ہوئے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کو جگا دیا اور ان کا قلم سیاہی کی بجائے تلوار کی چمک لے کر باطل کے سامنے نمایاں ہوا، ماہنامہ ''بینات'' میں آپ کے مضامین کو جگہ ملنی شروع ہوئی اور حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جوہر شناس طبیعت نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہاں بلا کر اپنا ہم نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ہم کام بھی کر لیا، حضرت کو دیکھ کر مجھے لکھنے کا شوق ہوا اور ملتان میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت میں مہینے کے تقسیم کردہ ایام میں کراچی سے تشریف لایا کرتے تھے، ان دنوں بندہ نے حضرت والا سے اصلاح مضامین لی اور اسی سے ترتیب وتدوین اور قلم پکڑنے کی معمولی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔

حضرت اقدس مقری اعظم قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کردہ نسبتِ قرآن کی وجہ سے الحمدللہ شعبۂ تحفیظ رشید آباد کالونی میں پڑھایا پھر شش ماہی امتحان کے بعد مسجد غفوریہ لکڑ منڈی چوک ملتان میں بطور خطیب، امام ومدرس قرآن کریم تقرر ہوا۔

یہاں طلبا ندارد تھے، چند ماہ کے انتظار اور طویل دعاؤں کے بعد طلبا کا رجوع ہوا تو یہاں جگہ کم پڑ گئی اور ہمارے بڑے ماموں حاجی محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے اپنی صابون فیکٹری کے ساتھ تقریباً ۲۱ مرلہ جگہ خریدی ہوئی تھی جو فیضی روڈ علی ولی کالونی میں تھی، انہوں نے وہ جگہ مسجد غفوریہ کے احباب کرام اور ناکارہ کے سپرد کی۔ الحمد للہ! یہاں تحفیظ القرآن الکریم کے نام سے مدرسہ ۱۴۰۱ھ میں قائم ہوا۔ الحمد للہ! اپنے علاقے میں مرکزی حیثیت کے ساتھ پاکستان کے دور دراز علاقوں سے طلبا کرام کا رجوع ہوا اور تکمیل کر کے حسب ہمت تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں۔

شعبہ حفظ سے جو طلبا کرام فراغت حاصل کرنے کے بعد درجہ کتب میں داخلہ لینے کے لئے دیگر مدارس میں جاتے تو ہم لوگوں کو بڑی حسرت ہوتی ''کاش ہمارے پاس جگہ ہوتی تو ہم ان طلبا کرام کو خود پڑھاتے'' چنانچہ ایک مرتبہ میرا ایک جامعہ میں جانا ہوا تو میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہمارے حفاظ طلبا کرام اس جامعہ میں ۴۱ ہیں۔ بہر حال والد گرامی مرحوم کا بہت اشتیاق اور بڑی تمنا تھی کہ تحفیظ کے ساتھ ساتھ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے۔

بڑے ماموں صاحب مرحوم علی ولی کالونی میں اپنی فیکٹری بیچ کر پیر کالونی میں چلے گئے، وہاں فیکٹری کے لئے جگہ لی تو وہاں اہلِ بدعت کی مساجد کی وجہ سے اپنے صحیح عقیدہ کے مطابق نماز پڑھنے اور بچوں کے لئے تعلیم و تعلم کی نیت سے جگہ خرید لی جو اس وقت دو کنال چھ مرلہ پر مشتمل تھی، پھر ۱۹۹۶ء میں احقر کے سپرد کی ہم نے آہستہ آہستہ اپنے رفقاء کرام سے مشاورت کر کے مزید خریداری کی جو الحمد للہ اس وقت تک ۴۵ کنال ہو چکی ہے۔ اس جگہ کو ہم نے جامعہ دار العلوم رحیمیہ کا نام دیا، آج الحمد للہ! جامعہ میں ۱۵۰۰ طلبا و طالبات شاخوں سمیت پڑھ رہے ہیں، شعبہ تحفیظ میں تقریباً پندرہ درس گاہیں، دورۂ حدیث شریف کے مکمل اسباق ہیں اور شعبہ تخصص فی الافتاء بھی بحمد للہ جاری ہے۔

الحمد للہ! اس وقت تک جامعہ سے تکمیل کرنے والے کل حفاظ کی تعداد ۲۵۰۰ ہو چکی ہے، جس کے پیچھے نسبت رحیمی کی کارکردگی اور اعجاز قرآنی ہے اور فضلا درس نظامی کی تعداد ۳۰۷ ہے، بہر حال یہ سب کچھ حق تعالیٰ شانہ کا کرم، اساتذہ کرام کی توجہات

اور والدین مرحومین کی دعاؤں کا مظہر ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس حضرات کی دعائیں، چونکہ دائمی ہوتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ تعلیم وتعلم کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ انشاء اللہ مزید ترقیات وبرکات سے سرفراز فرمائیں گے۔

''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی بارہ جلدوں کی ترتیب وتدوین میں ''ربع صدی'' سے زیادہ وقت صرف ہوا، اس لئے کہ تقاریر وخطبات دستیاب نہیں تھے بالتدریج جیسے مواد ملتا گیا، اسی سے جلد تیار کی جاتی رہی، اس لئے جلد نمبر کے حساب سے مجموعہ تیار ہوکر اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے مجموعہ کے تیار ہونے میں دراصل ایک روحانی قوت کا کرشمہ تھا، اولاً اس میں حضرت العلام حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور خاندانی علمی وجاہت پھر دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے دنیا بھر کی شہرت واحترام نے اسے پذیرائی بخشی۔

ثانیاً ہمارے شیخ الشیخ مقری اعظم قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں نے اثر دکھایا، جب میرے پاس صرف چار تقاریر مرتب تھیں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا سفرِ ملتان ہوا، مدینہ طیبہ سے آمد ہوئی تھی ''زہے قسمت'' مسجد غفوریہ میں آمد مبارک ہوئی۔ بندہ نے یہ تقاریر مرتب شدہ پیش خدمت کیں اور عرض کیا کہ: ''ان پر دم فرمادیجئے یہ بارگاہ عالی خداوند قدوس میں قبول ہوجائے۔'' چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دم فرمایا، دوسری درخواست حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہ پیش کی کہ: ''مجموعہ بہت کم ہے، آپ ازراہ کرم یہ دعا فرمادیں کہ تقاریر بڑی تعداد میں مل جائیں اور مجھے اس سلسلہ میں سفر نہ کرنا پڑے اور تعلیمی طور پر درس گاہ کا ناغہ اور حرج نہ ہو۔'' یہ بات چونکہ حضرت والا کے مزاج عالی کے مطابق تھی تو بہت خوشی ہوئی۔ ایک ایسا منظر بن گیا جس میں بعض اوقات اہل اللہ سے کوئی غیر اختیاری جذبہ کے تحت دل کی گہرائیوں سے دعا نکل جاتی ہے، اور الحمد للہ! بندہ نے اس کا مشاہدہ کیا کہ دنیا بھر سے مجھے کیسٹیں دستیاب ہوئیں، مگر اس کے لئے مجھے سفر نہیں کرنا پڑا، ظاہری سبب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے برادر محترم مولانا قاری محمد رفیق صاحب مقیم جدہ اور برادر محترم جناب مولانا قاری سیف الدین صاحب مقیم ریاض سعودیہ اس کا ذریعہ بنے تاہم ان حضرات کے علاوہ بھی بہت سی تقاریر دستیاب ہوئیں۔ پھر حضرت والا سے اس ناکارہ کا مسلسل رابطہ رہا،

حرمین شریفین سے حضرت دعائیں دیتے رہے، ان ادعیہ مبارکہ سے یہ قبولیتِ عامہ نصیب ہوا اور الحمدللہ! اب تک اس کتاب کو علمی دنیا میں استحکام نصب ہوا۔

اب عزیزِ محترم عبدالصبور علوی سلمہٗ تخریج وتحقیق کے ساتھ اعلیٰ معیار پر طباعت کا اہتمام کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی کو قبول ومنظور فرمائے اور ہم سب کے لئے نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین (حضرت مولانا قاری) محمد ادریس ہوشیارپوری) مدیروبانی جامعہ دارالعلوم رحیمیہ، ملتان

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات ومواعظ میں احادیث وروایات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے، وعظ ونصیحت اور تقریر وخطابت میں عموماً احادیث کریمہ کی صحت کے اس معیار کو بسااوقات برقرار نہیں رکھا جاسکتا جس کا محدثین کرام اہتمام کرتے ہیں اور خود حضرات محدثین کے نزدیک فضائل کے باب میں بعض شرطوں کے ساتھ ضعیف احادیث کو بھی بیان اور ذکر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات میں اس طرح کی احادیث پائی جاتی ہیں، احقر نے چند سال قبل جب ان خطبات کا مطالعہ کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان موثر خطبات ومواعظ کی احادیث کریمہ کی تخریج اصل مصادر اور مراجع سے ہونی چاہئے۔ بعض احادیث موضوع ہوتی ہیں، واعظین ان کو بھی ذکر کردیتے ہیں۔ کسی صحابی یا تابعی کے قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے پیش کردیا جاتا ہے، علم حدیث کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کی صورت میں بیان کردیا جاتا ہے۔ عام خطباء اور مقررین کو ان احادیث کی تحقیق ومراجعت کا موقع نہیں ملتا اس لئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات وتقریروں میں بیان کردہ احادیث وروایات کے محدثانہ طرز ومعیار پر تحقیق ہوجائے، اصل مراجع ومصادر سے ان کے حوالے نقل کئے جائیں اور ان روایات کی صحت وضعف کی حاشیہ میں وضاحت کرلی جائے اور اگر کوئی حدیث موضوع ہے تو اس کی بھی نشاندہی ہوجائے تاکہ منبر ومحراب کے منصب کے حاملین، ان احادیث وروایات کو ان کی اصل حیثیت کی روشنی میں بیان کریں..... حضرت حکیم الاسلام کے ان خطبات کو اللہ جل شانہ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی ہے اور برصغیر کے علاوہ اردو دنیائے اسلام میں یہ بکثرت پڑھے اور سنے جاتے ہیں، اس وقت دنیا کے اکثر خطوں میں دین اسلام کا جو کام ہورہا ہے واسطہ بالواسطہ، اس میں ازھر ہند دارالعلوم دیوبند کا فیض شامل ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دارالعلوم دیو

بند کے فضلاء اور منتسبین کا ایک جال بچھا ہوا ہے، وہ مدارس و مکاتب، مساجد و خانقاہوں، جہاد و ابلاغ اور دعوت و تبلیغ کی جماعتوں اور مراکز کی شکل میں دین کی مختلف جہتوں پر کام کر رہے ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دارالعلوم دیو بند کے نصف صدی تک روح رواں رہے ہیں، انہوں نے یہ خطبات بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ارشاد فرمائے ہیں اور اللہ جل شانہ نے انہیں ایک ہمہ گیر قبولیت عطا فرمائی ہے۔

برادر محترم عبدالصبور صاحب کو اللہ جل شانہ نے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اکابر کی کتابیں چھاپنے اور عام کرنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، خطبات حکیم الاسلام پر تخریج احادیث و روایات کی تحقیق کی ضرورت کو جب میں نے محسوس کیا تو ان سے کہا کہ اس عظیم کتاب کا تخریج و تحقیق شدہ ایڈیشن لانے کی ضرورت ہے، یہ آج سے تقریباً بارہ تیرہ سال قبل کی بات ہے انہوں نے اس کے لئے عزم کیا اور مختلف محقق علمائے کرام سے ان خطبات کی تخریج و تحقیق کرائی اور اس پر انہوں نے زر کثیر صرف کیا، وہ مستقل میرے رابطے میں رہے اور ہونے والا کام بھی مجھے دکھاتے رہے، درمیان میں کچھ رکاوٹیں بھی پیش آئیں اور زندگی کے جھمیلے کام کی رفتار کو روکتے رہے لیکن بالآخر یہ کام الحمدللہ مکمل ہو گیا اور ان بلیغ و عظیم خطبات کا تخریج شدہ ایڈیشن درج ذیل خصوصیات کے ساتھ آ گیا:

1.....ان خطبات میں موجود تمام احادیث و روایات کی اصل مراجع سے تخریج کر دی گئی ہے۔

2.....ان روایات کی صحت و ضعف کی حاشیہ میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

3.....بعض احادیث زبان زد عام ہیں لیکن وہ موضوع ہیں، ان خطبات میں بھی کہیں ایسی احادیث آ گئی ہیں تو اُن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا گیا ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

4.....تمام احادیث پر اعراب (زبر، زیر، پیش) لگا دیئے گئے ہیں تا کہ تلفظ میں غلطی کا امکان کم ہو۔

5.....ان خطبات میں جتنی قرآن پاک کی آیات ذکر کی گئی ہیں اُن سب کی تخریج (یعنی سورت و آیت نمبر کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

6.....تمام قرآنی آیات پر اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔

7.....متن کی تصحیح کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے اور اُس کے پروف مختلف علماء سے متعدد بار پڑھوائے

گئے ہیں۔

اللہ جل شانہ اس محنت کو قبول فرمائے، ان خطبات کا نفع عام اور تمام فرمائے اور اسے سب محنت کرنے والوں کے لئے اس دن کا ذخیرہ بنائے جس دن نہ مال وزر کے انبار کام آئیں گے، نہ دوست واحباب اور اولاد و احفاذ کا ہجوم..... **یوم لا ینفع مال و لا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم.**

و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی آله و صحبه اجمعین.

تقریظ

عارف کبیر، حجۃ القرأ، شارح شاطبی

حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحبؒ

حامداو مصلیا

امـابـعـد...... ماشاءاللہ قاری ادریس صاحب بڑا تعمیری کام کررہے ہیں۔اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریریں طبع کرانے کا انتظام کررہے ہیں،اب تک چار تقریریں تو مکمل کرچکے ہیں،اسی طرح اور تقریروں کی بھی تلاش میں ہیں۔خدا کرے بہت سی تقریریں حضرت موصوف کی مل جائیں اور یہ اصلاحی ذخیرہ کافی ووافی جمع ہوجائے۔

اللہ پاک مولوی ادریس صاحب کے لئے بھی اس کو آخرت کی کامیابی کا بہترین ذریعہ بنائے اور اہل علم وعامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کے ارشادات سے مستفیض فرمائے اوران کے ارشادات کو دنیا وآخرت کے لئے مشعل راہ بنائے۔(آمین ثم آمین)بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہٗ مہاجر مدنی مدینہ منورہ

حال وارد ملتان۔شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ

تقریظ مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت اقدس محترم ومکرم مولانا محمد یوسف لدھیانوی (شہیدؒ)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب، طیب اللہ ثراہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حکمت قاسمی کے وارث وامین تھے، وہ اپنے ''خطبات ومواعظ'' میں حکمت کے موتی رولتے تھے، اور ایسے عجیب وغریب لطائف ومعارف کا دریا بہاتے تھے جو عام طور سے کتابوں میں نہیں ملتے، اس لئے بجا طور پر انہیں ''حکیم الاسلام'' کا خطاب حاصل تھا۔

عزیز محترم جناب مولانا الحاج الحافظ قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات حکمت کی جمع وتدوین کا شوق نصیب فرمایا، موصوف نے حضرت مرحوم کے خطبات کی کیسٹیں تلاش کرنے اور انہیں کاغذ پر منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا، ماشاءاللہ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوئے۔

''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے چھ جلدیں مرمت کر کے شائع کر چکے ہیں، اس سلسلے کی یہ ساتویں جلد ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، حق تعالیٰ شانہ ان کے اخلاص وللّٰہیت میں مزید ترقی عطا فرمائیں، ان کی اس محنت کو شرف قبول نصیب فرما کر دارین میں مثمر برکات بنائیں، اور ان خطبات کے قارئین کو بھی اس صدقۂ جاریہ سے متمتع فرمائیں۔ **بحرمة سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد ن النبی الامی صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ واتباعہٖ وبارک وسلم واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین**

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

(۱۷-۴-۱۴۱۰ھ)

مبارک تقریظ

استاذ المحترم حضرت اقدس مولانا عبدالمجید صاحب زیدت معالیہم

شیخ الحدیث جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

عزیز القدر قاری محمد ادریس صاحب! عافانی اللہ وایاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ...... حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب! رفع اللہ درجاتہ فی الجنۃ، کے خطبات علم وعرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا مندر ہیں، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حکیم الاسلام کے مواعظ حسنہ سے ان کی حیات میں کتنے نفوس جہالت کی ظلمات سے نکل کر نور ہدایت کی طرف آئے جب بھی ان کے مواعظ کا مجموعہ طبع کرا کر آپ نے بھیجا تو آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، آپ نے ان جواہرات کو محفوظ کر کے ان کے افادہ کو عام وتام کر دیا، حکیم الاسلامؒ کی روح یقیناً آپ سے خوش ہوگی اور یہ نسبت طیبہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور مقبولیت عنداللہ کا باعث ہوگی۔

حکیم الاسلام کے خطبات تعریف وتوصیف سے بالاتر ہیں دعاء کرتا ہوں اللہ تعالیٰ صاحب مواعظ کے درجات بلند کرے اور متوسلین دیوبند پر آپ کے احسان کا اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں بدلہ دے۔

ایں دعاء از من جملہ جہاں آمین باد

محب حکیم الاسلام خاکپائے علماء دیوبند

عبدالمجید

باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

تقریظ مبارک

مخدوم العلماء

حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب مدظلہم

خلیفہ ارشد حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم

نحمدهٗ ونصلي علىٰ رسوله الكريم

امابعد..... اکابر اولیاء اللہ کے ارشادات وفرمودات روحانی زندگی کی بقاء وترقی کے لئے عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی صحبت ومعیت کے قائم مقام ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا:

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آج کے پرفتن دور میں اس چیز کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔علوم ظاہریہ کی تکمیل کے باوجود تکمیل باطن کے بغیر انسان کی انسانیت اُجاگر نہیں ہوسکتی۔اور تکمیل باطن کے سلسلہ میں بزرگان دین کے اقوال وملفوظات اور مواعظ وخطبات نسخۂ اکسیر ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اور دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے ان کی خدمات جلیلہ سے پورا عالم اسلام آگاہ اور ایک زمانہ آشنا ہے۔آپ کے ارشاد فرمودہ مواعظ کو عام مواعظ کی نسبت ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے جہاں عامۃ الناس آپ کے مواعظ طیبہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہاں اہل علم بھی خصوصیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عزیز القدر قاری محمد ادریس سلمہٗ کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔انہوں نے حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے مواعظ کو یکجا کردیا اور جگہ جگہ مفید عنوانات کے اضافے سے مرتب کردیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت وترقی نصیب فرمادے۔اور اس محنت کو قبول فرما کر اپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔اور دین ودنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنا کر نجات آخرت کا وسیلہ بنائے۔

آمین یارب العالمین. بجاه سيدالمرسلين عليه الصلوٰة والتسليم

بندہ: محمد شریف جالندھری

مہتمم مدرسہ خیر المدارس رجسٹرڈ ملتان شہر

تقریظِ مبارک

جانشینِ اکابر حضرت مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم
رئیس جامعہ خیر المدارس ملتان، وناظمِ اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

''اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا''

ممتاز خطیب

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بدوِ شعور سے جن ہستیوں کے متنوع کمالات اور ہمہ جہت دینی خدمات کے باعث اُن کی عظمت و رفعت اور محبت کے نقوش ہمیشہ کے لئے دل میں جاگزیں ہو کر رہ گئے ماضی قریب کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سرفہرست ترجمانِ علوم قاسمیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب قاسمی قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی ہے۔ بلا تشبیہ جس طرح امام الانبیاء، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے اقدس کی زیارت سے مشرف ہونیوالے بعض سعیدُ الفطرت بے اختیار پکار اُٹھے کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا، اسی طرح حضرت قاری صاحبؒ کی معصومیت آپ کے باطنی تقویٰ و طہارت کی ترجمان تھی۔ ہمارے استادِ محترم جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان) فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی گناہ صغیرہ کی آلودگی سے بھی پاک نظر آتی ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے بے شمار اِمتیازی خصوصیات سے نوازا تھا۔ آپؒ بیک وقت ایک عظیم خطیب، ادیب، محقق، مدبر، محدث، مفسر، متکلم، مصنف اور شیخ کامل تھے۔ آپؒ کی تقاریر حقائق ومعارفِ شریعت اور اسرار ورموزِ طریقت کا دِل نشین مجموعہ ہوتی تھیں۔ تخلیق و ایجاد مضامین اور عام واقعات سے علمی نکات ومعارف کا استنباط حضرت قاری صاحبؒ کے ایسے اوصاف تھے جن میں کوئی خطیب ومقرر آپ کے ساتھ شریک نہیں، دقیق مضامین اور اہم اسلامی مسائل پر دودو، تین تین گھنٹے مسلسل روانی اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح خطاب فرماتے تھے کہ سننے والے جھوم اُٹھتے۔ برصغیر میں ایک سے ایک بڑھ کر خطیب ومقرر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی جادو بیانی سے بے شمار قلوب کو مسخر کیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، امیر شریعت سیّد عطاء اللہ بخاریؒ، سیّد سلیمان ندویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علاّمہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ جو مشہور ومعروف ہیں۔ ان عظیم خطباء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ کی تقریر میں دریاؤں کے جوش وخروش کے بجائے سمندر جیسی روانی اور سکون ہوتا تھا جو سامع کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے قادر الکلام اور بے مثال خطیب عام مجمع میں بیٹھ کر حضرت قاری صاحبؒ کی تقریر سُنتے ، سر دھنتے اور یہ کہہ کر داد دیتے کہ ''یہ قاری طیب نہیں قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''۔ (رحمہما اللہ تعالیٰ) تقریر اور خطابت کا ملکہ خُداداد ہوتا ہے۔ اس میں کسب کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیاضِ ازلی نے حضرت قاری صاحبؒ کو اس نعمت سے خوب خوب نوازا تھا۔

احقر کے لئے یہ سرمایہء سعادت ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ ایک مرتبہ ملتان سے لاہور تک سفر میں قدم بوسی کی نعمت میسّر آئی۔ دورانِ سفر حضرتؒ نے ایک نظم بھی مکمل فرمائی۔ پاکستان میں ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے نام سے حضرت قاری صاحبؒ کے پُر حکمت مواعظ و خطبات کو مربوط کتابی شکل میں پیش کرنےکی سعادت و سبقت حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم کے حصّہ میں آئی۔ آپ جامعہ خیر المدارس کے فاضل اور اساتذۂ خیر المدارس کے منظورِ نظر اور بالخصوص والد گرامی حضرت محترم مولانا محمد شریف صاحب جالندھریؒ کی ان پر خصوصی عنایت اس وقت شروع ہوئی جب خطبات کا سلسلہ منظر عام پر آنا شروع ہوا۔ اس لیے کہ آپ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ خطبات کی جمع و تدوین حضرت حکیم الاسلام کی وساطت سے دار العلوم دیوبند کی علمی خدمت ہے۔ خوشی ہے کہ یہ سعادت جامعہ خیر المدارس کے ایک فاضل کے حصّہ میں آئی۔ اس طرح آپ کا شمار خیر المدارس کے ان فضلاء کرام میں ہوتا ہے جن کی تالیفی کاوشوں کو اہل علم میں پذیرائی اور قبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ اس ناچیز کو متعدد غیر ملکی اَسفار میں جگہ جگہ خطباتِ حکیم الاسلام کی جلدیں نظر آئیں اور مرتب موصوف کے فاضل خیر المدارس ہونے کے ناطے میری مسرت دوچند ہوگئی، ہندوستان میں تو اس کے ابتدائی تعارف بلکہ صاحبِ خطبات حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ کی خدمت عالیہ میں اوّلین دو ۲ جلد اپنے ہاتھوں سے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جس کی تفصیل خطبات کی جلد ۶ کے پیشِ لفظ میں موجود ہے۔ اس عظیم سلسلہ کی بارہویں جلد اس وقت قارئین سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے، جو قاری صاحب موصوف کی ہمت و محنت کے علاوہ صاحب خطباتؒ سے ان کی گہری محبت و عقیدت اور قلبی وابستگی کی دلیل ہے۔ احقر نے ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ کے سفرِ حج میں صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کو بتایا کہ بحمد اللہ ''خطبات حکیم الاسلام'' کی بارہویں جلد بھی طباعت کے آخری مراحل میں ہے، حضرت نے انتہائی مسرّت کا اظہار فرمایا اور خُوب دُعائیں دیں۔ حضرت قاری صاحبؒ کی ان تقاریر کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

جو حضرات ان خطبات کا مطالعہ کر چکے ہیں یا آئندہ کریں گے وہ ان کی قدر منزلت کا خود ہی اندازہ لگائیں گے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ان خطبات کو حضرت صاحبِ خطبات کے لیے صدقہ جاریہ بنائیں اور جامع

خطبات محترم ومکرّم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم کی اس پُر خلوص محنت کو قبول فرمائیں۔(آمین)

اسی طرح ان کے قائم کردہ ''دار العلوم رحیمیہ'' ملتان جو جامع خیر المدارس کے شعبۂ قراءت وتجوید کے صدر المدرسین، استاذ القراء حضرت اقدس قاری ومُقری شیخ رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرّہٗ کے نامِ نامی سے منسوب ہے اور ان کی علمی یادگار ہے۔اہلِ مدرسہ کی دعوت کے علاوہ بحیثیت ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ، مدرسہ میں متعدد بار حاضری ہوئی۔الحمد للہ مدرسہ کے نظم ونسق کو بہتر سے بہتر پایا۔بفضلہٖ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف بھی ہو رہا ہے۔بہت دعائیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ادارہ کو اکابر کے طرز وفکر کے مطابق نُورِ علم پھیلانے کی توفیق خاص مرحمت فرمائے۔اور قبولیت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔(آمین)

تقریظ مبارک

از: حضرت العلام مولانا

مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ العالی (خیر المدارس ملتان شہر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً امابعد..... دعوت الی اللہ فریضۂ نبوت ہے۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کے دعوت الی اللہ پر مشتمل مواعظ کا ایک حصہ ہمیشہ کے لئے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی ہدایت کا باعث ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد اُمت کے کاملین مشائخ عظام وعلماء کرام اپنے اپنے ظرف واستعداد کے مطابق اس میراث نبوت میں سے حصہ پاتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے کلام، ملفوظات ومکتوبات کے ذریعہ اپنی مخلوق کو ہدایت بخشتے ہیں۔ زندگیوں میں انفرادی واجتماعی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ بند دل ہدایت ربانی کے لئے کھل جاتے ہیں۔ لکھو کھا اندھے، بینا، اور بہرے، شنوا ہو جاتے ہیں۔ کفروشرک، بدعات ومعاصی کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں، ایمان ویقین اور اتباع سنت کے انوار سے قلب وقالب جگمگا اٹھتے ہیں۔ دعوت الی اللہ اور نالہائے صبحگاہی کی تاثیرات معاشرہ میں ضرور ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

عارروی فرماتے ہیں:

گر نبودے نالۂ نے را ثمر ——— نے جہاں را پر نکردی از شکر

تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر بصدقہ وفیض ختم نبوت، دعوت الی اللہ کا یہ کام مسلسل جاری ہے، اوران شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی دین جو کچھ امت کے پاس موجود ہے۔ یہ اسی تعلیم وتبلیغ اور اہل اللہ کے نالہائے صبحگاہی کا ثمرہ ہے۔

بسلسلہ وعظ ودعوۃ الی اللہ کی ایک کڑی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے حکیمانہ مواعظ وخطبات ہیں، جو آپ نے مختلف مواقع پر نہ صرف پاک وہند بلکہ حرمین شریفین افریقی ممالک یورپ تک میں ارشاد فرمائے اور تشنگان علوم ومعارف نبویہ کو سیراب فرمایا۔

جن حضرات کو موصوف کے حکیمانہ خطبات سننے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔ وہی اس کی حقیقت کو جان سکتے ہیں کہ آپ کا بیان علمی، ادبی، عملی، اخلاقی، روحانی ومعنوی اعتبار سے کتنا اعلیٰ ہوتا ہے۔ سنا ہے، کہ خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں جب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہوتا، تو حضرت شاہ عطاء اللہ

صاحب بخاری نوراللہ مرقدہ اسٹیج سے نیچے سامنے بیٹھ کر عجیب والہانہ شان سے آپ کا بیان سنا کرتے، اور مخصوص انداز میں داد دیتے اور فرماتے: ''یہ طیب نہیں بول رہا بلکہ حضرت قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''

حضرت قاری صاحب مدظلہم کے ایسے سینکڑوں مواعظ وخطبات ہوں گے جو سامعین نے سُنے۔ اور فضا میں تحلیل ہو گئے، اور بہت سے مواعظ کو بعض خوش قسمتوں نے ٹیپ بھی کیا۔ لیکن ان کے افادہ عوام کی صورت نہ تھی، کیوں کہ یا ہوا میں منتشر ہیں یا ٹیپ میں بند۔ اللہ پاک نے فاضل نوجوان عزیز مکرم جناب قاری محمد ادریس صاحب سلمہ کے قلب میں ان کے جمع واشاعت کا داعیہ پیدا فرمایا۔ چنانچہ اپنے طبعی ضعف اور ذمیہ فرائض کے باوجود اس اضافی بارگراں کو اپنے ذمہ توکلاً علی اللہ لے لیا۔ موصوف نے نہ معلوم کہاں کہاں سے مواعظ کی کیسٹیں جمع کیں۔ پھر ان کو کاغذوں پر منتقل کیا، ترتیب کے دوران موقعہ بہ موقعہ مفید عنوانات کا اضافہ فرمایا۔ اور پھر بہترین کتابت وطباعت سے مزین کر کے یہ نادر تحفہ ہدیۂ ناظرین کیا۔ موصوف کی اس مساعی جمیلہ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اللہ پاک آں عزیز کی اس محنت وجانفشانی کو قبول فرما کر خلعت رضا وسعادت دارین سے نوازیں۔ (آمین)

فقط

امیدوارِ دُعاء

بندہ: عبدالستار عفا اللہ عنہ

تقریظ سعید

حضرت محترم مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم

اُستاذِ تفسیر جامعہ خیر المدارس ملتان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِالْاَ نْبِيَاءِ وَخَاتَمِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ! حق جل شانہٗ کے اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات پر قابل رشک قسم کے انعامات ہیں جن میں سے خاص طور پر یہ بھی ہے کہ ہر دور میں علماء ربانیین حق کی ترجمانی اور دفاع کچھ ایسے طور پر کرتے رہے ہیں جو عالمِ انسانیت کے لئے مستقل طور پر ایک ذخیرۂ خیر ہے۔ گذشتہ صدی میں حق جل شانہٗ نے برصغیر میں اکابر اھلِ سُنت والجماعت علماءِ دیوبند کو اس شرف سے خُوب نوازا جس کے اثرات پُورے عالَم میں آفتاب وماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین قرنِ اوّل کے قافلے کے کچھ بچے ہوئے نُورانی لوگ تھے جنہوں نے نامساعد حالات کے باوجود وہ خدمات سرانجام دیں کہ اس کے اجمالی تذکرہ کے لئے بھی کئی دفتر چاہئیں۔

دین کا صحیح فہم، اتباعِ سُنت، اعتماد علی السلف، جامعیتِ دین کا اعتقاد، خلقِ خدا پر شفقت اور اس کی رہنمائی کے لئے ایسی تدابیر سوچنا اور اختیار کرنا، جیسے ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے بارے میں کرتا ہے، جیسی بے شمار صفات سے اللہ پاک نے اُن کو نوازا ہُوا تھا۔ یقیناً عمارت میں معمار کے ذوق ومزاج کو دخل ہوتا ہے، تصنیف اپنے مُصنّف کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح کوئی ادارہ اور مدرسہ اس کے بانی کے فکر ومزاج کا مظہر ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند سے علم وعمل، رشد وہدایت کے جو چشمے اُبلے بلاشبہ اس میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے اخلاص وفراست کا بھی بڑا حصہ ہے، اللہ پاک نے اپنے کرم سے آپ کی اولاد کو بھی اس نعمت سے نوازا، چنانچہ آپ کے نبیرہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ نے مسندِ اہتمام کے حوالہ سے دارالعلوم دیوبند کی نہیں، میں نے غلط کہا، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے وہ اسلام کا ایک درخشندہ باب ہے...... ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے ایک بار فرمایا میں نے دو آدمی بڑے عجیب دیکھے ہیں، ایک حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ اور دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس میں ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے علوم کی بارش ہو رہی

ہے، جبکہ حضرت قاری صاحبؒ کی محفل میں معارف برس رہے ہوتے تھے، چنانچہ آپ جب کسی موضوع پر بیان شروع فرماتے تو کچھ ایسا دلنشین انداز ہوتا کہ سامعین مسحور ہوجاتے اور ایسے معارف وحقائق بیان کرتے کہ بھی بزبانِ حال یوں کہتے: ''وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ'' اللہ پاک جزائے خیر نصیب فرماویں حبیب محترم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم مدیر دارالعلوم رحیمیہ ملتان کو جنہوں نے حضرت قاری صاحب مرحوم کی آخری حیات میں ان جواہر کو لڑیوں میں پروکر ہار بنانا شروع کیا، چنانچہ جلد اوّل ودوم آپکی حیات میں آگئی تھی، اور آپ کی نگاہِ ناز سے بھی مشرف ہوئی۔ حضرت مرحوم کی کرامت اور مرتب زید مجدہم کی سعادت ہے کہ خطبات کا یہ شجرہ طیبہ خوب پھلا پھولا حتیٰ کہ پورے عالم میں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، تقبل اللہ تعالیٰ۔

اس وقت آپ کے سامنے خُطباتِ حکیم الاسلام کی بارہویں جلد ہے جو سورہ قلم کی تفسیر پر مشتمل ہے، اہلِ ذوق ان شاءَ اللہ اس جلد سے خوب مستفید ہونگے، حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ ایک خاص شان ومقام رکھتی ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ القرطبی نے اپنی زندہ جاوید تفسیر ''الجامع آلاحکام القرآن میں سورۃ ''ن'' کے بارے میں بڑے عجیب وغریب حقائق بیان فرمائے ہیں، فرماتے ہیں حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ ''ن'' رحمٰن کا آخری حرف ہے۔ ①

حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ ''نَهْرٌ مِّنْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهُ نُوْنٌ''. نون جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے۔ ② ابوالعاسیہ کا قول ہے کی وہ اللہ پاک کے اسماءِ حسنیٰ میں سے نصیر، نور، ناصر، کا پہلا حرف ہے۔ ③ بہر حال یہ اشارات سُورۃ ''ن'' کی اہمیت اور عظمت کی نشاندہی کر رہے ہیں، ان شاءَ اللہ قارئین اس قسم کے لطائف ومعارف سے اس جلد کے مطالعہ کے دوران خوب لطف اندوز ہوں گے۔

اس شجرہ طیبہ کے پھلنے پھولنے میں جناب مرتب حضرتِ اقدس مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہٗ کے اخلاص اور جُہد کا بنیادی حصہ ہے۔ کہ: خطباتِ حکیم الاسلام کو الحمد للہ علمی حلقوں میں استقرار ملا۔ اسی طرح موصوف نے چند سال قبل بفضلہٖ تعالیٰ ''دارالعلوم رحیمیہ'' کے نام سے ملتان میں حضرت اقدس مقریءِ اعظم شیخ القراءُ مولانا قاری رحیم بخش صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے منسوب ان کی علمی یادگار کے طور پر ایک ادارہ قائم کیا، جس میں بفضلہٖ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف تک درجہ کُتب بھی جاری ہے۔ شعبہ حفظ تو الحمد للہ پہلے ہی مستحکم تھا۔ سینکڑوں حُفاظ کرام اس مدرسہ سے اخذِ فیض کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ① زمانۂ طالب علمی سے حضرت قاری صاحب زید مجدہم اور فقیر، ہم درس، ہم فکر وہم خیال ہونے کے ساتھ روحانی طور پر بھی ایک شیخ سے بیعت ہوئے۔

حضرتِ اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی نوّر اللہ مرقدہٗ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوئے اوران کی زیرِ تربیت رہنے کا موقع نصیب ہوا حضرت اقدسؒ نے نگاہ کرم فرماتے ہوئے ایک رمضان المبارک کی تراویح میں خود پیچھے کھڑے ہوکر حضرت قاری صاحب کا قرآن کریم سنا، حضرت اقدسؒ نے تمام طلباء میں امتحان لے کر موصوف کانسبتِ رحیمی سے اِنتخاب فرمایا تھااور ختم قرآن کریم کے موقع پر اپنی مستعمل دستار عطا فرمائی تھی۔ظاہر ہے ان حضراتِ اکابر کے عطایا رسمی ہدایا نہیں ہوتے۔

ان حضراتِ اکابر کی توجہات کی برکت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے محض اپنے فضل وکرم اور بالخصوص ان کے والد ماجد حضرتِ اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ جنہوں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے دورۂ حدیث کی سند حاصل کی۔نیز ختم بخاری کے موقع پر دارالحدیث دیوبند میں علمانہ وطلباء کے برگزیدہ ومبارک اجتماع میں آپ کا نکاح حضرت مدنیؒ نے نہایت سادگی اور طالب علمانہ لباس میں پڑھایا۔اور خیر وبرکت کی دعا فرمائی تھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ ان سے دین کا کام لے رہے ہیں۔میرے اصرار پر حضرت قاری صاحب زید مجدہم اپنے والد ماجد کے حالات قلمبند کر کے خطباتِ حکیم الاسلام میں دے رہے ہیں تا کہ جس شخصیّت نے خطباتِ حکیم الاسلام کی گیارہ (۱۱) جِلدوں میں راہنمائی کی ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات میں آجائے۔

بہرحال اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں دُعا ہے کہ حضرت محترم مرتب زید مجدہم کے علم وعمل، اخلاص وتقویٰ اور عمر میں بے انتہا برکات عطا فرمائے اوران کی اس سعی کو سعئ مشکور فرمائے۔

ایں دعاء از من واز جُملہ جہاں آمین باد

اظہار عقیدت

محترم ومکرم حضرت والعلام مولانا محمد اسحٰق خانصاحب زیدت عنایاتہم

(رکن اسلامک مشن متحدہ عرب امارات، دبئی، وسرپرست اعلیٰ جمعیت اہل سنت والجماعت متحدہ عرب امارا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ اشرف الانبياء وسيد المرسلين نبينا محمد وعلىٰ اٰله وصحبه اجمعين. وبعده..... دینِ اسلام، دینِ دعوت وتبلیغ ہے، کیونکہ یہ دین ساری دنیا کو کفر وشرک اور ضلالت وغوایت کے مختلف اندھیروں سے نکال کر توحید وسنت کی روشنی میں لانے اور راہِ حق پر ڈالنے کے لئے آیا ہے، اسی لئے اللہ پاک، اپنے پیغمبر علیہ السلام کو واشگاف الفاظ میں تبلیغ حق کا حکم دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے: **يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته. (الأية)**

''اے پیغمبر! (بلا کم وکاست) پہنچا دو وہ پیغام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اور اگر بالفرض آپ نے ایسے نہ کیا تو آپ نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔''

اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: **بلغوا عني ولو اٰية** (پہنچا دو میری طرف سے اگرچہ وہ ایک آیت ہی ہو'' ۔اسی لئے امت مسلمہ امت دعوت وتبلیغ کہلاتی ہے اور سلف وخلف میں بے شمار ایسی مقدس وپاکیزہ ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے دعوت وتبلیغ کے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، انہی مکرم ومحترم ہستیوں میں سے ایک ہستی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند انڈیا(کی بھی ہے، جن کو قدرت کی فیاضیوں نے علم وفضل کی بیکرانیوں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی حلاوت ولطافت سے بھی بطور خاص نوازا تھا، گھنٹوں آپ کے بیان سے بڑے بڑے مجمعوں پر ایک سحر طاری ہوجایا کرتا تھا اور دنیا ہمہ تن گوش بن جایا کرتی تھی۔

اس پر مزید یہ کہ آپ کے اخلاص اور صدق دروں کے باعث یہ سب سرمایہ کیسٹوں کی شکل میں محفوظ بھی ہوگیا، دبئی میں راقم آثم کو ہندوستان کے بعض ثقہ حضرات نے سنایا کہ بمبئی میں ایک ادارہ صرف حضرت قاری صاحب مرحوم ومغفور کی کیسٹوں کی حفاظت وترویج کے لئے قائم کیا گیا ہے جس میں حضرت مرحوم کی سترہ ہزار کیسٹوں کا ذخیرہ جمع کرلیا گیا ہے۔

سبحان اللہ اتنا قبول عام اور اس طرح تحفظ شاید ہی پورے برصغیر ہندو پاک کے دوسرے کسی بھی خطیب کو نصیب ہوسکا ہو، یہ آپ کے اخلاص وللّٰہیت کا بین ثبوت ہے۔ (**فرحمه الله رحمة واسعة**)

اپنے ملتان کے حالیہ مختصر دورے کے دوران مجھے محترم مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہٗ نے بتایا کہ آپ ''خطبات حکیم الاسلام'' کی ساتویں جلد ترتیب دے رہے ہیں، اور وہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے تو مجھے اس سے دلی خوشی بھی ہوئی، اور حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حکیمانہ خطبات کی اس مقبولیت ومحفوظیت کا تعجب انگیز احساس بھی، اس ضمن میں موصوف نے راقم آثم سے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے فرمایا تو راقم آثم نے کیف ما اتفق نہایت جلدی میں یہ کچھ اُلٹے سیدھے نقوش حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دلی تعلق اور قلبی عقیدت کی بناء پر اور رضاء الٰہی کے حصول کے لئے سپرد قلم وقرطاس کر دیئے، اللہ پاک قبول فرمائے، اور محترم قاری صاحب موصوف اور ان کے رفقاء کرام کی ان مساعی جمیلہ کو بار آور فرمائے، جو وہ اس کار خیر میں فرمارہے ہیں۔ (آمین ثم آمین) **وصلى الله تعالىٰ علىٰ نبينا محمد وعلىٰ وٰله وصحبه وسلم**

محمد اسحٰق خان (عفاالله عنه بحاوفاه)

نزیل ملتان، پاکستان

تحریر ۱۸،۱۱،۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲،۶،۱۹۸۹ء

بروز جمعرات بوقت پونے گیارہ بجے شب

گرامی قدر راخی فی اللہ حضرت محترم مولانا قاری ابوانس عطاء اللہ بخاری صاحب زید مجدہم
امام خطیب النور مسجد، الیف بلاک ورئیس مدرسہ نزھۃ الظہور (شمالی ناظم آباد کراچی)

علم وحکمت کی کہکشاں

باسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی

محترم ومکرم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم العالیہ کی زیرِ نظر کتاب ''خطباتِ حکیم الاسلام جلد۱۲'' اسی سلسلۃ الذہب کی تازہ ترین کڑی ہے جس میں اس عظیم المرتبت، عبقری شخصیت، جو اکابر علماء دیو بند کے سچے جانشین، علوم ومعارف کے پاسبان، روایات اسلاف کے امین، حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار، اقلیمِ علم کے تاجدار، اپنے دَور کے عمدہ قاری، جید حافظ، صاحبِ علم وکمال، کامیاب معلّم، نامور متکلّم، محدّثِ کبیر، عالمی خطیب، شگفتہ قلم مصنف، نکتہ دان فلسفی، مردم شناس مُربی، لطائف واسرار، حقائق ومعارف پر گلفشاں، ایسے کہ چمنستانِ ادب وحکمت اور گلستانِ فصاحت وبلاغت میں بہار آجائے۔ مادرِ علمی دیو بند کی انتظامی خدمت پر ساٹھ برس تک چمکنے والا ستارہ، نبیرہ حجۃ الاسلام، حضرتِ اقدس مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وہ خطبات اور تقاریر و مقالات کے بکھرے ہوئے وہ ذخائر، حکمت ونکات کے وہ موتی جواب تک منظم تحریروں میں دستیاب نہیں تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم نے صفحۂ قرطاس پر اپنے قلم کے ذریعے ان کو نظم وترتیب کے ساتھ یکجا کرتے ہوئے ایسی کہکشاں سجائی ہے جس کے سامنے نظام شمسی کی کہکشاں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ نظام شمسی کی کہکشاں صورتوں اور رنگوں کے تعارف کا ذریعہ ہے جس کی بُنیاد مادہ ہے۔ اور علم وحکمت کی کہکشاں جائز ونا جائز، عدل وظلم کا امتیاز، باہمی اجتماعی وانفرادی حقوق کی حدود اور مقاماتِ قلب وباطن کی صحت وفساد میں صحیح سمت متعین کرنے کا نام ہے جو ظاہر ہے نظامِ شمسی سے ممکن نہیں۔ اس لئے ہوشیار پوری صاحب، کی سجائی ہوئی کہکشاں اپنی چمک دمک، روشنی، حرارت، نور، تابندگی اور تاریکیوں کو منور کرنے میں بے مثال ہے۔ موصوف مکرم، میرے مشفق ومہرباں استاذِ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے لائق اور ہونہار فرزند ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت منظم، کامیاب مدرس بہترین قلم کار اور عالمِ باعمل ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی دولتِ علم سے نوازا ہے جس کے بارے میں شیخ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ۔

علم را بردل زند بارے بود

اس علم نے کیسی ''یاری'' نبھائی؟۔ انہیں ایسا توشۂ آخرت فراہم کرنے میں معاونت کی جس پر ہم جیسے ٹوٹا

چھوٹا لکھنے والے رشک کرتے ہیں۔ میں جب ہوشیار پوری صاحب کے تصنیفی سرمائے پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنی نام نہاد تحقیق وتنقید، تبصرہ وجائزہ قطعی بے کار اور ہیچ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے جو راستہ منتخب کیا وہ جہاں ان کی نیک نیتی اور خلوص کا مظہر ہے وہاں شُہرت وتعریف اور مال وزر سے ان کی بے نیازی پر دال ہے۔ بااین ہمہ!

ایں سعادت بزور بازو نیست

خداوند کریم اُن پر مہربان ہے۔ عُمر بھر درس وتدریس اور مدرسہ کے انتظامی امور کے لئے سارا دن ''چکی کی مشقت'' اٹھانے کے ساتھ ساتھ ''مشقِ سخن اور مشقِ قلم'' جاری رکھنا کس قدر صبر آزما اور جان لیوا کام ہے۔ اس کا اندازہ شاید عام قاری بلکہ بہت سے اہلِ قلم بھی نہیں کر سکتے بقول شخصے:

انہیں کا ہے یہ کام، جن کے حوصلے ہیں سوا

غیر معمولی مصروفیات کے اس عالم میں انہوں نے جس استقلالِ مزاج کے ساتھ اور جس خاموشی وتندہی سے اور: ع

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''

کا مصداق بن کر اپنا کام جاری رکھا، ہمارے ہاں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، انہوں نے جہاں اپنی عاقبت کا زادِ راہ فراہم کیا ہے وہاں ہم جیسوں کے لئے رُشد و ہدایت کی جوت جگائی ہے۔ ممتاز علماء کرام اور مُستند مؤلفین نے ان کی تصانیف کی صحت واستناد پر صاد کیا ہے اس بارے میں میرا کچھ کہنا ''چھوٹا مُنہ اور بڑی بات'' ہوگی۔ یہ چند بے ربط سطور محض تعمیلِ ارشاد کے طور پر کہی جا رہی ہیں ورنہ میں خود کو اس موضوع پر کچھ کہنے یا لکھنے کا اہل نہیں پاتا۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی ہے اور اس عنایت کے لئے میں تہہ دِل سے ان کا ممنون وسپاس گذار ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی دینی خدمات اور مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطاء کرے۔ (آمین ثم آمین)

فقط دُعائے خیر کا طالب

ابوانس عطاء اللہ بخاری

تقریظ مبارک

حضرت اقدس محترم ومکرم مفتی محمد وجیہہ صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دار العلوم مظاہر العلوم ٹرسٹ لطیف آباد نمبر ۹ حیدر آباد سندھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مکرم ومحترم مولانا قاری حافظ محمد ادریس صاحب دامت برکاتہم نے خطبات حکیم الاسلام کو جمع فرمانے اور اس کی اشاعت کا جو کام انجام دیا ہے یہ دین کی ایک اہم خدمت ہے جس کی دس جلدیں آچکی ہیں اور دو جلدوں کے مسودے تیار ہیں۔ بکھرے ہوئے موتیوں اور جواہرات کو جمع کر کے ایک ذخیرۂ علمی اُمت مسلمہ کے سامنے پیش فرما کر ایسی خدمت انجام دی جیسا کہ منتشر صحائف قرآن کو جمع کر دیا گیا۔ یہ علمی ذخیرہ اگر اس کی کھوج نہ لگائی جاتی تو ضائع ہو جاتا۔ اس علمی ذخیرہ سے بہت فائدہ پہنچا اور پہنچتا رہے گا۔ (ان شاء اللہ) جو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کیلئے صدقۂ جاریہ ہے۔ اور مولانا قاری محمد ادریس صاحب کیلئے بھی اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور درجات عالیہ سے نوازیں اور مزید خطبات اور جامع خطبات کو جزائے خیر عظیم عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

احقر العباد: محمد وجیہہ غفرلہ

دار العلوم مظاہر العلوم لطیف آباد نمبر ۹

حیدر آباد سندھ ۳۰ رجب ۱۴۱۸ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ جلد اوّل

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

أَمَّا بَعْدُ!

خدماتِ قاسمؒ وطیبؒ کی جھلک..... الحمد للہ ''خطبات حکیم الاسلام'' ایک عرصہ کی محنت ومشقت اور جد وجہد کے بعد مرتب ہوئی اور بسیار سعی وکاوش سے کتابت وطباعت کے مراحل سے بخیر وخوبی گذر کر منظر عام پر آئی، حکیم الاسلام حضرت مولانا جناب قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ جس خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتے ہیں اس کی شہرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ حضرت موصوف کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُمت مسلمہ بالعموم اور اہل سُنت والجماعت کا عظیم طبقہ بالخصوص جس عظمت وتقدس اور احترام کی نگاہ سے اسے دیکھتا ہے وہ کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ میری مراد حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت حکیم الاسلام قاری طیبؒ صحیح معنوں میں ''ماہتاب قاسمی'' ہیں۔

حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ نے دُنیائے اسلام کے لئے بالعموم اور برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص جو قابل قدر اور گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں، اور افق ہند پر چھائے ہوئے کفر وضلالت کے بادل جس طرح انکی آہِ سحر گاہی اور اخلاص وللّٰہیت کی بدولت چھٹے ہیں، اس سے تاریخ کا ایک بہت بڑا اور زرّیں باب مرقوم ہے۔ اربابِ بصیرت اور تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ان نامساعد حالات سے بخوبی واقف ہے جن میں اسلام کے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کیلئے وہ غیر مسلم طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اور ایسی مجاہدانہ قربانیاں پیش کیں جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائیں گی۔ اور پھر اپنے بعد اپنا تربیت یافتہ ایک مستقل طبقہ چھوڑا جو آج تک ان کے اس مقدس مشن کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور ہر طرف سے اُسے خدا کی نصرت وحمایت حاصل ہو رہی ہے۔

دار العلوم دیوبند جو بظاہر ایک ادارہ ہے۔ جہاں علومِ دینیہ کی درس وتدریس کا سلسلہ صبح وشام جاری ہے۔ طالبانِ علم کی تشنگی کا سامان ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے دل میں جو مسلمانانِ ہند کے اجتماعی مفاد اور اسلام کے لئے تڑپ تھی، اس اجتماعی مفاد کے حصول کی خاطر آپ نے اپنی تحریک اور مشن کو علم کی چادر اوڑھا دی تھی..... الحمد للہ وہ آج تک اسی راہ پر سرگرم عمل ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ اس ادارہ نے علم وفضل میں کیا عروج پایا؟ اور دنیائے اسلام میں کیا

مقام پایااور کیا کیا خدمات سرانجام دیں؟ اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا یا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ ایسانہیں جہاں کوئی صاحبِ علم، دین کے کسی شعبہ میں کسی خدمتِ دینی میں لگا ہوا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دارالعلوم دیوبند کا ہی فیض یافتہ ہے۔ دارالعلوم کا فیض پُر تاثیر ایسا ہمہ گیر ہے کہ صدیوں اس کے اثرات انشاء اللہ باقی رہیں گے۔ حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ نے گو اپنے کو مٹائے رکھا لیکن جس کو اللہ پاک عزت وشرف سے نمایاں کرنا چاہیں تو وہ مشیت ایزدی کے تحت ہو کر ہی رہتا ہے الحمدللہ وہ اپنے علمی کارہائے نمایاں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اور جس عشق ومحبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اتباعِ دین کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری، کہا جاسکتا ہے کہ۔

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

کا وہ حقیقی مصداق ہیں۔ آج اس دارالعلوم کو قائم ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے وہ اسی آب وتاب سے اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ کفر کی حرکات گو اس پہ خندہ زن ہوں مگر نورِ نبوت کا چراغ بھی اس کو مل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرات اکابر دیوبند سے جو کام لیا ہے اس کے ظاہری وسائل کم اور حقیقی وروحانی وسائل اسمیں بطور اصل عنصر کے شامل رہے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ اس دور میں علومِ قاسمی کے سچے وارث اور امین ہیں۔ ان کے اندازِ بیان سے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کی تقاریر جو میرے پاس پہنچیں تو اس جذبے کے ساتھ کہ علوم چند اشخاص کی حد تک نہیں رہنے چاہئیں بلکہ ان کو عام ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان تقاریر کو ایک کتابی شکل دینے پر آمادگی ہوئی اور ان تقاریر کو پڑھنے والے.... مجھے امید ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کریم، ابن کریم، ابن کریم کی شان کے حامل ہیں۔ اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نوراللہ مرقدہ کا قائم کردہ ''دارالعلوم'' نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا ان کے زیرِ اہتمام جس حسن وخوبی سے چل رہا ہے کہا جاسکتا ہے کہ روحِ قاسمی قالبِ طیّب میں جلوہ گر وجلوہ آراء ہے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کی تقاریر بالمشافہ سُننے کا اتفاق کم ہی ہوا اور پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری بھی ہوتی ہے تو پروگرام کچھ اس نہج سے بنتے ہیں کہ عامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب کے علوم ومعارف سے استفادہ کا موقع کم ہی ملتا ہے، جہاں اس میں حکومت کے مروّجہ اصول وضوابط آڑے آتے ہیں اور حضرت قاری صاحب چند مخصوص مقامات (مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، دارالعلوم کراچی، خیرالمدارس ملتان اور دارالعلوم اکوڑہ خٹک) کے علاوہ آزادانہ طور پر ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے، وہاں خود عامۃ الناس میں معتقدین، متوسلین اور اکابر دیوبند سے متعلقہ ایک مستقل طبقہ اپنی گراں بار مصروفیات اور دینی مشاغل کے پیشِ نظر نیز ہوش رُبا گرانی کے باعث اپنے اندر ہمت وسکت نہیں پاتا کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر برابر مسافرت میں شریک رہ سکے

اور حضرت قاری صاحب کے نکتہ رس اور حکیمانہ اندازِ تکلم سے فیض یاب ہو سکے۔ (قاری طیب صاحبؒ اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں)۔

آج کے دور میں اصلاحی جلسوں کی تقاریر کا ''رُخ'' بھی کچھ اس ڈھب کا ہو گیا ہے کہ تقریر کے اختتام پذیر ہونے کے بعد حاضرین میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں اصلاح کے علاوہ باقی سب کچھ مل جاتا ہے۔ سیرت طیبہ کے نام پر منعقد ہونے والی بڑی بڑی مجالس میں بھی سیرت کے علاوہ باقی بہت کچھ مل جائیگا مگر سیرت ہی مفقود ہوگی۔

خطباتِ حکیم کی خصوصیات...... حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے خطبات میں جہاں عوام کے لئے اصلاحی افادیت ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اسلام کو ایک اجتماعی نظام حیات ماننے کی بجائے ''اسلام ہر ایک کا ذاتی وشخصی مذہب ہے'' کے فلسفہ کا قائل ہے اسے بھی دعوتِ فکر ہے۔ اندازِ بیان نہایت شستہ، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور، روانی اور تسلسل کا شاہکار ہے جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بیان میں قصص وواقعات، قرآن حکیم کی آیات کی بے نظیر تفسیر احادیث کی بہترین تشریح، حکایات وتمثیلات اور حکیمانہ نکات کی خوب سے خوب آمد ہوتی ہے۔ سامعین اکثر دم بخود محوِ وعظ ہوتے ہیں۔ اہل علم بات بات پہ سر دُھنتے ہیں۔ اور مجمع پر ایک سناٹے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ كَأَنَّ عَلٰى رُؤُوسِهِمُ الطَّيْرَ۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ اپنی انہی خصوصیات کے باعث مجلس وعظ سے جب مخاطب ہوں تو انکی تقریر حشو وزوائد اور مکررات سے مبرّا ہوتی ہے اور تحریر نُما تقریر ہوتی ہے۔ تاہم سلسلہ کلام بہرحال تحریر سے کچھ مختلف ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ بندہ نے پورے خطبات کو لفظ بلفظ قلم بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاہم تحریر میں لاتے وقت کچھ جملوں کی نوک پلک ضرور سنواری ہے اور اسمیں بھی مقدور بھر یہی کوشش رہی ہے کہ حضرت قاری صاحب کے الفاظ میں ہی جملوں کی نشست وبرخاست کو درست کر دیا جائے۔ اب حضرت قاری صاحب کے مواعظ سے مستفیض ہونے والے اصحاب ہی اس بات کا فیصلہ کر پائیں گے کہ کس حد تک مجھے کامیابی ہو سکی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کی شخصیت یا ان کے خطبات ومواعظ کے بارے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے تاہم یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب میں اگر کوئی حسن وخوبی نظر آئے تو اسے حضرت قاری صاحب کی خطابت کا ایک حصہ سمجھا جائے اور جو اس میں نقص وکمی محسوس ہو تو اسے راقم آثم کی طرف منسوب فرما دیں، جس پر راقم بصد ندامت معذرت خواہ ہے۔

بندۂ ناچیز: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد دوم

حامدا للہ العظیم ومصلیا علی رسولہ الکریم

اما بعد ...... خطبات حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے سلسلہ کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے۔ اہل علم کی طرف سے جلد اول کی پذیرائی اور مقبولیت نے دوسری جلد کی ترتیب کو میرے لئے آسان تر کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جلد دوم ضخامت میں بڑھ گئی۔ (مجموعی طور پر اس میں چودہ (۱۴) خطبات شامل کئے گئے ہیں)

حضرات علمائے دیوبند شریعت وطریقت دونوں کے جامع ہیں۔ جہاں یہ تعلیم شریعت کے لئے حجت تسلیم کئے جاتے ہیں، وہاں تزکیۂ باطن کے لئے بھی رہبر کامل مانے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں سے دونوں چشمے جاری ہیں۔ تزکیہ باطن کے لئے جہاں اذکار ومجاہدے بتلائے اور کرائے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں تذکیر وتبلیغ بھی ایک مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ایک طرف یہ انما بعثت معلما کا پرتو نظر آتے ہیں تو ساتھ بلغوا عنی ولویۃ کی عملی تفسیر بھی نظر پڑتے ہیں۔

تاثیر وعظ کا تعلق الفاظ سے نہیں جذبات قلب سے ہے۔ اور جذبات قلب کی اصلاح ''پیش مرد کاملے پامال شو'' کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے خطبات کا یہ مجموعہ جہاں علمی لطائف ونکات کا حامل اور ہر قسم کے رطب ویابس سے پاک ہے، وہاں اصلاح باطن اور تزکیۂ قلوب کے نسخۂ اکسیر بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا اور مبالغہ نہ ہوگا کہ اس مجموعیہ سے جہاں علماء، فضلاء اور خطباء بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ وہاں راہ سلوک واحسان کا طلاب اپنی تشنگی کا ساماں بھی کر سکتا ہے۔ جہاں ایمان ویقین سے بہرہ ور دیندار اس کی لذت وشیرینی سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ وہاں عقل وفلسفہ اور جدید روشنی کا بھٹکا ہوا خیرہ چشم ومرعوب بھی اپنے آئینہ قلب کو جلا بخش سکتا ہے۔

قحط الرجال کے اس دور میں بزرگان دین کے ملفوظات ومواعظ ان کی صحبت کے قائم مقام ہیں۔ جن کو پڑھتے رہنے سے قلب میں نورانیت اور عمل صالح کا جذبہ زندہ رہتا ہے۔ ورنہ حوادث زمانہ نے ایمانی چنگاری کو زائل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس لئے یہ صحبت ومعیت کا بہترین بدل بھی ہیں اور حفاظت ایمان کا ذریعہ بھی۔

جغرافیائی حدود حائل ہونے کے باعث میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ میں جلد اول ودوم کے مسودات حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کر سکتا، اور ان سے نظر ثانی کی درخواست کرتا۔ البتہ استاذ الاساتذہ امام القرأت آیۃ من آیات اللہ حضرت مولانا القاری المقری فتح محمد صاحب دامت برکاتہم، مہاجر مدنی سے بذریعہ

مکتوب چند اقتباسات ارسال کر کے تحسین وتائید حاصل ہوئی۔ اور پاکستان کے جید اور ممتاز و مستند علماء اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں اس مسودہ کو پیش کر کے ان سے اس بارے میں کچھ لکھنے کی درخواست کی، جسے انہوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ مخدوم العلماء حضرت مولانا محمد شریف صاحب مدظلہٗ خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ (مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان) اور اسوۃ الصلحاء حضرت العلام مولانا مفتی عبد الستار صاحب زید مجدہم (خیر المدارس ملتان) نے مختلف مقامات سے پڑھا اور تحسین فرمائی۔ نیز کتاب کے بارے میں کلمات تبرک ارقام فرمائے، جو کتاب میں شامل کر دیئے گئے۔

علاوہ ازیں والد محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہٗ (استاذ دار العلوم کراچی) نے بالاستیعاب پورے مسودے کا مطالعہ فرمایا، اور قابل اصلاح عبارت کی نشاندہی فرمائی۔ خصوصاً احادیث کی عبارت نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا۔ اس کے باوجود بندے کا علم ناقص ہے خطاء کا احتمال باقی ہے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اہل علم اس کی اصلاح فرمادیں اور بندہ کو بھی مطلع فرمائیں۔ بندہ اس کا شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس اظہار حقیقت کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ اس مجموعہ کی تمام تر خوبیاں علوم قاسمی کے حامل اور وارث وامین کے لئے زیبا ہیں۔ اور بندہ کی حیثیت محض ایک نا اہل مرتب کی ہے۔ اور بس

من ہیچم وکم ز ہیچ بسیارے   وز ہیچ کم از ہیچ نیاید کارے

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جلد دوم میں بیشتر تقاریر کیسٹز سے لی گئی ہیں، جو مختلف مقامات پر ریکارڈ کی گئیں۔ اس سلسلہ میں بندہ برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ اور مولانا قاری سیف الدین صاحب زید مجدہٗ (مقیم سعودی عرب) کا خاص طور پر شکر گزار اور ممنون ہے کہ انہوں نے بندۂ ناچیز کو یہ تقاریر مہیا فرمائیں۔ اور جلد اول کی طرح اس مجموعہ میں بھی تعاون فرمایا۔ میں ان دو حضرات کے حق میں کلمات تشکر وامتنان کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ حقیقی صلہ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی دے سکتے ہیں۔

بہر حال یہ مجموعہ حاضر خدمت ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے فضل وکرم سے اس کو شرف قبولیت سے نواز کر اس کے منافع کو عام وتام فرمادیں۔ اور ہم سب کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے خیر وبرکت، صلاح وفلاح اور ذریعۂ نجات اخروی بنائیں۔ (امین یارب العلمین. بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔)

چشم دارم کہ دہد رقم مراحسن قبول   آنکہ دُرّ ساختہ است قطرۂ بارانی را

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ / یکم اگست ۱۹۸۱ء

پیش لفظ جلد سوم

حامداً الله العظيم ومصلياً على رسوله الكريم وعلىٰ اٰله واصحابه واتباعه اجمعين. اما بعد ...... اس کارخانۂ کون ومکان کی تمامتر زینت وآرائش اوراس میں رکھے گئے بے شمارخزائن اس انسان کے لیئے بنائے گئے ہیں اوراسے انسان تواپنے خالق کے لئے بنایا گیا ہے: ان الدنيا خلقت لكم وانكم خلقتم للاٰخرة. (الحدیث)

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے جومقصود بعثت انبیاء علیہم السلام ہے۔مگر انسان اس کوفراموش کر چکا اور جن کا وہ مخدوم تھا، ان کومخدوم بنا کر راہ راست سے بھٹک گیا۔تعلیم انبیاء علیہم السلام نے اسے فکر ونظر اور قلب ودماغ کے لحاظ سے اس کائنات سے اتنا اونچا بنایا تھا کہ اس ساری دنیا کی حقیقت کو یہ فرمایا۔ کہ ایک مچھر کے پر برابر اس کی وقعت نہیں۔اور خالق انسان کی یہ صدا اس کوسُنائی ''تو میرے لیئے ہے'' اوراس دنیا کی کوئی چیز تیرا بدل نہیں''۔ بلکہ فرمایا گیا کہ تیرے اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال وافعال کا صلہ ایسا تیار کیا گیا ہے۔ کہ کسی انسان نے دیکھا سنا تو کیا ہوگا، اس کا ادنیٰ تصور بھی قلب بشر پر نہیں گزرا الغرض، ترغیب وترہیب، انذار وتبشیر اور تبلیغ وتذکیر کے ذریعے اسے متوجہ کیا گیا۔ کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی لہو ولعب اوراس کی زیب وزینت متاع الغرور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور متاع زندگی صرف کرنے کے بعد بھی تیرے بنائے ہوئے منصوبے تارعنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اس کائنات سے مقصود خالق کائنات کا تعارف تھا۔مگر انسان اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھوکر رہ گیا۔ بلکہ خود انسان کا وجود اس کے لیئے دعوت فکر ہے۔وفي انفسكم افلا تبصرون. حصول معرفت کی بجائے یہ خدا فراموشی سے زیادہ خود فراموش بن گیا۔نہ اس کے سامنے اس زندگی کا کوئی نصب العین ہے اور نہ زندگی کے بعد آنے والے دور کا کوئی خاکہ ہے، نہ اس کا ثواب عقاب اور جزا وسزا مدنظر ہے۔

انسانیت کے سب سے بڑا محسن حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقدس وبرگزیدہ طبقہ ہے جس نے انسان کوابدی راحتوں اور حقیقی نعمتوں کی راہ پر گامزن کیا اور اسے اس کا نصب العین یاد دلایا اور کس شان سے یاد دلایا۔ لااسئلكم عليه اجرا. نیز حیات مابعدالموت سے روشناس کرایا۔جس سے نہ صرف اس کی یہ زندگی بھی صبر وشکر، عفو ودرگزر، ورع وتقویٰ، زہد وقناعت اور سجدۂ وعبادت جیسے اعمال صالحہ واخلاق حمیدہ میں ڈھل گئی۔ بلکہ

اس زندگی کو اپنانے والے دنیا سے جاتے ہوئے اہل دنیا سے بطور شہادت کہہ گئے: فزت برب الکعبۃ.

بہر حال امن و آشتی، سکون و اطمینان اور راحت وچین کے الفاظ نہیں۔ ان کے حقائق و معارف اور ان کی سچی کیفیات و مصادیق انبیاء علیہم السلام کے دامن رحمت اور ان کی تعلیمات میں پوشیدہ و مضمر ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد آنے والے دور کے لیئے فرمایا گیا۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا اور العلماء ورثۃ الانبیاء. وراثت علوم وکمالات نبوت بعد از ثبوت نسبت ملتی ہے جیسا کہ وراثت دنیا بعد از ثبوت نسبت حاصل ہوتی ہے۔ علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے اس ورثۂ نبوت کو خوب سے خوب پھیلایا۔ نہ اس میں حصول منفعت کو پیش نظر رکھا، نہ مضرت کے اندیشوں کو خاطر میں لائے، نہ حب مال وجاہ انہیں زیر کر سکی، نہ بادشاہوں کی پیش کشیں ان کی استقامت میں لرزہ پیدا کر سکیں۔ ان کا مسلک یہ رہا۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم ——— با میر خان بگوئے کہ روزی مقدر است

بلکہ اس دنیا کی بے حقیقتی و دولت کا اس طرح برملا اظہار کیا۔

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ——— من ملک نیم روز را بیک جو نمی خرم

قلب انسانی کا اس معراج پر پہنچا یہ بلا تعلیم انبیاء علیہم السلام کے ممکن نہیں۔ اور باطن کی بادشاہی اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ——— ایں خیال ست ومحال است جنوں

اور قلب کی جب اصلاح ہو جاتی ہے۔ پھر قالب سے نکلنے والے اعمال بھی اعمال صالحہ کہلاتے ہیں اور دربار خداوندی میں وہ باقیمت ہو جاتے ہیں۔

آج کے سائنسی دور میں جب کہ اعمال کی قیمت دل سے نکل چکی ہے۔ انسان میں شرافت و دیانت عنقاء ہوگئی اور اخلاقی اقدار پامال ہوگئیں۔ جہاں اس کے اور اسباب ہوں گے۔ وہاں ایک بڑا سبب خود سائنس کے اسباب وسامان ہیں۔

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت ——— احساس مروت کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہ بھی ناانصافی ہوگی کہ ساری ذمہ داری اسباب وسامان پر ڈال دی جائے اور ان کو مصرف میں لانے والے انسان سے چشم پوشی کرلی جائے۔ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے آدمی خدا تک پہنچ سکتا لیکن بات وہی ہے کہ ان کے استعمال کا طریقہ کار بھی تعلیمات نبویہ سے معلوم ہو سکے گا۔ پھر ساری دنیا دین بن جائے گی ورنہ دین بھی دنیا ہو کر رہ جائے گا۔ جو بغیر روح محض ایک لاش ہے۔ جس کی کسی معاشرے میں کوئی قیمت نہیں چہ جائیکہ آخرت یا دربار خداوندی میں اس کی قیمت ہو؟ اور اس پر اجر وثواب کی اُمید رکھی جائے۔

حضرات اہل اللہ انہی تعلیمات کے حامل ہیں اور انہی تعلیمات کے ذریعہ الحمدللہ ایک زمانہ روشن ہے۔ آپ

کے ہاتھوں میں موجود کتاب ''خطبات حکیم الاسلام'' کی تیسری جلد ہے اور اس میں اس چشمۂ فیض کے مدیر و مہتمم کے خطبات و مواعظ جمع ہیں۔ جس ادارے کے نور علم سے پورا عالم جگمگا رہا ہے جہاں اہل اللہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور مدرس و معلم بھی قومی راہنما اور مبلغ و مصلح بھی ان مواعظ و خطبات میں کہا کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

الحمدللہ ناظرین کرام پہلی دو جلدیں دیکھ چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس جلد کو بھی شرف قبولیت بخش کر اس کے منافع کو عام و تام فرمادیں گے اور جہاں حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے لئے ذخیرۂ آخرت اور باعث اجر و ثواب ہوگی۔ وہاں خود قارئین کرام کے دینی فوائد بھی اس سے پورے ہوں گے۔ نیز خطباء دائمہ کے لیے یہ تحفۂ گراں مایہ ثابت ہوگی۔

اس جلد کے تمام مسودے پر گرامی قدر حضرت والد ماجد صاحب دامت برکاتہم نے بھی نہایت محنت و عرق ریندی سے نظر ڈالی اور پورا مسودہ بنظر عمیق دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس جلد میں خطبۂ طیبہ کے علاوہ جتنی تقاریر آئی ہیں، وہ سب ٹیپ ریکارڈ سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ خطبۂ طیبہ انڈیا کا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں وہ اہم خطبۂ صدارت ہے جو حضرت حکیم الاسلام مدظلۂ نے جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور ضلع شاہ آباد آرہ و بہار، انڈیا، کے سترہویں جلسۂ سالانہ منعقدہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ کو ارشاد فرمایا تھا برائے افادہ من و عن ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ سے سننے میں غلطی ہوسکتی ہے تصحیح میں غلطیاں رہ جاتی ہیں کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کم از کم علمی غلطی نہ رہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو حضرات اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اسے حضرات حکیم الاسلام مدظلۂ العالی کی ذات والا ستودۂ صفات کی طرف منسوب نہ فرمادیں، بلکہ اسے مرتب کی نااہلیت پر محمول فرمایا جائے اور اس سے مطلع فرمایا جائے، بندہ اس پر شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس کتاب کی تدوین میں اپنے ان قابل احترام بزرگوں کا ذکر خیر اور ان کا اظہار تشکر ضروری خیال کرتا ہوں، جنھوں نے مجھے تقاریر کی کیسٹز مہیا فرمائیں یعنی برادر محترم حضرت مولانا قاری سیف الدین صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہما ان حضرات کی بدولت کیسٹز میں محفوظ مواد کتابی شکل میں منظر عام پر آسکا، اللہ تعالیٰ ان ہر دو حضرات کو بہت بہت جزائے خیر نصیب فرمادے اور اپنے دربار عالی سے اپنی اور ان کی شایان شان اجر جزیل عطا فرمادے اور تادمِ آخر اپنی رضا کے ساتھ خدمت کلام اللہ کی توفیق نصیب فرمادے اور شرف قبولیت بخشے۔ امین ثم امین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندۂ ناچیز محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد چہارم

اما بعد ......حضرات اہل اللہ کے خطبات ومقالات اوران کے سوانح وتذکرے دل کی دنیا کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، دل سے دنیا کی محبت زائل ہوجائے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت ومحبت سے دل معمور ہوجائے، اس کے لئے اصل تو اہل اللہ کا فیضِ صحبت ہے جس علم وعمل میں رسوخ پیدا ہوتا ہے، علم کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے اور مقصودِ علم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، قولب کا زنگ دور ہوکر امراضِ باطنیہ کا احساس ہونا شروع ہوجاتا ہے اور یہی احساس ان کے ازالہ کا ذریعہ بن کر زینۂ ترقی ثابت ہوتا ہے۔ آج کے جدید دور نے صحبت ومعیت کی اہمیت کو حسی مثالوں سے اس طور پر نمایا کردیا ہے کہ اب اس کا انکار گویا واقعات کو جھٹلانا ہی نہیں بلکہ خود اپنی عقل وخرد کی ناکامی کا اعتراف بھی ہے، جیسے آم کو لیموں یا کسی اور پھل کی قلم لگادی جائے تو آم کی صورت گو دہی رہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اُسے روزِ اول سے ودیعت کی گئی ہے، تاہم اس کا ذوق باطن اوراندرونی مزہ دہ ہوگیا جو لیموں کے باطن کا تھا۔

اہل اللہ کے قلوب سے اپنے قلب کی پیوندکاری سے اہل اللہ کا ذوق وشوق اوران کی باطنی کیفیات دل میں منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں اوراسی صحبت کے اثرات سے انسان کا قلب وقالب بدلتا چلا جاتا ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے: یا ایھا الذین امنوا تقوا اللہ و کونوا مع الصادقین...... اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جو کہ مقصود ہے اور حصولِ مقصود کا آگے سہل راستہ ہے کہ: ''سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ'' گویا تقویٰ کے حصول کا ذریعہ صادقین کی معیت ہے۔

چونکہ قرآن حکیم ابدی کتاب ہے اس کے تمام اوامر ونواہی بھی ابدی ہیں، تو اہل صدق کی معیت اختیار کرنے کا حکم بھی ابدی اوردائمی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل صدق وصفا کا وجود مسعود ہمیشہ ہوگا، ورنہ حکم کے پورا کئے جانے کی کوئی صورت نہیں، الغرض اہل صدق ہمیشہ تھے اور ہمیشہ ہوں گے، ہاں اس جنس گرانمایہ کی قلت وکثرت ہوسکتی ہے اوراہل طلب کو ڈھونڈنے سے کیا کچھ نہیں مل سکتا؟

بہرحال صحبت صالحین کی اس قدر اہمیت ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا چھوٹے سے چھوٹا عمل پوری امت کے تمام اعمال پر اسی لئے بھاری ہے کہ وہ صحبت نبویؐ سے ایسے باطنی کمالات حاصل کر

چکے ہیں کہ جس کیفیت اور حسن استغراق سے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ قدس میں عجز و نیاز کا اظہار کر پاتے ہیں، وہ کسی ایسے شخص کے لئے ممکن ہی نہیں جس نے صحبت نبویؐ سے حصہ نہ پایا ہو، اسی کو تو کہا ہے کہ ’’وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا‘‘ اسی مسیحائی اعجاز کا ظہور تھا کہ دنیا کے جس خطے کی طرف ایک صحابیؓ بھی نکل گئے تو دنیا کی دنیا بدلتی چلی گئی، یہی قلب کی وہ دولت ہے جس کے سامنے دنیا کا کوئی فکر، فکر نہیں رہتا اور پوری دنیا کے بارے میں (متاع الدنیا قلیل) کی قلبی و حقیقی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور فقر میں شاہی کرنے والا انسان اپنی صفات میں ملکوت کو شرما دیتا ہے کہ

نے تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے   جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

دنیا کے جاہ و جلال سے حجاب غرور اُٹھ جاتا ہے اور مردار بکری کی دینار و درہم سے خرید کو معیوب سمجھنے والا انسان اپنی زندگی کے سرمایہ سے دنیا و مافیہا کی خرید پر آمادہ نہیں ہوتا کہ

نرخ بالا کن ، ہنوز ار زانی

صبر و توکل، زھد و غناء ورع و تقویٰ کی وہ شمع قلب میں فروزاں ہو جاتی ہے کہ وہ زبان حال سے کہتا ہے:

من دلق خود بافرشاہاں نمی دھم   من فقر خود بملک سلیماں نمی دھم
از رنج فقر درد لے گنجے کہ یافتم   ایں رنج را براحت شاہاں نمی دھم

اسی خزانے کا مالک جذب و شوق اور قائیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے   ایک ڈھیر ہے یاں خاک کا اور آگ دبی ہے

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ ایک مقام پر فیض صحبت کی اسی تاثیر و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

’’صحبت اولیاء میں ایک خاص بات قلب میں ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس سے خروج عن الاسلام کا احتمال نہیں رہتا، خواہ گناہ اور فسق و فجور سبھی کچھ اس سے وقوع میں آ دیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاوے، مردودیت تک کبھی نوبت نہیں پہنچتی، برخلاف اس کے ہزار برس کی عبادت میں بذاتہٖ یہ اثر نہیں کہ وہ کسی کو مردودیت سے محفوظ رکھ سکے، چنانچہ شیطان نے لاکھوں برس عبادت کی لیکن وہ اس کو مردودیت سے نہ روک سکی، یہی معنی ہیں اس شعر کے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی چیز جو مردودیت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے ہزارہا سال کی اس عبادت سے بڑھ کر ہے جس میں یہ اثر نہ ہو۔‘‘ نیز ایک اور مقام پر فیض صحبت اور اگر وہ میسر نہ ہو تو اس کے لئے بدل کیا ہو، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

''کمال اسلام کے لئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم وہمت میں قوت پیدا ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے، یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پڑ جاتی ہے اسی کو کہا ہے کہ:

مقام امن دمے بے غش و رفیق شفیق ۔ گرت بدام میسر شود زہے توفیق

اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی، جب بھی موقع ہو۔

ایک اور چیز اس کے قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مروارید میسر نہ ہو تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مے ناب وسفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے، اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی۔
(الاسلام الحقیقی، ص:۹۲)

بہر حال ان مواعظ وخطبات سے ان شاء اللہ جہاں علمی نکات واسرار آپ کے سامنے آئیں گے وہاں روحانی رموز ودقائق بھی حل ہوں گے، اس دور صدف میں صحبت اہل اللہ کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان انوار وبرکات سے بھی حصہ وافر پائیں گے۔

دادیم تراز گنج مقصود نشاں گر مانر سیدیم شاید تو بری

بہر حال خطبات حکیم الاسلام کی چوتھی جلد اس وقت آپ کے زیر ملاحظہ ہے مختلف موضوعات پر مواعظ جمع ہیں، مضامین کے لحاظ سے ہر وعظ انفرادیت کا حامل اور اپنی نوعیت میں ندرت رکھتا ہے، آج سے ۴ سال قبل جو مواعظ طیبہ کی جمع وترتیب کا سلسلہ شروع کیا تھا اب چوتھی جلد کی شکل میں اس کا مجموعہ آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔

آغاز سفر میں ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ خطبات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ان کا پھیلاؤ اس قدر ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کم ہمتی کو دیکھوں تو بات اب بھی سمجھ سے بالاتر ہی نظر آتی ہے کہ آخر یہ کام کیسے سرانجام پایا؟ محسن اساتذۂ کرام اور مخلص احباب کرام کی دعائیں شامل حال رہیں تو یہ کام ہو سکا، اس لئے جو کچھ بھی آپکو نظر آ رہا ہے اس کو ہرگز اس بندۂ عاجز کی محنت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اپنی دعوات صالح کا ثمرہ خیال فرمادیں۔

اور اس کا اصل سبب تو حضرت العلام حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی کا اخلاص وللہیت ہے جس کی قبولیت کا یہ مظہر ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہم سب کیلئے اس کا نافع بنائیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے ارشاد فرمودہ خطبات الحمد للہ ہر لحاظ سے جامع ہوتے ہیں، ایسے علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی خطبات ومواعظ پر عنوان قائم کرنا مجھ ایسے بے بضاعت کے لئے نہایت مشکل کام تھا مگر بفضلہ تعالیٰ سرانجام پایا۔ بایں ہمہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عنوانات قائم کرنے میں جس نزاکت اسلوب کو ملحوظ رکھنا چاہیے

تھا وہ ''ذوق ادب'' سے خالی ہونے کی بناء پر نہ رکھ سکا قارئین کرام کو خطبات کے علمی مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے جو خوش کن کیفیات حاصل ہونگی خدانہ کرے کہ اس میں ترتیب عنوانات ان کے ذوق سلیم کے لئے بارگراں ثابت ہو۔ اپنی سعی وکوشش کی حد تک حسن ترتیب کا خیال رکھا ہے مگر پھر بھی کمی کا رہ جانا امر لازم ہے:

فدایت دیدہ ودل رسم آرائش ازمن مپرس   خراب ذوق گل چینی چہ داند باغبا نیہا

اپنے احباب مخلصین حضرت الحاج مولانا القاری المقری سیف الدین صاحب مدظلہٗ مقیم مکہ مکرمہ اور حضرت الحاج مولانا قاری ومقری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ مقیم جدہ (سعودی عرب) کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خطبات کی تمام جلدوں کے لئے بھر پور مواد مہیا فرمایا۔ اور اس طرح یہ عظیم علمی سرمایہ منظر عام پر آسکا، اپنے برادر عزیز قاری محمد قاسم عزیز سلمہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ بھی اس سلسلہ میں اپنی ذاتی مصروفیت کے باوجود تعاون فرماتے رہے حق تعالیٰ شانہٗ ان تمام حضرات کے درجات بلند فرمادیں اوران کو بہت بہت اجر وصلہ نصیب فرمادیں۔ اوران خطبات ومواعظ کوشرف قبولیت نصیب فرمادیں۔ امین ثم امین یارب العٰلمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم الف الف مرۃ۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ / مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد پنجم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ اجمعین. اما بعد ......
خطبات حکیم الاسلام جلد پنجم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے، اللھم لا احصی ثناء علیک کما اثنیت علیٰ نفسک. اللھم لک الحمد کالذی تقول وخیرا مما نقول. خطبات کی ترتیب کا جب آغاز ہوا تھا تو جلد اول کی ترتیب کے بعد اپنے محدود وسائل کے پیش نظر بندہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اپنے اکابر واساتذہ کرام کی دعاؤں سے یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ اہل علم میں مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنے بندوں میں مقبول بنایا، امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے فضل عظیم اور دریائے کرم کے صدقے اپنے جناب اقدس میں اسے قبول فرما کر آخرت کی نجات کا ذریعہ بنا دیں گے وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

ہمارے سلسلۂ قرآن حکیم کے جد امجد حضرت اقدس عارف باللہ شیخ القراء مولانا قاری فتح محمد صاحب (مہاجر مدنی) قدس اللہ سرہٗ نے تو اس ناکارہ کی اس قدر حوصلہ افزائی وعزت فرمائی کہ حضرت والاؒ کی شفقتوں کے اظہار کے لئے بندہ کے پاس الفاظ نہیں جب کبھی بھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، بااہتمام دریافت فرماتے خطبات کی مزید جلد آئی، اور اتنا شغف رکھا کہ چاروں جلدیں اہتمام کے ساتھ اپنی مجالس میں سنیں، جلد چہارم کے بعد بھی دریافت فرمایا کہ اور جلد آئی، بندہ نے عرض کیا پہلے بھی آپ کی دعاؤں سے سب کچھ ہوا، آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، انشاء اللہ آ جائیگی، الحمدللہ حضرت اقدس کی دعاؤں سے پانچویں جلد تو آپ دیکھ رہے ہیں، مگر افسوس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا، اور میں جلد حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ کو اپنے مدارج قرب میں بہت زیادہ ترقیات سے نوازے آمین!

بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے یہ کام جاری رہا اور انشاء اللہ ابھی جاری ہے اسی طرح اپنے عظیم محسن استاذ حضرت اقدس شیخ القراء قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک بار حاضری ہوئی

فرمانے لگے۔ بھائی! میں تو آپ کو روزانہ یاد کرتا ہوں، آپ پتہ نہیں یاد کرتے ہو یا نہیں؟

آپ کے اس فرمان پر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی بہت زیادہ ہوئی پھر ارشاد فرمایا: ''بھائی! وہ آپ کی ''خطبات حکیم الاسلام'' کی جلد میرے تکیے کے نیچے رکھی ہے جب رات کو (تدریس سے فارغ) ہوکر گھر جاتا ہوں تو اسے دیکھتا ہوں''۔

پھر فرمایا: ''بھائی! زندگی میں سب یاد کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں حقیقی محبت کا پتہ تو مرنے کے بعد چلتا ہے اس وقت کون یاد رکھتا ہے۔''

حضرت اقدسؒ کا اشارہ اس طرف (جو میں سمجھ سکا) چونکہ کتاب کا انتساب حضرت والا کی طرف تھا کہ اب تو آپ محبت کا اظہار کر رہے ہو مرنے کے بعد بھی یاد رکھنا، مراد حضرتؒ کی یہ تھی اس وقت آدمی کو دعاؤں میں یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے، یہ حضرتؒ کی کمال تواضع تھی، ورنہ کجا بندہ نابکار اور کجا میری دعاء، ان حضرات اکابر کے اس تذکرہ خیر و برکت سے خود خطبات اور مرتب خطبات سے جو انکی محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ خطبات کی اہمیت اور مرتب کے لئے نجات کی سند ہے، ایفائے عہد اور تعمیل حکم کے لئے خود بھی حضرت اقدسؒ کے ہے دعا گو ہوں اور تمام قارئین کرام سے بھی ملتجی ہوں۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ القراء قاری فتح محمد صاحبؒ اگرچہ وصال فرما گئے مگر اب بھی حضرت والا کا خط مبارک برائے حصول برکت اور ''دعوات فتحیہ'' کو اسی طرح جزو کتاب بنایا جا رہا ہے جس طرح ان کی حیات مبارکہ میں تھا، اللہ تعالیٰ ان سب اکابر کو ہماری طرف سے بہت جزائے خیر نصیب فرمائے آمین!

بہر حال ان حضرات اکابر کی دعاؤں نے بہت کام دیا، علاوہ ازیں اور بہت سے اکابر اور خطبات کے قارئین کرام نے بہت دعاؤں سے نوازا، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اکابر کی دعاؤں اور قارئین خطبات کے دعاؤں کا ثمرہ ہے اور بس!

پانچویں جلد کی ترتیب کے سلسلہ میں جو مطبوعہ تقاریر حاصل ہوئیں وہ بھی شامل کی گئیں، لیکن بعض جگہ کچھ ناگزیر تبدیلی کرنی پڑی، بالخصوص بعض عنوان بدلنے پڑے اور ان کو خطبات کے اس طرز کے موافق کیا گیا جو قارئین کرام کے پہلی چار جلدوں کے مطالعہ کی وجہ سے ایک خاص ذوق بن گیا تھا با ایں ہمہ بندہ ادارہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک پشاور، اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مبلغ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت بہاولپور کا بھی تہہ دل سے بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے یہ تقریر بہم پہنچائی۔

اسی طرح اپنے برادر محترم جناب مولانا محمد رفیق صاحب انور نعمانی (مقیم مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفا وکرامۃ) کا تہہ دل سے شکر گزار اور ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے پانچویں جلد کا خاصا مواد مہیا کیا اور پانچویں جلد میں ان کی طرف سے بہت ہی زیادہ معاونت ہوئی، اس تبلیغی سلسلہ میں جس پاکیزہ جذبے سے انہوں نے معاونت کی

ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور دارین میں اس کا بدلہ نصیب فرمائے آمین!

خطبات حکیم الاسلام کی پانچویں جلد کے منظر عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، ظاہری طور پر جہاں مواد کا نہ ملنا باعث تاخیر ہوا، وہاں یہ بھی سبب بنا کہ میری اہلیہ محترمہ کا بچے کی ولادت کے چند روز بعد انتقال ہو گیا اور ذہنی سکون جو ترتیب و تالیف کے کام کیلئے لازمہ ہے، نہ رہا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے، قارئین باتمکین سے ان کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور یہ استدعاء بھی ہے کہ خطبات کی چھٹی جلد کی تکمیل کیلئے دعاؤں سے یاد فرمائیں، احسان و کرم ہوگا۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ

پیش لفظ جلد ششم

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ اٰله وصحبه ومن تبعهم باحسان الیٰ یوم الدین. امابعدُ...... حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل وکرم اوران کی بے پایاں عنایات سے خطبات حکیم الاسلام کی جلد ششم حاضر خدمت ہے۔ الحمدللہ پہلی پانچ جلدوں کومقبولیت حاصل ہوئی، منظرعام پرآنے کے بعد مسلسل اشاعت ہورہی ہے، اورمتعدد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے، قارئین خطبات کی اسی دلچسپی کے باعث بندہ کا بھی حوصلہ بڑھتا رہا، اورالحمدللہ یہ سلسلہ چل رہاہے، جلد ششم بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہٗ کی نابغۂ روزگار شخصیت کواللہ تبارک وتعالیٰ نے ایجادکلام اورحسن بیان کی خوبیوں سے بہت نوازا ہے۔ اوران کے بحرآفرین خطبات کو سننے والے بلا مبالغہ لاکھوں انسان آج بھی موجود ہیں بیان کی خوبی حقیقت یہ ہے کہ دیدنی ہے نہ کہ شنیدنی، جس کاتعلق بطورخاص کیفیت بیان سے ہے۔اس لئے وہ کاغذ وقلم کی دسترس سے باہر ہےاوراس کامصداق ہے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید — لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ اپنے ذوق تقریر کے بارے میں خود ہی رقمطر ہیں:

تحریر وتقریر میں مجھے دلچسپی لڑکپن سے ہی تھی۔ اسے بڑھانے اورترقی دینے نیز اس لائن پر سفر کرانے میں میرے اکابر پیش پیش رہتے تھے، میری طالب علمی کے دور میں حضرتالاستاذ علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ جو مجھے اپنے ساتھ پنجاب کے ایک تبلیغی دورہ میں لے گئے، بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے اجتماعات میں میری تقریریں کرائیں، یہ واقعہ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کا ہے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملتان کے ایک جلسہ میں میں اس طرح شریک ہوا کہ بارش میں کپڑے بھیگ چکے تھے اورمیں نے ستر پوشی کے لئے ایک بڑا سا کمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھا تھا، نہ سرپرٹوپی تھی اورنہ پیرمیں جوتا، اسی ہیئت سے اس میں اس بڑے اجتماع کے سامنے آگیا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے مجمع کوخطابت کرتے ہوتے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ:"یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں مستقبل کے ایک بہت بڑے مقرر ہیں، ہرگز یہ خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں توان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے۔"

یہ حضرت استاذ مرحوم کی حوصلہ افزائی تھی، ورنہ کہاں ایک معمولی سا طلب علم اورکہاں لعل ویاقوت ایسی اکابر

تو میرے مربی تھے۔

۱۹۴۹ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ملک کے تعلیمی مسائل پر لکھنؤ میں ایک کانفرنس طلب کی، اس میں احقر کو بھی تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا آزادؒ نے میری تقریر کی جو تحسین فرمائی وہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ غرض میری زندگی کا ایک بڑا حصہ تینوں براعظموں کے طویل سفروں میں گذرا ہے اور حق تعالیٰ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائی، برما، حجاز، افغانستان، عدن، جرمنی، جنوبی افریقہ، لیبیا، روڈیشیا، مدغاسکر، حبشہ، زنجبار، سری لنکا، ایسٹ افریقہ، رے یونین، کویت، لبنان، اردن، فرانس، اور انگلستان اور بہت سے ممالک میں مجھے بار بار آنے جانے اور وہاں مذہبی اور علمی سوسائٹیوں میں شرکت کا موقع ملا ہے، میں جہاں تک حق تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر ہزاروں ہزار شکریہ ادا کرتا ہوں اور عہدہ برآ نہیں ہوسکتا کہ ان لاکھوں بندوں تک مجھے اسلام، ایمان انسانیت اور دیو بند کے مسلک کے تحت اخوت درو داری کا پیغام پہنچانے کی توفیق عطا ہوئی وہیں اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ اپنے اساتذہ اور مربیوں کی نظیر شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آئی، جن سے میری علمی اور اخلاقی تربیت کا تعلق رہا ہے۔''

جس طرح آپ نکات ومعارف اور لطائف وحقائق کو بزبان اردو بلا تکلف بیان فرماتے ہیں اور گھنٹوں کے بیان میں بھی کچھ تامل نہیں ہوتا، تسلسل اور حلم ووقار کے ساتھ گو''مرقوم مقالہ'' پڑھتے چلے جار ہے ہیں، اسی طرح آپ کو عربی اور فارسی میں تقریر دبیان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی، چنانچہ عرب ممالک اور افغانستان میں آپ بزبان عربی دفارسی بلا تکلف فصیح وبلیغ تقاریر فرماتے رہے، اور علم وعرفان کی بارش برساتے رہے، جس کا آپ ان مشاہدات وتاثرات سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، جو آپ کی گوناگوں فضائل ومناقب کی حامل تاریخی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تذکرہ نگار اور اہل قلم حضرات نے صفحات تاریخ میں رقم کئے ہیں۔

''تاریخ دارالعلوم دیو بند'' کے مرتب: محترم جناب سید محبوب رضوی صاحب آپ کے انداز خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: علمی سلسلے میں درس وتدریس کے علاوہ فن خطابت اور تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سنی جاتی تھیں، اہم سے اہم مسائل پر بھی دو، دو تین، تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے سے آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلف نہیں ہوتا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں آپ اپنے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع بھی ہو چکی ہیں، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو، ان کی رواں رواں اور دلکش تقریر جب علم کے گہرے سمندر سے گذرتی تھی تو لہروں کا سکوت قابل دید ہوتا تھا۔

جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطبات صدارت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے

تھے آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقہ اثر پیدا ہوا۔ بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلہ سفرحجاز آپ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں جوتقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متاثر کیا، سلطان ابن سعود نے شاہی خلعت اور بیش بہا قیمت کتب کے عطیہ سے اعزاز بخشا۔

دوسرے بیرونی ممالک میں افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، عدن، کویت، حجاز، حبش، مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے تھے، جہاں اپنی اردو، عربی، اور فارسی کا لوہا منوایا۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم ناظم جمعیت علماء ہند کا آپ کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ اب تک مہتممین دارالعلوم دیوبند ثوابت تھے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب سیارہ ہیں۔

آپ کو ہر جگہ سپاسنامے دے گئے، اور لوگوں کو دارالعلوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے مسلک کی اشاعت ہوئی، دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی تھی وہ تعلیم وتدریس اور دعوت وتبلیغ تھی، ان کمالات کی وجہ سے ملک وبیرون ملک میں آپ کو ایک خاص امتیازی مقام حاصل تھا، عام تبلیغی دوروں کے علاوہ جب دیوبند میں قیام ہوتا تو عصر سے مغرب تک عمومی مجلس کا معمول رہتا تھا جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے اور تبلیغ واصلاح ہوتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی سفر وحضرت میں جاری رہتا تھا، آپ کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع ہے، جو ہند اور بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۳۳۶ھ سے ہر جمعہ کو جامع مسجد دیوبند میں تقریر کا معمول تھا، جو تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہا، بعد میں کثرت اسفار کی وجہ سے متروک ہوگیا اور تقریریں ملک گیر ہوگئیں۔

۱۳۵۳ھ میں جب کہ شاہ ابن سعود مرحوم پر قاتلانہ حملوا ہوا جس میں وہ بال بال بچ گئے، ہندوستان کے وفد نے فضلاء وعمائدین کی طرف سے مبارک باد کا جلسہ فندق مکہ میں منعقد کیا گیا جس کا صدر مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بنایا گیا تھا علماء ہندوستان کے وفد نے شاہ ابن سعود کو مبارک باد پیش کی اس موقع پر آپ نے ہی عربی کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ تبریک کی تجویز پڑھ کر سنائی تھی۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ بمبئی نے جس میں تمام فرقوں کے علماء اور تمام مؤثر تنظیموں کے سربراہ شریک تھے، آپ کو اپنا صدر منتخب کیا اس سلسلے میں دو مرتبہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کو دعوت دے کر بلایا اور پرسنل لاء کے موضوع پر گفتگو کی، بہر حال ملک وقوم میں آپ کا ایک خاص علمی وقار قائم تھا، کئی اکیڈیمیاں آپ کی تالیفات کی طباعت واشاعت کا کام انجام دے رہی ہیں۔

مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں متعدد مرتبہ شریک ہو چکے تھے اور پوری دنیا میں تبلیغی دورے فرما چکے تھے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند)

ماہنامہ بینات کراچی کے مدیر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب زید مجدہم، حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات خطابت کو تحریر فرماتے ہیں، جس میں انہوں نے خصوصیت سے خطبات حکیم الاسلام کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں، حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت وہبیہ کا طوفان آمڈ آیا ہے۔

حضرت قاری صاحب مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب فرمایا ہوگا، اور بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی، لیکن ان کی ہر تقریر کا ہر موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف و اسرار کے ایسے گل و لالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آ جاتی، ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

ایک موقعہ پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا، بلکہ لب و لہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنیٰ بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے؟'' پیش کیا کہ یہ انکار کیلئے بھی اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد و تحسین کے لئے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لئے بھی۔

الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے'' کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب و لہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔

حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں، حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ خطیب مسجد غفوریہ حسن پروانہ کالونی ملتان نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئی ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں، تو امت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرا فراہم ہو جائے گا۔ بہر حال حضرت قاری صاحبؒ کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل شیخ طریقت، بے

بدل خطیب، صاحب طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے، حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلفؒ کے امین تھے قدرت فیاض نے حسن و جمال اور فضل و کمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم و فراست، حلم و وقار، حسن تدبیر اور نظم و نسق کی بے پناہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف بولتے تھے اور خطاب فرماتے تھے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے اور علوم وہبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔

نیز بندہ کے نام ایک مکتوب گرامی میں بھی تحریر فرمایا: محمد یوسف لدھیانوی (ماہنامہ بینات نیوٹاؤن کراچی)

عزیز مکرم جناب مولانا قاری محمد ادریس صاحب سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...... پرسوں آپ کی کتاب "خطبات حکیم الاسلام" محمد سعید سلمہٗ نے دی، اس کا ابتدائیہ پڑھا اور جستہ جستہ مقامات سے اصل کتاب بھی پڑھی، حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور توفیق مزید سے نوازیں، آپ نے بہت مفید کام کیا ہے اور بڑی محنت سے کیا ہے، یہ ان شاء اللہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا، دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام: محمد یوسف ۷/۴/۱۴۰۱ھ

ماہنامہ البلاغ کے مدیر اور سپریم کورٹ کے جج حضرت مولانا محمد تقی عثمانیؒ صاحب زید مجدہم (استاذ حدیث دارالعلوم کراچی) حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے انداز خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو وعظ و خطابت کا ایک ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محفوظ اور مستفید ہوتے تھے مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے، جوش و خروش نام کو نہ تھا لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیر وزبر کرنے کی بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا، حضرت قاری صاحب نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی

اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔

بہر حال برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

عالی جناب پروفیسر احمد سعید صاحب تھانویؒ ایم اے، آپ کے حسن خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام اور درس وتدریس کے علاوہ تبلیغی واصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں، جو ناقابل فراموش ہیں، آپ کو فن خطبات اور تقریر میں ید طولیٰ اور خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں اہم سے اہم اسلامی مسائل پر دو دو تین تین گھنٹے مسلسل اور بے تکلف تقریر کرنے اور ٹھوس علمی مواد پیش کرنے میں آپ کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، حقائق واسرار شریعت کھولنا اور تخلیق وایجاد مضامین آپ کا خاص حصہ تھا، جسے آپ کے اکابر واساتذہ بھی تسلیم کرتے تھے، تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص تسلی حاصل کرتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ کی تقریریں خصوصی طور پر مقبول ہوئیں، آپ کی معرکۃ الآراء تقریریں خود یونیورسٹی نے شائع کی ہیں، جیسے ''سائنس اور اسلام'' ملک کے علمی طبقوں میں آپ کو مدعو کیا جاتا تھا، اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی گونج نہ پہنچی ہو۔

بمبئی وغیرہ جیسے اہم شہروں میں آپ کی علمی تقریروں سے دارالعلوم کا ایک خاص حلقہ پیدا ہوگیا، ان علمی واصلاحی تقریروں کا وو دہینکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ چکا تھا، بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے کافی اثرات اونچے حلقوں میں پہنچ چکے تھے۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلۂ سفر حجاز جب کہ آپ دوسرے حج کے لئے روانہ ہوئے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں باریاب ہوئے، اور آپ کی تقریر عربی میں ہوئی، سلطان نے جواباً شکریہ کی تقریر کی، اور بوقت رخصت شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب دینیات سے اعزاز بخشا، اسی سفر میں مدینہ منورہ کے المدرسۃ الشرعیہ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر بھی آپ کی عربی تقریر قابل ذکر ہے، جو مختلف عربی ممالک کے مجمع میں ہوئی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

۱۳۷۸ھ میں آپ کا سفر افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند اور حکومت افغانستان کے درمیان علمی وعرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا اور حکومت افغانستان کے مہمان ہوئے، وہاں کے علمی حلقوں نے آپ کا خیر مقدم کیا کابل کی انجمن

ادبی اعلیٰ سرکاری سوسائٹی جمعیت علماء افغانستان، مجلس قانون ساز وغیرہ اداروں نے آپ کو تقریر کے لئے مدعو کیا۔ آپ نے فارسی زبان میں برجستہ تقریریں کیں، جس سے تمام حلقے متاثر ہوئے، اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، کینیا، جنوبی افریقہ، زنجبار، روڈیشیا، ری یونین، مدغاسکر، حبشہ، مصر، شام، اردن، عراق، ایران، پاکستان وغیرہ میں آپ کی علمی تقریروں نے عوام وخواص کو بے حد متاثر کیا، عام تعلیمی خدمات کے سلسلے میں حکومت افغانستان کی خواہش پر آپ نے کابل کی تمام یونیورسٹیوں کا معائنہ فرمایا اور ان کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے پیش کی، جسے حکومت نے استحسان کی نگاہ سے دیکھا۔

۱۳۵۹ھ میں والی ریاست قلات، بلوچستان اور ریاست بہاولپور پنجاب کے وزیر تعلیم نے آپ کو نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے مدعو فرمایا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ مدرسہ بورڈ آسام، پنجاب یونیورسٹی الہٰ آباد یونیورسٹی اور جامعہ نظامیہ حیدرآباد نے آپ کو دینیات کے پرچوں کا ممتحن قرار دیا۔

غرضیکہ آپ پوری دنیا کے بہترین خطیب اور بین الاقوامی طور پر ایک عظیم اسکالر تسلیم کئے جاتے تھے، اور ہندوستان وپاکستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر آپ نے تقریر وخطابت کے ذریعے اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسلک دارالعلوم دیوبند کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا، پاکستان میں متعدد بار تشریف لائے اور جامعہ اشرفیہ لاہور، خیر المدارس ملتان، دارالعلوم کراچی، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار جامعہ رشیدیہ ساہیوال، اور راولپنڈی وپشاور کے دینی مدارس میں اپنی علمی تقاریر سے لاکھوں افراد کو منور کیا، اور ہزاروں کی اصلاح فرمائی، مغربی ممالک میں ہزاروں افراد کو مشرف بہ اسلام کیا، اور آج دنیا بھر میں لاکھوں عقیدت مند پھیلے ہوئے ہیں۔

گرامی قدر حضرت محترم مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں کہ: ان کا دعوت دارشاد کا میدان بھی آفاقی تھا، اور طرز اصلاح وتربیت اشرفی، مواعظ وخطبات کا انداز البیلا، اچھوتا، دلکش اور ہر طبقہ کے لئے دل آویزی وتاثیر، قاسمی حکمت کی گہرائی اور ان کے اپنے اخلاق کی شیرینی ونرمی، پائی جاتی ہے، زبان خلق نے انہیں ”حکیم الاسلام“ کے نام سے پکارا اور حق یہ ہے کہ ان کی تصنیفات اور مواعظ وخطبات نے اس خطاب کی توثیق کر دی۔ ماہنامہ البیان پشاور (ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ)

حضرت اقدس مولانا تاج محمود صاحب مرحوم (فیصل آباد) فرماتے ہیں: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پوتے، ایک جید عالم دین، بلند مرتبہ فقیہ، بے شمار کتابوں کے مصنف، قادر الکلام خطیب اور ملت اسلامیہ کے ممتاز حکیم وفلسفی تھے، نصف صدی سے زائد تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ رہے اور اس دوران انہوں نے دنیا کی اس مشہور علمی اور دینی درس گاہ کو چار چاند لگا دئے، حضرت قاری صاحبؒ بے شمار خوبیوں اور اوصاف کا مجموعہ تھے، لیکن حق تعالیٰ نے انہیں زبان وبیان پر جو

ندرت اور قدرت عطا کر رکھی تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے، وہ جب بھی کسی موضوع پر تقریر کرنے بیٹھتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے دل ودماغ کا کنکشن عالم بالا میں کہیں جڑ گیا ہے، وہ بولتے کیا تھے موتی رولتے تھے اور ان کا بیان سن کر بے ساختہ زبان سے نکلتا تھا کہ ''لفظ لفظ ٹپکتا ہے عرش سے'' آپ نے بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعات میں اپنی بے مثال حکیمانہ تقریریں کیں اور اس مقصد کے لئے پاکستان اور بھارت کے چپے چپے پر سفر کرتے رہے، بلکہ پوری دنیائے اسلام نے ان کے قدموں کا تیمن اور ان کی میزبانی کا مجد حاصل کیا۔ آپ کی تقاریر، مواعظ ایسے سلجھے ہوئے ہوتے کہ آپ بے ڈھب جذبات کا شکار ہوئے بغیر روانی اور تسلسل سے بولتے جاتے تھے، موضوع کی مناسبت سے مسلسل عجیب وغریب مثالیں، حکایات، واقعات قرآن وحدیث اور عقلی ونقلی دلائل پیش کرتے جیسے کہ مقالہ وغیرہ پڑھ رہے ہوں۔

آپ کی ہر بات سامعین کے ذہنوں میں اترتی جاتی اور قلب ودماغ میں بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تقریر فرما رہے تھے جس میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچ گئے، شاہ صاحب کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے اور یہ عظیم الشان خطاب سنتے رہے، مگر پھر یک دم وجد کی سی حالت طاری ہوگئی، بے اختیار نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور چند منٹوں کی اجازت لے کر مائیکرو فون پر آ کھڑے ہوئے، اور اپنے دو شعر حضرت قاری صاحب کی نذر کرتے ہوئے قاری صاحب کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار ان اشعار کو پڑھتے رہے۔

یہ تھا قاری صاحب کی تقریر کا اثر، کہ امیر شریعت جیسا بے مثال خطیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الغرض حضرت قاری صاحب مرحوم فن خطابت کے شہنشاہ تھے اور آخر دم تک اپنے فن خطابت سے دنیائے اسلام کو محظوظ فرماتے رہے، ساری عمر تبلیغ دین کی خدمت میں مصروف رہے، اس کے ساتھ ساتھ دار العلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، سچ یہ ہے کہ اب حضرت قاری صاحبؒ جیسا مہتمم دار العلوم کو ملنا مشکل ہے۔ (لولاک فیصل آباد)

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب رشیدی نور اللہ مرقدہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کے حسن بیان کو داد دیتے ہوتے لکھتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نسیم صبحگاہی محو خرام ناز ہو، وہ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کے انداز تکلم میں جوئے آب رواں کی نغمگی تھی جو فردوس گوش بن جاتی تھی، ان کے لب ولہجہ میں حدی خوانوں کا سوز اور ان کی گفتگو میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک تھی، جو دماغوں کو معطر کرتی اور دلوں کی دنیا میں ہلچل برپا کر دیتی، وہ ہماری عظمت رفتہ کی حسین وجمیل یادگار تھے۔ (الرشید ساہیوال)

علاوہ ازیں اور متعدد مواقع ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر وبیان کا موقع دیا، اور اہل علم آپ کے

ندرت بیان اور جودت فکر پر داد و تحسین دیتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جو اپنے وقت میں تحریر و تقریر کے لحاظ سے یکتائے زمانہ اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، کی زیر صدارت سرکاری عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں کونسل ہال لکھنؤ میں کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، حضرات علماء دیوبند بھی اس میں شریک ہوئے، جن کی قیادت حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرما رہے تھے

اس موقع پر آپ نے بیان فرمایا: مولانا آزاد مرحوم جیسے عظیم خطیب بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان سن کر جھوم اٹھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا وہ بیان آج بھی تاریخ خطابت کا زرین باب اور انمول شاہکار ہے۔

تعلیم جدید سے متاثر طبقہ آپ کے علم و حکمت سے بھرپور بیان کو بڑی وقعت و اہمیت کے لحاظ سے "سماع قبول" کے طور پر سنتا، اور اس طرح آپ کے حکیمانہ بیانات سے ان میں اسلام سے لگاؤ اور محبت و گرویدگی بڑھتی۔ علی گڑھ یونیورسٹی جو ہندوستان میں علم جدید کا مرکز اور منبع ہے، اور دارالعلوم دیوبند سے اس کو نظریاتی تقابل بھی رہا اس میں آپ نے بعض انتہائی بلند اور وقیع عنوانات پر تقاریر کیں، آپ کے بیان اور اسلوب بیان سے بڑے بڑے پروفیسرز انگشت بدنداں رہ گئے، اور ان میں یہ احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے، اور جسے ہم نے علم کا نام دے رکھا اس کی حقیقت کیا ہے۔

اعتراف حقیقت کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بعض تقاریر کو شائع چنانچہ جلد ششم میں بھی آپ کی ایک تقریر کو جو "سائنس اور اسلام" کے نام سے موسوم ہے، شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

مزید بھی ایسی تقاریر کی جستجو اور تلاش جاری ہے جو اپنے مواقع بیان کے لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل تھیں تاکہ انہیں خطبات حکیم الاسلام کی سلسلہ وار جلدوں میں ترتیب دیا جا سکے، اور دنیائے علم اس سے بھرپور استفادہ کر سکے۔ (وھو المستعان)

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا امتیاز خطابت یہاں بھی قائم رہا اس کے بارے میں "ذکر طیب" میں (سوانح حیات حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری) نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر پھر پاکستان تشریف لائے، حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا، اور اس میں دنیائے اسلام کی نامور علمی شخصیتوں کو دعوت دی گئی تھی، ہندوستان سے اس پروگرام میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی پاکستان تشریف لائے، پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل میں تاخیر کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ وزیر اعظم

پاکستان کی طرف سے دے گئے استقبالیہ اور سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس ہی میں شریک ہوسکے، جب کہ کانفرنس کا افتتاح حضرت حکیم الاسلام ہی کے عظیم الشان خطاب سے ہونا تھا حضرت حکیم الاسلام نے سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس سے خطاب فرمایا اور آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا۔

پاکستان نے جو یہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کی ہے میں پاکستان کو توجہ دلاتا ہوں کہ اس بین الملکی کانفرنس کے پیش نظر اتحاد باہمی کے جو مبارک اور خوش آئند اثرات ونتائج ہیں، ان میں اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ پڑوسی ممالک کا زیادہ حق ہے کہ ان کو اتحاد کے جذبہ سے پاکستان زیادہ سے زیادہ اپنے سے قریب کرے، اور ان پڑوسی ممالک میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہندوستان ہے۔

حضرت نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی ارشاد فرمایا کہ پاکستان نے عالمی اتحاد کے سلسلہ میں دو عظیم الشان اقدامات کئے ہیں، ایک سربراہ کانفرنس اور دوسری سیرت کانگریس جو عالمی اتحاد کا موجب ہوگی۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو کراچی میں منعقد کئے گئے سیرت کانگریس کے استقبالیہ میں جو شہر کراچی کی طرف سے دیا گیا تھا، انتظام کرنے والی سیرت کمیٹی نے حضرت حکیم الاسلام سے درخواست کی کہ وہ مہمانوں کا شکریہ ادا کریں۔ حضرت نے کلمات ترحیب وتشکر پیش کرتے ہوئے یہ دلچسپ بات ارشاد فرمائی کہ اس کانگریس کے مہمان خصوصی عرب ممالک کی مؤقر شخصیتیں ہیں، جن کی مہمانی کا شرف عجمیوں کو حاصل ہے، اور عجم ہونے کے رشتہ سے پاکستان اور ہندوستان دونوں برابر ہیں، اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک میزبان کی حیثیت سے ہندو پاکستان دونوں کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں اور عرب مہمانوں کے لئے سپاس گذار ہوں۔

سیرت کانگرس کے اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے حکیم الاسلام کو چاندی کے منقش خول میں جو ایک مخملی بکس کے اندر تھا ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا، جس میں دارالعلوم دیوبند کی اور حضرت کی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یوں تو تمام پاکستان ہی مہمانوں کا شکر گذار ہے، لیکن اہل پاکستان کو سب سے زیادہ دو شخصیتوں نے متاثر کیا ہے ایک حرم مکہ کے امام شیخ عبداللہ بن السبیل اور دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب شیخ الجامعہ دارالعلوم دیوبند۔

جب حضرت اقدس اس اختتامی اجلاس سے باہر تشریف لانے لگے تو عوام کے زبردست ہجوم نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ عوام حضرت حکیم الاسلام کی تقریر سننے آئے تھے، جس سے اب تک محروم رہے ہیں، اس لئے ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتے جب تک اس جلسہ میں حضرت ممدوح کی کوئی مفصل تقریر نہ ہو۔

چنانچہ قاری زاہر قاسمی صاحب نے لوگوں کو اطمینان دلایا اور جلسہ دوبارہ جمایا گیا اور ساٹھ ستر ہزار افراد کے ایک زبردست اجتماع میں حضرت کی تقریر ہوئی، جو ایک تاریخی اہمیت کی تقریر تھی۔

خطبات کی تین جلدیں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہی طبع ہو چکی تھیں، تاہم صرف اول، دوم جامعہ خیر المدارس ملتان کے مہتمم برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب زید مجدہم کی وساطت سے ہندوستان حضرت والا کی خدمت میں پہنچائی جاسکیں، انہوں نے میری طرف سے عرض کیا کہ ان خطبات کے بارے میں کچھ تحریر فرما دیجئے۔

ارشاد فرمایا: میں اپنی ہی تقریروں کے بارے میں خود ہی کیا لکھوں؟

تاہم بعد میں حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کی نیابت اہتمام کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے، سے خط لکھوا کر بھیجا، اس کا فوٹو شامل کتاب کیا جا رہا ہے، اس خط میں خصوصیت سے ''مقصد خطبات'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب زیدرت افضالکم!

سلام مسنون...... جناب کا گرامی نامہ اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں مشاء اللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح و درست ہے، کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کا مزاج اختلافی امور میں الجھنا نہیں بلکہ اتفاقی امور پر امت کو جمع کرنا ہے۔

حضرت والا جلدوں کی ترسیل کے لئے شکریہ ادا فرماتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ حق تعالیٰ ان تقریروں کو صاحب تقریر، مخاطبین، سامعین اور قارئین سب کیلئے نفع بخش بنائے، جزاکم اللہ، اس وقت حضرت والا سفر میں تشریف لے گئے ہیں، بطور رسید یہ عریضہ بیرنگ ارسال ہے کہ اس وقت ترسیل جواب کی یہ ہی ایک صورت سامنے ہے۔

امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔ (والسلام) خورشید عالم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب

سلام مسنون...... جناب گرامی نام اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں ماشاء اللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ تجم و درست پر کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلہ (غور طلب)

الحمد للہ! خطبات کی اشاعت ہندوستان میں بھی ہوئی، اور بڑے پیمانے پر اسے پذیرائی حاصل ہوئی، قارئین و ناظرین کرام سے بندہ کی خصوصیت سے التجاء واستدعاء ہے کہ اس کی قبولیت کے لئے بہت اہتمام سے دعاء فرما دیں تو ان کا مجھ پر احسان ہوگا کہ اصل چیز قبولیت ہے۔

قارئین خطبات کو یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ ساتویں جلد ترتیب کے آخری اور کتابت کے ابتدائی مراحل میں ہے، انشاء اللہ جلد منظر عام پر لانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

جلد ششم کی ترتیب کے سلسلہ میں اخی الکریم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہ جدہ (سعودیہ) کا

بہت زیادہ تعاون شامل حال رہا، ان کی جدوجہد سے کیسٹوں میں محفوظ یہ علمی سرمایہ حاصل ہوسکا، جو بعد میں کاغذ پر منتقل ہوا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت زیادہ جزائے خیر نصیب فرمائے، اور ہم سب کو قبولیت سے نوازے۔ آمین۔
اہل علم کی خدمت میں یہ استدعاء ہے کہ اگر اس مجموعے میں کوئی علمی غلطی نظر پڑے تو اسے بندۂ نابکار کی طرف نسبت کرتے ہوئے اطلاع فرمائیں تو احسان عظیم ہوگا۔ (تقبل اللہ منا ومنکم)

بندۂ نابکار: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

۲۷ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ / مطابق ۱۶ مارچ 1989ء

پیش لفظ جلد ہفتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین. امابعد...... خطبات حکیم الاسلام کے سلسلے کی ساتویں جلد بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے پیش نظر ہے، اس سلسلہ کی افادیت وقبولیت جو پردۂ غیب سے ظہور پذیر ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ مجھ ایسا بندۂ نابکار تو کم از کم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، ہر جلد کے اختتام پر نئی جلد کا مواد میسر نہیں ہوتا تھا، لیکن جب نئی جلد کی ترتیب کا کام شروع ہوا، مواد مہیا ہوتا جاتا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تکمیل کے مراحل آجاتے، فللہ الحمد، خطبات کے قارئین کرام جو اہل علم و فضل بھی ہیں اور علم دوست احباب بھی ان کی دعائیں بہت ہی زیادہ شامل حال رہیں۔

الحمدللہ! خطبات ومواعظ کے سلسلہ میں ان خطبات کو وہی مقام ملا جو خود صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہ کا ہے، پاکستان میں اس کی اشاعت کا سلسلہ روز افزوں ہے اور حال ہی میں ایک محترم دوست، جو کتابوں کی طباعت واشاعت کا بہت ذوق رکھنے والے ہیں، ہندوستان تشریف لے گئے تو ان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں چار کتب خانوں سے خطبات حکیم الاسلامؒ شائع ہورہی ہے، بایں ہمہ مانگ بڑھ رہی ہے۔ جس طرح یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے لئے ایک سلسلہ جاریہ ہے اور اس کا دینی فائدہ ان شاءاللہ ان کی ذات گرامی کو یقیناً پہنچ رہا ہوگا، اسی طرح مرتب خطبات کے لئے بھی یہ ایک بڑی دینی سعادت ہے اور امید ہے کہ آخرت میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر قبولیت کا معاملہ فرمائیں گے، جو دنیا میں ظاہر ہورہا ہے، دنیا میں قبولیت ظاہری اندازوں سے بڑھ کر ہوئی ہے تو آخرت میں دنیوی اندازوں سے بڑھ کر ہوگی، کیونکہ آخرت ہی درحقیقت فضل خداوندی کا مظہر ہے، اور دنیا تو اس کا پرتو اور نمونہ ہے۔ (وما ذلک علی اللہ بعزیز)

مواعظ طیبہ کے اس مجموعہ میں ایک اہم خطبہ ''اجلاس صد سالہ دارالعلوم (دیوبند) کا خطبۂ استقبالیہ'' ہے جو اس لحاظ سے خصوصی امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ دارالعلوم کی ایک مختصر تاریخ اور اس کے قیام کے اغراض ومقاصد، عوامل ومحرکات اور خدمات وکارکردگی کا ایک مختصر جائزہ بھی ہے۔

نیز اکابر علماء کرام اور صلحاء امت جو اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تقویٰ بھی ہوں کہ ایسے حساس بین الاقوامی اجتماع، جو قوموں کی تاریخ میں چشم فلک بار بار نہیں دیکھا کرتی، کے سامنے پڑھا گیا، اس خطبہ کا یہ امتیاز ہے، نہ صرف خطبات کے سارے مجموعہ میں یہ شرف امتیاز صرف اسی خطبۂ طیبہ کو حاصل ہے بلکہ خود حضرت حکیم

الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی نے زندگی میں لاکھوں کے اجتماع سے خطاب کیا ہوگا، مگر سامعین کا یہ اجتماع انفرادیت کا حامل تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام تر جلدوں میں موجود مواد کا بیشتر حصہ کیسٹوں سے لیا گیا ہے، اور کیسٹوں کو جمع کرنے میں جو جدو جہد اور انتھک کوشش برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب (حال مقیم جدہ، سعودیہ) مدظلہٗ نے خصوصی طور پر سرانجام دی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ ہے، اور یہ اس تعلق ومحبت کا مظہر ہے جو ان کو حضرات علماء دیوبند سے عموماً اور حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات ستودہ صفات سے خصوصاً ہے۔

اس سلسلے کے منظر عام پر آنے کے بعد دیگر احباب نے بھی کرم فرماتے ہوئے کیسٹز مہیا کیں، جن کا اجمالی طور پر تذکرۂ خیر وبرکت شامل اشاعت ہوتا رہا، افادات علم وحکمت کے نام سے آپ کے سامنے آنے والا علمی مواد بھی کیسٹز سے لیا گیا ہے، یہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی کراچی آمد کی یادگار ہے، اس کی تاریخ ومقام تو معلوم نہیں ہوسکا، تاہم ایک دورے کے موقع پر آپ نے چندروز پاکستان میں قیام فرمایا تو مغرب کے بعد مجلس کا اہتمام ہوتا، جس میں شہر کے اطراف واکناف سے علماء کرام اور علم دوست احباب شرکت فرماتے، کوئی صاحب سوال کرتے اور حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی وھبی خصوصیت کی بناء پر اس کے جواب میں علم وحکمت کے موتی بکھیرنا شروع فرمادیتے، چونکہ سوال کرنے والا شخص مجمع میں ہوتا تو اس کا سوال ریکارڈ نہیں ہوسکا دھیمی آواز میں کچھ نہ کچھ سنائی تو دیتا ہے مگر مکمل طور پر نہیں، اس لئے سوالات کا سلسلہ نہیں رکھا گیا بلکہ صرف وہ علمی جوابات جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے بیان فرمائے ان کو شامل کتاب کرلیا گیا، اور عنوانات قائم کردیئے گئے ہیں، جس کے بعد جواب سے مفہوم ہونے والا سوال ازخود متعین ہوجاتا ہے اور سوال کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، افادات علم وحکمت کا ایک معتدبہ حصہ خطبات کی ساتویں جلد میں شامل کیا جارہا ہے اس سلسلہ کا بقیہ حصہ ان شاء اللہ آٹھویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اگرچہ یہ مواعظ نہیں ہیں، جس کو خطبات کے سلسلہ میں منسلک کیا جائے، لیکن بوجوہ ان کو اس سلسلے میں داخل کرلیا گیا، اس سے اصل غرض تو یہ ہے کہ شائقین خطبات تک یہ تمام علوم بھی پہنچ جائیں، نئے نام سے کتاب مرتب کی جاتی تو تعارف کے بعد بھی شاید وہ افادیت سامنے نہ آتی جو اس طور پر معلوم ہوتی ہے۔ نیز بعض سوالات کے جوابات اتنے طویل ہیں کہ وہ بجائے خود ایک مستقل "خطبۂ طیبہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، علاوہ ازیں جوابات کا جو خاص اسلوب بیان ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی رعایت رکھتے ہوئے اسے اختیار کیا گیا ہے، اس لئے وہ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے جو تقریر وبیان میں بھی کارآمد ہے۔

بہر حال "افادات علم وحکمت" کے نام سے یہ تمام تر موجود مواد بھی مرتب شدہ صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ آپ قدر افزائی فرمائیں گے۔

بقیہ تقاریر حسب معمول جمع کر کے عنوانات قائم کردیئے گئے ہیں، اس وقت خطبات حکیم الاسلامؒ کی آٹھویں جلد زیر ترتیب ہے، اور تقریباً یکصد سے زائد صفحات کتابت بھی ہو چکے ہیں، کوشش یہی ہے کہ جلد ۸ مراحل تکمیل سے گذر کر جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، مگر اس میں آپ کے تعاون دعاء کی از حد ضرورت ہے، یہ جو کچھ ہے قارئین خطبات ہی کی دعاؤں کا مظہر ہے اور بس اللہ تبارک وتعالیٰ قبولیت کاملہ سے نوازے اور ان خطبات کو ہم سب کیلئے صلاح وفلاح اور خیر وبرکت کا باعث بنائے۔ (آمین ثم آمین) بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

والسلام: بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ / ۲۷، اکتوبر ۱۹۸۹ء / بروز جمعۃ المبارک

پیش لفظ جلد ہشتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین.

امابعد:

خطبات حکیم الاسلام کے سلسلہ کی آٹھویں جلد اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے، پہلی جلدوں کی نسبت اس جلد کو یہ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بہت سی وہ تقاریر آ گئی ہیں جو سیاسی مضامین پر مشتمل ہیں، سیاسی مسائل ہر دور کے جذباتی اور نفسیاتی طور پر احساس نزاکت کے حامل رہے ہیں، عام طور پر اس میدان میں کام کرتے ہوئے افراط وتفریط کے شکار ہونے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے، مثبت پہلو پر کام کرنے کے باوجود بعض اوقات فریق مخالف کی طعن وتشنیع سے صراط مستقیم پر قائم رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے، علماء کرام میدان سیاست میں آئیں تو بے شک سیاست دین کا اہم شعبہ ہے مگر اس میدان میں آنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علماء کرام کے مقام کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے بلکہ ایک گونہ اس میں اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔
اہل علم کی سیاست اور عوام الناس اور ان کے رہنماؤں کی سیاست اور طریق سیاست میں کھلا امتیاز اور بین فرق ضروری ہے۔

بعض اوقات احتجاجی جلسوں اور کانفرنسوں سے خطاب کرنا ہوتا ہے، جذبات سے مغلوب لوگون کے جذبات سے کھیل کر ان کو مزید اشتعال میں لانا اور بہرصورت فریق مخالف کو زیر کرنا یہ اہل علم کی شایان شان نہیں، اس لئے ایسے مواقع پر اہل علم کو اپنا امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے، حجت وبرہان اور قوت استدلال سے بات میں وزن پیدا کرنا عقل وفہم کا راستہ ہے جو ہر ذی شعور کا حق ہے اور یہی اہل علم کی شان ہے۔

یہ عرض کرنا بے جانہ ہوگا علماء کرام کے طبقہ سے ہٹ کر جو لوگ سیاست میں حصہ لیتے ہیں وہ اس میں مذہبیت کے عنصر کو غالب رکھنا تو درکنار اس کو خارج کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے اس میں جھوٹ فریب، غلط بیانی، وعدہ خلافی چالبازی، ڈپلومیسی اور قول وفعل کا تضاد روزمرہ کا عام معمول ہے، اس لئے قطع نظر اس کے کہ حق کیا ہے، اس کو دیکھنے کی بجائے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے ہیں وہ کہنا خواہ وہ ضمیر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو آج کی سیاست کا بنیادی اصول ہے۔

اس کے بالمقابل حاملین مذہب اولا یہ دیکھتے ہیں کہ حق کیا ہے بس اس کو کہنا ضروری خیال کرتے ہیں،

خواہ لوگ اس کو اچھا نہ سمجھیں، گویا ان کے پیشِ نظر حق تعالیٰ کی رضا ہے، عوام الناس کی رضا نہیں ہے، اس لئے اپنے علم ودانست کے مطابق جس کو وہ حق جانتے ہیں حق تعالیٰ کی مسؤلیت کے پاکیزہ جذبۂ خوف سے اسی کو کہتے ہیں، بالفاظ دیگر پانی کی رو کے ساتھ تیرنا بہت آسان ہے، مگر اس کے مخالف سمت تیرنا بہت مشکل ہے، لیکن اہل حق اور علم پر جب یہ ذمہ داری آئے تو وہ اس کو بھی بکمال شان نبھاتے ہیں۔

ملکوں کی تاریخ میں صدی نصف صدی کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی، ماضی قریب میں جمعیت علماء ہند نے سیاسی طور پر کس کردار کی پختگی کا اظہار کیا، آزادئ ہند سے قبل، تقسیم ہند اور آزادئ ہند و پاک کے ہنگاموں میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور مسلمانوں کی کس طرح راہنمائی کی ہے، اس کا اندازہ آپ ان خطبات صدارت اور اُن تقاریر سے کرسکیں گے جو حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے جمعیت علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ جلسوں میں ارشاد فرمائے۔

ان خطبات میں جہاں نظریات کی پختگی نظر آئے گی وہاں اہل علم کی سیاسی طور پر شان امتیاز، ان کی گفتگو، طرز تکلم، مسائل پر نظر، ان کے حل کا طریق کار اور اس سب کچھ کے ساتھ مذہبیت کا عنصر نمایاں نظر آئے گا۔

نیز انداز فکر اور پروگرام میں صرف اقتدار وحقوق سے متعلقہ سیاست ہی کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں سمجھا گیا، چنانچہ ان خطبات ومقالات میں آپ دیکھیں گے جہاں حکومت سے گفتگو ہے اور بہت سے مسائل میں اظہار مذمت اور غم وغصہ کا حکومت کو ہدف بنایا گیا وہاں عامۃ الناس کی معاشرت کی اصلاح اور ان کی اخلاق کی نگہداشت کا پروگرام بھی شامل ہے، برطانوی اور سیکولر حکومت کی موجودگی میں مسلمان بچوں کا تعلیمی مستقبل کیا ہوگا؟ ان کا ظاہر وباطن اسلام وایمان سے کیسے مانوس اور معمور ہو؟ وہ مذہب کو ایک حقیقت جان کر کیسے قبول کریں؟ اور اس پر کیسے قائم رہیں، ان تمام امور پر ان خطبات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

الغرض علماء کی سیاست میں جہاں دینوی معاملات سامنے ہوتے ہیں وہاں آخرت کی بہبود اور اس کا پروگرام بھی ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔

مذہب کی بنیاد پر ہی کی جانے والی سیاست سے مستحکم اور پائیدار قومی انقلاب آئے ہیں، ہمارے اکابر مذہب کی للّٰہیت کے ساتھ جہاں بھی گئے اپنے اثرات چھوڑ کر آئے، اور اگر خدانخواستہ مذہب کو سیاست سے خارج کردیا جائے تو کم از کم علماء ایسی سیاست سے بزد آزما ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ اپنے الفاظ میں ''مذہب کی سیاست میں کیا اہمیت ہے؟'' ذیل کے واقعہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال، دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر (۱۹۶۵) شروع ہون سے ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! مک کے

حالات بہت نازک اور خراب ہیں میں نے کہا جی ہاں، اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں، آپ ہیں سیاسی اور برسراقتدار انسان، آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ تو اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا۔ اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں، تو میں نے کہا سن لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے۔ دنیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ جلد نہم

حَامِدًاللّٰهِ الْعَظِيْم، وَمُصَلِّياً عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ امّا بعد.

سلسلۂ خطبات حکیم الاسلام کی نویں جلد اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ جو حضرت حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہ کے علوم وھبیہ کا ایک جدید وحسین مرقع ہے۔

الحمدللہ پہلی تمام جلدوں کو قبول عام نصیب ہوا اور اس قدر قلبی اشتیاق سے اظہار پسندیدگی کیا گیا جس کا حاشیۂ خیال میں بھی واہمہ نہ گزرا تھا۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی زندگی کا ایک طویل دور اہتمام دارالعلوم (دیوبند) کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں گزرا۔ اس لئے دارالعلوم کے امور ذمیہ کے سلسلہ میں سفر جزوزندگی رہا۔ آپ رحمہ اللہ نے نصف صدی سے زائد حصہ پر محیط اس سفر کو تبلیغی واصلاحی مقاصد، نیز دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے تعارف کا ذریعہ بنایا اور دنیا بھر کے گوشے گوشے میں جانا ہوا۔ ان اسفار میں ہونے والے ''خطبات ومواعظ'' کے قلمبند کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو آج ایک ''عظیم علمی ذخیرہ'' اکابر دارالعلوم کی تصانیف میں امتیازی مقام کا حامل ہوتا۔

اور شاید یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہو کہ وہ اپنی تعداد میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ''مواعظ اشرفیہ'' کے قریب قریب تو ضرور ہوتا، ماہنامہ دارالعلوم کی وہ فائلیں جس میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے اسفار کی ماہانہ تفصیل بحیثیت مہتمم دارالعلوم درج کی جاتی، اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔ تاہم اس حد تک کہنے کی اب بھی گنجائش ہے کہ اکابر دارالعلوم میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خطبات ومواعظ کے بعد اور کسی بزرگ کے خطبات اتنی تعداد میں مدون ہو کر منظر عام پر نہ آسکے جس قدر حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے ہیں۔

اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج کے حسی، مشاہداتی اور عقلی واستدلالی دور میں یہ خطبات اہل علم اور عامۃ الناس کے لئے یکساں مفید ثابت ہوئے۔ اہل علم اور خطباء کرام اس سے مواد لے کر بات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ اور عامۃ الناس ان کی سہولت وآسانی سے محظوظ ہوتے ہیں، بالخصوص آج کے دور میں اردو ادب کا ذوق آشنا طبقہ جہاں ان سے اپنے ادبی ذوق کی تسکین حاصل کر پاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن وفہم میں

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تعبیر و تفہیم کا خاص انداز کہ بڑے بڑے علوم کو آسان پیرائے میں سمجھا دیا گیا، بہت ہی مفید اور موثر ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے ''علوم قاسمیہ'' کو اردو ادب کا وہ جدید لباس پہنا دیا جو آج کے دور کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیا گیا ہو، اس لئے جب ان خطبات کو بیان کیا جاتا ہے تو سامعین کا قلب و دماغ ان کو اپیل کرتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بنا پر ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی پذیرائی میں مسلسل اضافہ ہے اور طلب مزید جاری ہے۔

اسی بنا پر مرتب نے اس بات کا بطور خاص اہتمام رکھا کہ جو تقریر یا کوئی علمی نکتہ جو حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی طرف منسوب ملا، اُسے جمع کر دیا گیا اور اہل علم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اسی اہم ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''افاداتِ علم و حکمت'' کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا۔

اسفار میں ہونے والی اصلاحی و تبلیغی تقاریر کے علاوہ خطبۂ جمعہ بھی آپ رحمہ اللہ کا معمول تھا۔ تقریر جمعہ کی وہ نوعیت نہ تھی جو آج کل بالخصوص ہمارے ملک میں رواج پذیر ہے۔ بلکہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد محض تقریر ہی سننے کے لئے دلی اشتیاق سے لوگ بیٹھتے اور آپ کا بیان ہوتا۔ بیان کی جاذبیت اور کشش کا یہ عالم ہوتا کہ اس میں دارالعلوم سے علماء صلحاء اور طلباء کرام کے علاوہ اہل شہر بھی بکثرت شرکت کرتے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ سابق اور جامعہ خیر المدارس ملتان شہر (پاکستان) کے صدر المدرسین جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے اس خطبۂ جمعہ کے متعلق تاثرات کا اس موقع پر اظہار فرمایا جب صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ، کا سانحۂ ارتحال پیش آیا اور جامعہ خیر المدارس ملتان میں اجلاس تعزیت منعقد ہوا۔

فرمایا کہ: دارالعلوم میں عام طور پر یہ معروف و مشہور تھا کہ حضرت اقدس خاتم المحدثین علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ کے ہاں علوم کا ورود ہوتا تھا کہ درس حدیث میں تمام علوم پر کمال دسترس اور بالغ نظری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک ہی درس میں گویا تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ کسی فن سے متعلق ذرا کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی تو غیر اختیاری طور پر بہتے ہی چلے گئے۔ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے ہاں معارف کا ورود وہبی طور پر ایسے مربوط انداز میں ہوتا کہ دعویٰ کے ثبوت میں دلیل اور استدلالی طرز میں تقریر کا منفرد انداز ایک عجیب سماں پیدا کر دیتا۔ سامعین ایسی محویت سے اسے قبول کرتے کہ ان کے عقلی اشکالات بھی مرتفع ہو جاتے۔ اور ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی محظوظ ہوتے۔

عام طور پر فلسفیانہ انداز تقریر سے سامعین طبیعت کا بار اور گرانی محسوس کرتے ہیں مگر یہاں روحانیت و عقلیت کا حسین امتزاج اس کو ایک روح پرور کیف و نشاط میں تبدیل کر دیتا۔ اسی لئے آپ کی تقریر سے لوگ ''تحیر معرفت کی دولت'' سے جھولیاں بھر کر جاتے۔

دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔اسی لئے اطراف عالم سے حصول علم کی غرض سے تشنگانِ علوم اپنی سیرابی کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور علومِ قرآن ونبوت سے سرفراز اور بامراد ہوکر دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے ممنونِ احسان ہوکر لوٹتے ہیں۔الغرض ایک عالَم کا عالِم اپنی تشنگی کا سامان کرتا ہے اور برابر کررہا ہے۔مگر یہ چشمۂ خودرو بفضلہٖ تعالیٰ روبہ ترقی ہے۔اور اہل علم یہاں خدمت خلق کی ایک لائق صد تحسین اور قابل ہزار تقلید ایسی مثال قائم کئے ہوئے ہیں جس کی نظیر عالَم میں ملنا مشکل ہے۔حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے طلب علم کی نیت سے آنے والوں کے لئے علمی خدمت کے علاوہ ان کی ضروریات سے متعلق انتظامی امور بھی سرانجام دیئے۔اور انسانی زندگی کا ایک طویل اور حسین وزریں باب رقم کیا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے ترجمان کی حیثیت سے عالم اسلام کے علاوہ امریکہ،افریقہ اور برطانیہ۔الغرض بلا امتیاز وتخصیص ملک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ''تبلیغ علوم'' کی عظیم خدمت کا فریضہ بھی آپ نے ادا کیا۔

آپ کے زیرنظر خطبات ایسے ہی مواقع کے ارشادات وفرمودات کی صدائے بازگشت ہیں جو قلم وقرطاس سے گزر کر اصلاح احوال کیلئے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔اور تعمیر مستقبل کے سلسلہ میں آنے والی نسل کے لئے ''ذخیرۂ علم وحکمت''۔

اللہ تعالیٰ خطبات کے اس سلسلۃ الذہب کو صاحب خطبات،مرتب ناکارہ اور جملہ قارئین کرام کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے صلاح وفلاح اور آخرت کے لئے ذریعہ نجات بنائے اور کامل قبولیت سے نوازے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

مطابق ۲،اکتوبر ۱۹۹۱ھ بروز بدھ

فیضی روڈ ملتان شہر،فون نمبر ۶۳۲۱۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ جلد دہم

حَامِدًاللّٰہِ الْعَظِیْم، وَمُصَلِّیاً عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ اما بعد.

خطبات حکیم الاسلام جلد دہم بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں میں ہے، تقاریر و مواعظ کے سلسلہ میں جو مواد میسر آ سکا وہ ہدیہ قارئین کرام کر دیا گیا۔ تاہم ابھی اس قدر منتشر مواد موجود ہے کہ ان کو جمع کیا جائے تو مزید کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مقدور بھر سعی و کاوش سے جو ہو سکا وہ پیش خدمت کر دیا گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس کرم سے سلسلۂ خطبات کو یہاں تک پہنچایا اللہ تعالیٰ اسی فضل سے قبول فرماتے ہوئے مزید مواد مہیا فرما دیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ مزید جلد بھی پیشِ خدمت کی جائے گی۔

جلد دہم میں شامل ایک اہم تقریر ''اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام'' دارالعلوم دیو بند کے کتب خانہ سے حاصل ہوئی جو تقاریر یا خطباتِ صدارت مطلوب تھے ان کے حصول کے لئے مہتمم دارالعلوم حضرت محترم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ حضرت والا نے کتب خانہ دارالعلوم میں ان کو تلاش کرایا۔ تو صرف یہی تقریر مل سکی۔ اس سلسلہ میں حضرت موصوف نے جو کاوش فرمائی اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذمہ داری کے جس منصب پر آپ ہیں، اس کے پیشِ نظر اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس کام کو سرانجام دینا محض للّٰہیت کے جذبے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس جذبے کا بدل شکریے کے کوئی رسمی الفاظ ادا نہیں کر سکتے، تاہم دعا مسنون اس کے لئے مکافاتِ احسان کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے۔

فجزاکم اللہ احسن الجزاء

اس سلسلہ کی تفصیل کچھ عرض کر دی جائے تو وہ جہاں اکابر کے علو ظرف اور ہمت عالی کا مظہر ہوگی وہاں ہم چھوٹوں کے لئے مشعل راہ اور لائق تقلید بھی ہوگی۔

جو تقاریر طلب کی گئی تھیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ جلسۂ احتجاج بسلسلہ آزادیٔ فلسطین۔ (بمبئی)

۲۔ جمعیت علماء دینی تعلیمی کانفرنس۔ (دہلی)

۳۔ دینی تعلیمی کانفرنس جمعیت العلماء سہارنپور (۱۳۸۰ھ)

۴۔ بچھرایوں ضلع مرادآباد کا اجلاس جمعیت العلماء صوبہ یو، پی

۵۔ جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی دو عظیم اجلاس ۱۳۶۳ھ و ۱۳۶۴ھ (۱۳۶۴ھ) کی یہ تقریر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے فراہم فرمائی۔)

۶۔ اسی طرح اس حدیث مسلم کی شرح جس میں فرمایا گیا:

جہنم سال میں دو مرتبہ سانس لیتی ہے جو ماہنامہ نقش دیو بند بابت ماہ جولائی، اگست، دسمبر ۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی جستجو جاری ہے۔

کاش! اگر یہ تمام تقاریر دستیاب ہو جاتی ہیں تو ایک جلد خطبات کی اور تیار ہو جائے۔ یہاں اس کو نقل کرنے سے مقصود بھی یہی ہے کہ اگر کسی صاحب علم کے پاس یہ مواد ہو یا کسی جگہ اس کی راہنمائی ہو سکتی ہو تو مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ اس کے حصول میں ہر ممکن سعی کی جائے گی اور اس کو قارئین خطبات کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

بہر حال دارالعلوم عریضہ ارسال کیا گیا، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی طرف سے جو جواب آیا اس کی نقل کتاب کی زینت بنادی گئی۔

اس سلسلہ میں بندہ نے لکھا کہ جو تقاریر دستیاب ہو جائیں اس کی فوٹو کاپی کر کے بذریعہ ڈاک بھیج دی جائے اور جو اس کا خرچ ہو اس سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ وہ ادا کر دیا جائے گا۔

چنانچہ ایک تو حضرت والا نے یہ زحمت اٹھائی کہ تقریر تلاش کے بعد بھجوائی اور اس سلسلہ میں تاخیر کی وجہ لکھی اور صفائی معاملات کے پیش نظر اس کا پورا خرچہ لکھ بھیجا۔

(حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا خط)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ جلد یازدہم

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَعْدُ!

خطبات حکیم الاسلامؒ کی گیارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے، بالخصوص اس لیے کہ اگر کوئی باصلاحیت نہ ہو، پھر اس سے کچھ ہو جائے، تو اس کے ذمہ شکر اور زیادہ ہو جاتا ہے...... بندہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کی ترتیب وتدوین کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، یہ جو کچھ ہے محض فضل خداوندی سے وجود میں آیا......

قارئین خطبات اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی شخصیت وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہے جسے حق تعالیٰ شانہٗ نے دارالعلوم دیوبند ایسی شہرہ آفاق علم وعمل اور کردار واخلاق کی یونیورسٹی کی مسند اہتمام پر فائز رکھا۔ آپ کا دور اہتمام ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ علمی لحاظ سے یہ کتنی بڑی خدمت اور سعادت ہے، اہل علم سے مخفی نہیں۔ بجا طور پر قلبی وجدانی کیفیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ

این سعادت بزور بازو نیست • تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثُمَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، احقر کو بعض اوقات یہ مسرت کے لمحات نصیب ہوتے رہتے ہیں، جب یہ سوچتا ہوں کہ خطبات حکیم الاسلامؒ کی ترتیب وتدوین جہاں حضرت حکیم الاسلامؒ کے علوم ومعارف کی خدمت ہے، وہاں یہ دارالعلوم دیوبند کی بھی خدمت ہے......اور حجۃ الاسلام آیت من آیات اللہ حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے معارف وحکم کا نسل نو کے لیے تعارف کا ذریعہ بھی ہے۔

الحمد للہ اس ناکارہ نے ان آنکھوں کو مسرور ہوتے ہوئے اور قلوب کو احساسِ شکر سے لبریز ہوتے ہوئے بارہا مشاہدہ کیا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فیض علم حاصل کیا اور ان حضرات کے دل میں ان خطبات کی قدر ومنزلت ہے اور بہت سے حضرات کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ خطبات حکیم الاسلامؒ کی وجہ سے عرصہ سے آپ سے اشتیاق ملاقات تھا نیز یہ کہ:

''خطبات حکیم الاسلام کی وجہ سے غائبانہ تعارف تو آپ سے پہلے ہی تھا۔ اب ملاقات بھی ہوگئی......ایسے حضرات کے اظہار محبت کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ ان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جا سکے......

بہت سے مقتدر دینی راہنما جو ملکوں ملک سفر پر رہتے ہیں اور خطاب و بیان سے ان کی زندگی عبارت ہے، نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ ہم نے فلاں ملک میں آپ کی خطبات دیکھی...... اور یہ بندہ نے بھی دیکھا کہ جلسۂ عام یا جمعہ کے خطبہ میں حضرات مقررین اس کتاب سے استفادہ کر کے تقریر کر رہے ہیں...... فَالْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ......

اخبارات میں ان کی تقریر انہی خطبات کے اسباب پر مشتمل ہوتی ہے، اہل علم کی ایک کثیر تعداد انہی خطبات سے علمی استفادہ کر رہی ہے اور اگلی جلد کی منتظر رہتی ہے.... گیارہویں جلد ایسے حضرات کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس میں الحمدللہ سورۂ ملک کی پوری تفسیر ہے جو عجیب و غریب علوم و معارف پر مشتمل ہے....

حضرتِ اقدس حکیم الاسلامؒ نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک قیام بمبئی میں فرمایا، تو روزانہ اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرماتے جسے بڑے اہتمام سے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا۔ بندہ کو یہ ریکارڈ شدہ مواد دوبئی سے برادر محترم مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب خانگڑھی نے حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کے تلمیذ رشید اور خاص ارادت مند حضرت محترم مولانا عبدالمتین صاحب منیری زید مجدھم سے حاصل کر کے بھیجا، جس پر بندہ تہ دل سے ان کا شکر گزار اور ممنون احسان ہے۔ الحمدللہ وہ تمام تر تفسیری مواد جلد نمبر ۱۱ میں مرتب ہو گیا۔

ازاں بعد احقر کے بہت ہی محب و مہربان رفیق حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب جدہ (سعودیہ) نے سورۂ قلم کی تفسیر پر مشتمل ۱۰ کیسٹس دیں، جو آج کل لکھی جا رہی ہیں، اس طرح بارہویں جلد اپنے مراحل آغاز میں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کو بہت جزائے خیر نصیب فرمائے اور علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کا پورا پورا اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کے لیے قبولیت کاملہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

نیز اس ناکارہ کے لیے جلد نمبر ۱۲ کی تکمیل آسان فرمائے۔ آمین۔ الحمدللہ خطبات کا یہ مجموعہ ہندوستان میں بھی شائع ہوا، اللہ تعالیٰ توفیق مزید سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

بندہ کو کراچی میں ہندوستان سے شائع شدہ ایک جلد ہاتھ لگی اور یہ دیکھ کر تعجب اور حیرت ہوئی کہ جس ادارہ نے اس کو شائع کیا، اس نے یہ انتہائی زیادتی کی کہ احقر کا لکھا ہوا پیش لفظ اھدا، انتساب، کلمات تحسین اور اپنے اساتذۂ کرام کی تقریظات، اور شروع کتاب سے تقریباً پچیس تیس صفحات انہوں نے غائب کر دیئے اور اپنی طرف سے نیا پیش لفظ کسی اور شخصیت کے نام انتساب یہ سب کچھ اپنی طرف سے لکھ کر کتاب کو شائع کر دیا۔ دینی کتب کا شائع کرنا جہاں ایک لحاظ سے دینی خدمت ہے وہاں کاروباری منفعت بھی ہے۔ ایسے حضرات سے گذارش ہے کہ آپ کتاب کی اشاعت کریں، مگر یہ صحیح نہیں کہ علمی طور پر کتاب میں قطع و برید کی جائے۔ یہ نہ صرف شرعی طور پر مستحسن نہیں بلکہ علم و ادب اور تصنیف و تالیف کی لائن میں کوئی اچھا تاثر نہیں۔ اگر آپ نے اشاعت کرنی ہی تھی تو کم از کم مرتب اور اس کے اساتذۂ کرام، نیز متعلقین کو تو قارئین کرام کی دعاؤں سے محروم نہ فرماتے......

ان حضرات کو جیسے اپنے اساتذۂ کرام سے تعلق خاطر ہے اور اپنے نسب کے لحاظ سے بڑوں سے محبت ہے

یہی حق دوسروں کے لیے بھی وہ تسلیم کرلیں تو اس میں ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہے..... لیکن جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا، دوسرے ملک میں رہتے ہوئے ان سے کوئی براہ راست گلہ شکوہ نہیں، تاہم وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرح کے طرزِ فکر سے عقیدت ومحبت کے شیش محل چکنا چور ہوجاتے ہیں..... کیا احقر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے لیے جوان خطبات میں علمی رہنمائی فرماتے رہے قارئین خطبات سے دعا چاہے..... اگر یہ حق صحیح ہے تو پھر خطبات سے ان کے تذکرے کو محو کردینا زیادتی نہیں؟........ اسی طرح جن اساتذہ کرام کے سامنے بیٹھ کر علم اور اہل علم سے شد بد نصیب ہوئی اگر ان کی طرف خطبات کی ترتیب وتدوین کا انتساب کر کے اپنے قلبی جذبات کی تسکین کی جائے یا ان کے کلماتِ تقریظ کو کتاب کی زینت بنایا جائے..... مگر کوئی بھی ادارہ اس کو ختم کر کے اپنی طرف سے یہ تأثر دے کہ گویا کتاب مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کردی گئی ہے اور اس کے ابتدائی احوال لکھ کر وہ اس کو سند اور حجت دے رہے ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہ ہو، تو یہ قرینِ انصاف نہیں ہے۔

اس لیے ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ممکن ہو تو خطبات کی ترتیب کے لیے مواد فراہم کر کے تعاون فرمائیں، جو ان کا منصب ہے، اگر تعاون نہیں فرماسکتے..... جیسا کہ اب تک انہوں نے نہیں کیا، تو کم از کم یہ زیادتی بھی نہ فرمائیں، خطبات کو شائع کرنا چاہیں تو بلا کم وکاست اور قطع وبرید کے شائع فرمائیں، امید ہے کہ وہ ان جذبات واحساسات کے اظہار کو محسوس نہ فرمائیں گے۔

جلد نمبر ۱۱ کے منظرِ عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ بندہ شعبۂ تحفیظ میں مدرس ہے ..... مگر ایک عرصہ سے ارادہ تھا کہ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے تو گذشتہ (۲) دوسال سے بندہ اس کوشش میں لگ گیا، چنانچہ دارالعلوم رحیمیہ ① کے نام سے ایک نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی، اس کے لیے قطعۂ ارض خرید کیا گیا۔

الحمد للہ اب دارالعلوم رحیمیہ کی بنیاد مضبوط ہوگئی، شعبہ کتب اور شعبہ تحفیظ دونوں اس میں قائم ہوگئے ہیں کسی بھی نو آغاز مدرسہ کے ابتدائی مراحل میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ انہی حضرات کے سامنے ہیں جو اس مرحلہ سے گزرتے ہیں گذشتہ (۲) برس کی اس مسلسل مشغولیت نے تحریری کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا..... لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ اس وقت دارالعلوم رحیمیہ میں شعبۂ کتب کے پانچ درجات قائم ہوگئے ہیں اور شعبہ کتب میں داخل ہونے والے تمام تر طلبہ حفاظ کرام ہیں، اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، ایک مربوط تعلیمی نظام قائم ہوگیا، تقریباً ۱۷ اساتذۂ کرام الحمد للہ دارالعلوم رحیمیہ اور اس کی شاخوں میں شب وروز طلبۂ کرام کی خدمت میں منہمک ہیں۔

حضرات قارئین کرام سے دلی التجا ہے کہ وہ اس نو آغاز دارالعلوم رحیمیہ کو اپنی دعاؤں میں خصوصیت سے یاد فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرات اکابر سے اسے ایک نسبت خاص عطا فرمائے اور مقام قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

خطبات کے قارئین کرام سے ایک انتہائی دردمندانہ گذارش ہے کہ احقر کے والد محترم حضرت اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، ۲۲ شوال المکرم ۱۴۱۶ھ کو وصال فرماگئے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ، خطبات کی

حسن ترتیب وتدوین میں جہاں ان کی دعائیں شامل حال رہیں وہاں ان کی علمی وعملی شفقتیں بھی ساتھ رہیں۔آج یہ سایۂ رحمت ہمارے پورے خاندان سے اٹھ گیا...قارئین خطبات سے ان کے علو درجات کے لیے دعاؤں کا خواہاں ہوں......امید ہے کہ وہ کرم فرمادیں گے۔

والسلام
قاری محمد ادریس
بانی ومدیر دارالعلوم رحیمیہ، چوک شاہ عباس
سورج کُنڈ روڈ، پیر کالونی نمبر ا ملتان شہر
فون نمبر: ۲۳۲۲۰۲
۲۳۱۷۴۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ دوازدہم

حَامِدًا لِلّٰہِ الْعَظِیْمِ وَمُصَلِّیًا عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَ بَعْدُ!

خطبات حکیم الاسلام کے سلسلہ کی جلد نمبر ۱۲ آپ کے ہاتھوں میں ہے ان خطبات ومواعظ کی ترتیب و تدوین کے ابتدائی مرحلہ میں حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ گذری تھی کہ یہ سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ اتنا طویل ہو جائیگا۔ چونکہ فضلِ خداوندی کے متوجہ ہونے کیلئے دلیل اور قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس حق جل واعلیٰ کی کرم فرمائی کا یہ مشاہدہ وظہور ہے کہ وہ ہر ناممکن العمل کو اپنے ارادۂ مبارک سے ممکن فرما سکتے ہیں۔ جوں ہی خطبات دستیاب ہوتے رہے ان کو سلسلہ میں پرویا جاتا رہا، موضوعاتی ترتیب کو ملحوظ رکھنا اسی لئے مشکل تھا۔ گویا جمع شدہ مواعظ کی یہ ترتیب نہیں ہے بلکہ ہر میسر آنے والے خطبہ کو زیر ترتیب جلد میں پیش کر دیا گیا اور جلدوں کا نمبرات سے تعارف ہوتا رہا۔ جلد نمبر ۱۲ میں الحمدللہ سورہ قلم پ ۲۹ کی مکمل تفسیر ہے۔ احقر کی معلومات کی حد تک اس سُورۃ کے تمام مضامین پہلی مرتبہ منصۂ شہود پر آ رہے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام نَـوَّرَ اللّٰـہُ مَـرْقَـدَہٗ کی تمام مطبوعات بحمداللہ بندہ کے پاس موجود ہیں۔ بندہ کے ناقص علم کے مطابق اس سُورۃ کی تفسیر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے لبریز خصوصیات کے ساتھ پہلے نگاہ سے نہیں گذری۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے اسے مزید اشتیاق ومحبت سے پڑھیں گے۔

بارہویں جلد کے سلسلے میں برادر محترم جناب مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم نے کرم فرمایا کہ جامعہ خیر المدارس کے بارے میں حضرتِ اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے جو مشاہدات وتاثرات وقتاً فوقتاً اپنی آمد کے بعد کتابُ الرّائے میں لکھے وہ سب عطا فرما دیئے، جو بارہویں جلد کی زینت بن رہے ہیں۔ یہ تاثرات ان دو بزرگ اور زیرک تاریخی شخصیات کے باہمی تعلق اور دو اداروں کے سربراہوں کی اس رفاقت کا تذکرہ ہے جو علومِ نبوّت کی درسگاہوں کے ذمہ دار ہیں۔ میری مُراد دارالعلوم دیوبند اور جامعہ خیر المدارس ہے۔ اس میں خیر المدراس کی عہد بہ عہد ترقی کی منازل طے کرنے کا تدریجی تذکرہ ہے۔ بے شک یہ تاثرات خاص خیر المدارس کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے قلمبند فرمائے، تاہم منظر عام پر آنے سے اس کی افادیت مزید ہوگئی۔ حضرت مہتمم جامعہ زید مجدہم نے ''کرم بر کرم'' یہ فرمایا کہ ممتاز خطیب کے عنوان سے خطبات کی جلد ۱۲ کے

لئے ایک وقیع تحریر سپردِ قلم فرمائی جس میں صاحب، اور مرتبِ خطبات سے متعلق تذکرہ خیر و برکت فرمایا۔ ناکارہ مرتب ان کی اس کرم فرمائی کا دل و جان سے شکر گزار و ممنون احسان ہے۔

اسی طرح میرے عظیم محسن اور مخلص بھائی حضرت مولانا ابو انس عطاء اللہ بخاری زید مجدہم نے ''علم و حکمت کی کہکشاں'' کے عنوان سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہمہ پہلو شخصیت پر مختصر انداز میں بہت ہی جامع، وقیع اور دلآویز تحریر ارسال فرمائی جو زینتِ کتاب ہے۔ اسی طرح دیرینہ رفیق و کرم فرما برادر محترم حضرت مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم نے سورۂ قلم کی خصوصیات کے سلسلے میں جلد ۱۲ کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

یہ ناکارہ ان ہر دو حضرات کا تہہ دل سے سپاس گذار اور دعاء گو ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ دارین میں اس کی بہتر سے بہتر ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ اس ناکارہ کو حضرت شہید اسلام، حضرت اقدس لدھیانویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ماموں کانجن کے ابتدائی دورِ تدریس میں احقر نے بالخصوص علم صَرف حضرتِ شہیدؒ سے حاصل کیا اور ان کے ماہرانہ طرزِ تدریس کی وجہ سے نہایت سہل الحصول انداز میں پڑھا۔ پھر جب حضرت شہیدؒ عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت سے وابستہ ہوئے اور ملتان دفتر میں قیام تھا تو گاہے گاہے یہ ناکارہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔

خطبات کی ترتیب و تدوین کے اس دور میں جب تین جلدیں منظر عام پر آئیں تو حضرت حکیم الاسلامؒ کے وصال کا سانحہ پیش آیا۔ آپ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات کے سلسلہ میں جو شذرہ ''بینات'' کراچی کے لئے لکھا تو اسی ذیل میں یہ چند کلمات بھی تحریر فرمائے۔ ''حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ (خطیب مسجد غفوریہ پروانہ کالونی ملتان) نے حضرتؒ کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلامؒ'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں۔ اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرتؒ کی جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئیں وہ سب شائع کر دی گئیں تو اُمت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو جائے گا'' (مقالات یوسفی (۱۶۔۲۱۵) الحمد للہ! حضرت اقدسؒ کی حسبِ خواہش حق تعالیٰ شانہٗ نے فضل فرمایا کہ بارہویں جلد منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ اور جلد ۱۳ کی ابتدا کی جا رہی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت شہید اسلامؒ اور دیگر قارئین کرام کی دعاؤں کی وجہ سے فضل و کرم کا معاملہ فرمائے اور سابقہ جلدوں کو قبول فرما کر نئی آنے والی جلد کے لئے آسانی فرمائے۔ (آمین)

مرتب ناکارہ

قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

جمعۃ المبارک ۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

خادم دار العلوم رحیمیہ ملتان

محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ" أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا......إِلٰى قَوْلِهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾"[1]

بزرگانِ محترم! یہ جلسہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منعقد کیا گیا ہے۔ گویا اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کیا جائے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کا ذکر عینِ عبادت ہے اور اللہ کے نزدیک بڑی بھاری طاعت اور قربت ہے اور سارے کمالات و برکات کا سرچشمہ ہے اس لئے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ایک نعمت ہے جو مسلمانوں کو عطا کی گئی۔ تو میں اس وقت میلادِ نبوی ہی کے بارے میں چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں گذارش کروں گا اور اسی مناسبت سے یہ چند آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، جو آپ کے سامنے ابھی پڑھی گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میلاد کے سلسلے میں...... آپ بھی چونکہ ولادت کا ذکر سننے کے لئے آئے ہیں، ولادت کا ذکر بھی کروں لیکن میں ایک ولادت کی بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو ولادتوں کا ذکر کروں گا۔

ولادتِ نبوی جسمانی اور روحانی...... ممکن ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ ولادت تو ایک ہی ہوتی ہے، پیدائش ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے تو دو ولادتیں کیسی؟ لیکن میری گزارشات کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقتاً نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو ہی ولادتیں ہوئیں۔ ایک ولادت باسعادت تو ۱۲ یا ۸ ربیع الاول کو علےٰ اختلاف الاقوال ہوئی اور ایک ولادت حضور کی چالیس برس کے بعد ہوئی، یعنی روحانی ولادت...... جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ ۱۲ ربیع الاول کو ولادتِ جسمانی ہوئی اور چالیس برس بعد

[1] پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰-۴۸۔

ولادتِ روحانی ہوئی جس کو ہم نبوت سے تعبیر کریں گے۔

۱۲ ربیع الاول کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال دنیا میں ظاہر ہوا اور چالیس برس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہوا۔ تو ایک جمال کی حیثیت سے ولادت ہے اور ایک کمال کی حیثیت سے ولادت ہے۔ دونوں ولادتوں میں ہمارے لئے ان کا ذکر عینِ عبادت اور طاعت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں جمال ظاہر ہونا یہ بھی عالم کیلئے عظیم ترین نعمت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہونا یہ اس سے بھی بڑی نعمت ہے جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی ہے تو جمال محمدی وہ بھی ایک ایسی امتیازی شان ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا جمیل اور صاحب جمال پیدا نہیں ہوا جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمال والے تھے اور اتنا بڑا با کمال بھی کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ کمال والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ تو دونوں ولادتیں امتیازی شان رکھتی ہیں، نہ ولادتِ جسمانی کی نظیر ہے اور نہ ولادتِ روحانی کی نظیر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو ہمارے سامنے ظہور ہوا محمد بن عبداللہ کا اور چالیس برس کے بعد ظہور ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ اُس وقت آپ ابن عبداللہ کی حیثیت سے دنیا میں آئے اور چالیس برس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔

ولادتِ روحانی کے بارے میں عامۃ الناس کا طرزِ عمل...... عام طور سے لوگ ولادتِ جسمانی کو اہمیت دیتے ہیں اور اسی ولادت کے ذکر کو ''ذکرِ میلاد'' کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ذکر میلاد کا ابتدائی درجہ ہے۔ حقیقی درجہ وہ ولادت ہے جو چالیس برس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ پہلی ولادت میں ہمارے لئے عمل کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور دوسری ولادت میں ہمارے لئے عمل کے نمونے موجود ہیں جس سے ہم سعادت حاصل کر سکتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی ولادت جمال کی ہوئی کہ چہرہ مبارک ایسا تھا، انگلیاں ایسی تھیں، بال ایسے تھے، خونچیں ایسی تھیں، بدن اور قد وقامت یہ تھا۔ اس میں ہمارے لئے کوئی نمونہ عمل نہیں ہے۔ خوشی کی تو انتہائی چیز ہے کہ ہمارے پیغمبر کو اللہ نے وہ جمال اور موزونیت عطا فرمائی کہ عالم میں ایسا حسن و جمال کسی کو نہیں دیا گیا۔ خوشی اور فخر کا موقع ہے لیکن عمل کا نمونہ کچھ نہیں...... یہ نہیں ہے کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ تھے ہم ویسے ہاتھ بنالیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ مبارک تھا ہم اپنا رنگ ویسا کرلیں۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قد وقامت تھا ویسا ہم اپنا قد وقامت بنالیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہمارے لئے نہیں ہے خوشی کا موقع ضرور ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے جب آپ ظاہر ہوئے اس میں سامنے یہ چیز ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان ایسا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ یہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ تھا، نماز ایسی، روزہ ایسا، حج ایسا اور جہاد ایسا تھا...... اس میں ہمارے لئے نمونہ عمل ہے، جیسی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہم بھی ویسی نماز پڑھیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے رکھے ہم بھی ویسے روزے رکھیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کیا ہم بھی ویسا ہی حج کریں، جس طرح

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو معاشرت تھی ہم بھی ویسی ہی معاشرت بنائیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جماعتی زندگی تھی ہم بھی ویسی ہی زندگی بنائیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہے میرے خیال میں یہ جو پہلی ولادت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے یہ اس لئے ہے کہ اس میں کرنا کرانا کچھ نہیں پڑتا کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، خوش ہو لیے یا زیادہ سے زیادہ خوش ہو کے مٹھائی بانٹ لی اور خود ہی کھا بھی لی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ولادتِ روحانی ہی اصل مقصود ہے...... اور دوسری ولادت سن کر ذمہ داریاں بڑھتی ہیں کہ ہمیں مسلمان بننا پڑے گا، ہمیں یہ کام یوں کرنا پڑے گا، زندگی کا نمونہ ایسا بنانا پڑے گا۔ عمل کرنا لوگ نہیں چاہتے، اس لئے دوسری ولادت کا تذکرہ نہیں کرتے اور اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور پہلی ولادت میں عمل کا نمونہ نہیں خوشی خوشی کا موقع ہے اس لئے اس کو زیادہ اختیار کرتے ہیں، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے یہ ذکر عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں آئے ایسے ہی اس کا ذکر بھی عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح نماز پڑھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح حج کیا، حضور نے اس طرح جہاد کیا، بلکہ یہ اس سے بھی بڑی عبادت ہے۔ اس میں ہمارے لئے سعادت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ جبکہ اُس میں محض خوش ہونے کا موقع ہے۔ مگر بہر حال یوں تو دونوں ولادتوں کا ذکر ہمارے حق میں عبادت ہے اگر چہ پہلی ولادت مقدمہ ہے اور دوسری ولادت مقصود ہے کیونکہ اگلا مقصود ظاہر کرنا تھا اس لئے ولادتِ جسمانی سامنے رکھی گئی تا کہ ولادتِ روحانی کا موقع آ جائے تو پہلی ولادت تمہید اور دوسری ولادت اصل مقصود ہے۔ رسالت و نبوت کو دنیا میں لانا تھا اس لئے ذاتِ اقدس کو پیدا کیا گیا مگر تمہید ہو یا مقصد ہو، ہے دونوں کا ذکر طاعت اور عبادت۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا ذکر میں دونوں قسم کی ولادتوں کا کروں گا۔

جمالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... تو میں نے عرض کیا کہ پہلی ولادت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال ظاہر ہوا۔ جسم مُبارک ایسا تھا، رنگ ایسا تھا، قد و قامت ایسا تھا، چال ڈھال ایسی تھی۔ یہ بھی امتیازی چیز تھی کہ پورے عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں: ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، سُرخ حُلّہ پہنے ہوئے، سرخ چادر اور سرخ ہی لنگی۔ لیکن محدثین اور شراحِ حدیث اس کی تفصیل کرتے ہیں کہ وہ ساری سرخ نہیں تھیں، سرخ اس لئے کہا گیا کہ اس پر دھاریاں سرخ پڑی ہوئی تھیں جبکہ کپڑا سفید تھا، سفید زمین کے کپڑے میں سرخ دھاریاں تھیں۔ یمن سے چادریں آیا کرتی تھیں بعض سیاہ دھاریوں کی، بعض سرخ دھاریوں کی، بعض سبز دھاریوں کی۔ تو اس دن یمن سے سرخ دھاری کی کوئی چادر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی پہنے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا، چاندنی کھل رہی تھی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا کبھی چہرۂ مبارک کو اور کہتا تھا کہ ان میں کون زیادہ حسین ہے؟ آخر مجھے فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ چاند میں وہ

حسن و جمال نہیں جو چہرۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر حسن و جمال ہے اس لئے چاند سے ہٹ کر میری نگاہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر جم جاتی تھیں۔ ① اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیسی صورتِ زیبا دیکھی تھی۔

صحابہؓ کی عادت مبالغہ کی نہیں تھی۔ صحابہ کرام سے زیادہ سچا اس عالم میں دوسرا نہیں پیدا ہوا۔ اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ اس امت میں جو بھی بڑے سے بڑا قطب، غوث اور ابدال پیدا ہوا وہ صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ سب کے سب متقی، عدول، پاکباز اور پارسا ہیں، ان سے بڑھ کر مقدس طبقہ اس امت میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ قرآن وحدیث نے جس طبقے کی برگزیدگی کی شہادت دی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے، اس لئے ان کے ہاں شاعریت نہیں تھی، مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ جو کچھ کہتے تھے اپنے اللہ کو سامنے رکھ کر حقیقت کہتے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کوئی شاعری اور مبالغہ نہیں کیا بلکہ اصل حقیقت بیان کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسی پاک صورت پہلے کبھی دیکھی نہ آئندہ دیکھیں گے۔ ② یہ کوئی مبالغہ یا شاعری نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے اور اس کے متعلق صحابہ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ عشاقِ رسول محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا تھے اور جو فانی ہو محبت میں وہ تو کہا ہی کرتا ہے، وہ اچھی چیز ہی کہے گا، وہ تو محبت ہی کی بات کرے گا، تعریف ہی کی کہے گا لیکن قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت موجود ہے۔ جب اللہ کے کلام سے کوئی چیز اخذ کی جائے تو قرآن ذمہ دار بن جاتا ہے، پھر اس میں شاعریت کا کوئی شائبہ یا شوشہ باقی نہیں رہتا تو قرآن کریم میں بھی اس کا مآخذ موجود ہے اور سمجھنے والے اس کے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تو پہلے میں قرآن کا واقعہ بیان کردوں اور پھر اس واقعہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو اخذ کیا ہے اس کو عرض کروں گا۔

حسن یوسف علیہ السلام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ حسین دنیا میں گذرے ہیں۔ اور خود فرمایا حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب اللہ نے حسن و جمال پیدا کیا تو آدھا حُسن ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ ③ تو حسن و جمال میں کوئی شک نہیں، جب حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو اس سے بڑھ کر شہادت نہیں ہو سکتی کہ یوسف علیہ السلام سے زیادہ کوئی حسین نہیں، حُسن ان کا اُونچا تھا، ان پر زلیخا عاشق ہوئی ہیں، جو بادشاہِ مصر کی بیوی تھیں اور صرف زلیخا ہی عاشق نہیں تھیں بلکہ مصر کی تمام بیگمات اپنے دلوں کو یوسف علیہ السلام کے عشق میں کھوئی ہوئی تھیں لیکن زلیخا نے چونکہ انہیں خریدا تھا اور کنعان کے قافلے نے آ کے زلیخا کے ہاتھ انہیں بیچ دیا تھا اس لئے یوسف علیہ

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی الرخصة فی لبس الحمر للرجال ج: ۱۰ ص: ۶.

② الشمائل المحمدیة للترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ ج: ۱ ص: ۷.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص: ۷۰۵ رقم: ۴۱۱.

السلام گویا زلیخا کے مملوک تھے، دوسری طرف جانہیں سکتے تھے تو بیگماتِ مصر لاکھ عشق کریں مگر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں تو انہوں نے ایک ڈھنگ اختیار کیا کہ زلیخا پر طعنے کسنے شروع کئے، کہ دیکھو زلیخا کیسے تھوڑے دل کی عورت ہے جو اپنے غلام پہ عاشق ہوگئی ہے، اسے شرم نہیں آتی، بادشاہ کی بیگم ہے اور غلام پر عاشق؟ یہ طعنے دینے کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ زلیخا کا دل اتر جائے اور کسی طرح یوسف علیہ السلام کو ہم قبضا ئیں...... زلیخا اس سے ہٹ جائے تو اس پر ہم قابض ہوں، تو یہ مقصد تھا طعنے دینے کا۔ زلیخا بھی سمجھ گئی اور روز روز کے طعنے سُنتے سُنتے تنگ آ گئی، آخر اس نے ایک دن ارادہ کیا کہ میں ایک دفعہ ان سارے طعنوں کا جواب دے دوں تو اس نے بیگماتِ مصر کو چائے کی پارٹی دی۔ چائے کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ کھانے کے سوا جو پارٹی ہوتی ہے چائے کی کہلاتی ہے، چاہے اس زمانے میں چائے ہو یا نہ ہو، مگر بہرحال وہ پارٹی تھی، کھانے کی نہ تھی، بلکہ وہ تفریحی پارٹی تھی اور کچھ تقلہ کی چیزیں اس میں رکھی گئی تھیں، پھل فروٹ وغیرہ بہتر سے بہتر چنے گئے تھے، بہرحال ملکہ تھیں بادشاہ کی بیگم تھیں تو اس کے ہاں کیا کمی تھی! بڑا دسترخوان سجایا، پھل، فروٹ، مٹھائیاں اور جو اس زمانے کے تکلفات تھے سب رکھے گئے۔ پھل کاٹنے کے لئے چھریاں رکھی گئیں اور بیگماتِ مصر کو دعوت دی گئی، تمام وزراء زادیاں، امیرزادیاں اور انکی بیگمات آئیں اور خوب اپنا اپنا بناؤ سنگھار کر کے عمدہ لباس اور زیورات پہن کر آئیں۔ مقصد یہ تھا کہ شاید یوسف کی نظر پڑ جائے، مجھے ہی پسند کر لے، ہر بیگم یہ چاہتی تھی تو انتہائی آراستہ پیراستہ ہو کر بہترین زیورات اور لباس پہن کر جمع ہوئیں۔ دسترخوان سجایا گیا، جب زلیخا نے دسترخوان پر سب کو بٹھلایا تو یوسف علیہ السلام کو ایک کمرے میں چھپا دیا اور کہا جب میں کہوں تو باہر آئیں پہلے باہر نہ آئیں۔ یوسف علیہ السلام اندر بیٹھ گئے۔ خیر بیگماتِ مصر بیٹھیں، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا کہ: ﴿ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ﴾ ① بیگماتِ مصر نے زلیخا کو طعنے دینے شروع کئے کہ اپنے غلام پر عاشق ہوگئی، شرم آنی چاہئے ﴿ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرٰهَا فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴾ ② ہم تو اسے گمراہ سمجھتے ہیں بھلا غلام پر بھی عاشق ہونے کے کوئی معنی ہیں! ﴿ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ ﴾ ③ جب زلیخا نے پہچان لیا کہ طعنہ دینا محض اس لئے ہے کہ میرا دل اتر جائے یوسف سے اور یہ یوسف پہ قابو پالیں ﴿ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً ﴾ ④ تو دسترخوان تیار کیا، پھل فروٹ سجائے ﴿ وَاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا ﴾ ⑤ ہر ایک کے سامنے ایک ایک چھری رکھ دی کہ پھل کاٹیے اور کھائیے۔ جب انہوں نے چھریاں ہاتھ میں لیں اور پھلوں کو تراشنا شروع کیا۔ ایک دم یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ باہر آ جائیں۔ یوسف علیہ السلام باہر آئے، ان کا حسن و جمال دیکھنا تھا کہ بیگمات اتنی مبہوت ہوئیں کہ آپے سے باہر ہوگئیں، بجائے پھل کاٹنے کے کسی نے انگلی کاٹ لی، کسی نے خونچہ کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا، سب لہولہان ہوگئیں اور یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھ کر انہیں اپنے آپ کا ہوش نہ رہا۔ جب

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۰. ② ایضا ③ ایضاً، الآیۃ: ۳۱. ④ ایضا ⑤ ایضاً.

یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بہت بھاری اور بڑا سمجھا اور ہوش وحواس کھو بیٹھیں اور ہاتھ کاٹ ڈالے ﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ① اور کہا کہ واللہ یہ بشر نہیں، کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اترا ہے۔ یہ حسن و جمال بشر میں کہاں ہے! یہ خوبصورتی، یہ نزاکت، یہ قدِ رعنا اور یہ زیبائش!!! یہ کہاں بشر ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی فرشتہ ہے۔ جب تعریف میں رطب اللسان ہوئیں تو زلیخا نے کہا: یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیا کرتی تھیں، میں نے تو نہ کبھی انگلی کاٹی اور نہ ہاتھ کاٹا، تم کو کیا مصیبت آئی کہ تم نے انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ میرے ساتھ روز یوسف ہیں مگر میں اپنے آپے میں ہوں، تم نے ایک نظر دیکھا اور آپے سے باہر نکل گئیں۔ تو جب تمہاری یہ حالت ہے اگر میری یہ حالت ہوگئی ہے تو طعنے کی کونسی بات ہے؟ تمہیں طعنے دینے پر شرم آنی چاہیے کہ میں غلام پر عاشق ہوگئی، پھر تم کیوں عاشق ہوئیں؟ تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ اب بے چاری بیگمات چپ ہوگئیں، اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں، پھر کسی کی زبانِ طعن و تشنیع نہیں کھلی، زلیخا چھوٹ گئیں اور ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ہوگیا۔ یہ تو وہ واقعہ بیان ہوا جو قرآن کریم نے یوسف علیہ السلام کے حسن کے بارے میں بیان کیا۔

حسن یوسف علیہ السلام پر جمالِ محمدی علیہ السلام کا تفوق...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیا فرماتی ہیں؟ مجھے وہ سنانا ہے، مذکورہ واقعہ تو اس کے لئے تمہید تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تھا تو ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر میرے محبوب کو دیکھتیں تو دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں، یہ گویا صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرق بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال سے زیادہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث میں فرمایا کہ آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا اور آدھا یوسف علیہ السلام کو، تو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ساری دنیا کے مجموعے کو حسن دیا گیا اتنا تنہا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حسن دیا گیا اور یوں وہ یوسف علیہ السلام سے بھی بڑھ کر ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کہاوت صحیح ہے کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو انگلیاں کاٹ ڈالیں، میرے محبوب کو دیکھ پاتیں تو دل صحیح سالم نہ رہتے بلکہ دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ اس سے جمالِ محمدی کا اندازہ ہوا۔ یوسف علیہ السلام کے بارے میں ''حسن'' کا لفظ استعمال کیا ''فَاِذَا قَدْ اُعْطِيَ شَطْرُ الْحُسْنِ'' ② آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا (اور آدھا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ''جمال'' کا لفظ استعمال کیا گیا، جمال برتر ہوتا ہے حسن پر۔ حسن کہتے ہیں قد و قامت کی موزونیت کو کہ ہر عضو اور ہر جوڑ بند اپنی جگہ اتنا مکمل ہو کہ نگاہیں نہ پھریں، وہاں سے ہٹنے نہ پائیں، وہ حسن نظروں پر مجموعی طور پر قابو پالے۔ تو حسن کہتے ہیں رنگ کی سفیدی اور ظاہری نقشے کے اچھے ہونے کو اور جمال کہتے ہیں مجموعۂ قد کے تناسب کو، اعضاء

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص: ۷۰۵ رقم: ۴۱۱.

کے جوڑ بند کے درست ہونے کو اور اپنی اپنی جگہ موزوں ہونے کو، انگلی دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ناک دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ہر ہر عضو اتنا موزوں، اتنا کامل کہ اس سے آگے کمال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں جمال۔ تو جمال فائق ہے حسن کے اوپر، بڑھا ہوا ہے حسن سے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے جمیل کا لفظ بولا گیا، حسین کا لفظ نہیں بولا گیا "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ خود بھی جمیل ہے جمال والے کو پسند بھی کرتا ہے۔ ① یہ نہیں کہا گیا کہ "اِنَّ اللّٰہَ حَسِیْنٌ یُّحِبُّ الْحُسْنَ" اللہ حسن والا ہے حسن والے کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ حسن کہتے ہیں حسن صورت کو اور جمال کہتے ہیں جمالِ ذات کو کہ ذات بالکل موزوں اور مناسب ہے اور حسن کے معنی صورت اور اچھا رنگ ہیں۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمال دیا گیا تھا، اس لئے احادیث میں جہاں آپ کے جمال کا ذکر ہے تو ان میں آپ کے ایک ایک عضو کی تعریف ہے، بال ایسے تھے، دندان مبارک ایسے تھے جیسے موتی پروئے ہوئے ہوں، بال نہ بالکل لٹکے ہوئے نہ بالکل خمیدہ، کچھ لٹکے ہوئے کچھ گھنگھریالے، تو لٹکے ہوئے بھی اور چھلے دار بھی۔ بالکل لٹکے ہوئے بال ہوں تو یہ حسن نہیں سمجھا گیا، اور بالکل لٹکے ہوئے نہ ہوں بلکہ چھلے چھلے پڑے ہوئے ہوں تو یہ بھی حسن نہیں سمجھا گیا۔ گھنگھریالے بھی ہوں اور پھر کچھ لٹکے ہوئے بھی ہوں کہ دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو اسے جمال کہتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لینے کے لئے آپ نے دست مبارک دراز فرمایا، چادر مبارک اتر گئی اور بغلیں کھلیں تو فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چاندی کی کوئی شفاف چیز رکھی ہوئی ہو کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ② گردن کے متعلق تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے عاج کی ہو یعنی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہو، اس قدر صاف اور ستھرا اس کا رنگ تھا۔ تو جس چیز پر نگاہ پڑ جاتی تھی نگاہ ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بہر حال احادیث میں آپ کا سراپا ذکر کیا گیا ہے اور شمائل پر مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُخِ زیبا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قد و قامت اور سراپا کی تعریف بھی کی گئی ہے امام ترمذیؒ نے ایک مستقل کتاب شمائل ترمذی کے نام سے لکھی ہے، اس میں وہی احادیث ذکر کی گئی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال کا اور حسن کا ذکر ہے، جو مستقل روایتوں کا ذخیرہ ہے۔

سیرت کی حقیقت اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... تو بہر حال ۱۲ ربیع الاول کو ایک ذاتِ مقدس کو اللہ نے نمایاں کیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نہ پہلے عالم میں پیدا ہوئی تھی نہ بعد میں پیدا ہوگی، ایک کامل نقشہ انسانیت کا ایسا پیش کیا گیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نقشہ دوسرا نہیں ہے اور یہ تو قاعدہ کی بات ہے کہ جیسا سانچہ ہوتا ہے ویسی ہی اس میں چیز ڈھلی ہوتی ہے، سانچہ مکمل ہے تو جو چیز ڈھلے گی وہ بھی مکمل ہوگی۔ سانچہ اگر بے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ، ص: ۶۹۳ رقم: ۲۶۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب رفع الیدین فی الدعاء، ص: ۳۸۱ رقم: ۲۰۷۴.

پینڈ کا ہے تو جو اس میں ڈھالو گے وہ بھی بے پینڈ کا ہوگا تو جب سراپا، قد وقامت اور نقشہ وقالب مکمل تھا تو حقیقت بھی تو اتنی ہی مکمل آنی چاہئے تھی، اس لئے جیسے جمال بے نظیر تھا، ویسے ہی کمال جو اس میں بھرا ہوا تھا، وہ بھی بے نظیر تھا، اس کمال ہی کا نام سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اسی کمال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائل پیدا ہوئے، تو ایک ہے شمائل، شمائل کہتے ہیں ظاہری اوصاف کو، اور خصائل کہتے ہیں باطنی خصلتوں کو، یعنی اخلاق کو، عادات کو، کمالات کو۔ تو جب شمائل اعلیٰ ہوں گے تو خصائل بھی اعلیٰ ہوں گے۔ نقشہ بے نظیر تھا، تو جو چیز ڈھلی ہوئی تھی وہ بھی بے نظیر تھی، جیسے صورت اعلیٰ تھی ویسے ہی سیرت بھی اعلیٰ تھی۔ اس واسطے میں نے عرض کیا صورت خود مقصود نہیں ہوتی، صورت سیرت کے دکھلانے کا آئینہ ہوتی ہے۔ صورت پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے، کسی شخص کو دیکھ کر جب آپ اس کو پہچان لیتے ہیں تو صورت دیکھ کر ہی اصلیت پہچانتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے یعنی اس کی حقیقت کیسی! اس کی عادات کیسی اور اس کی باتیں کیسی ہیں! تو پہلا ذریعہ پہچاننے کا صورت ہے، تو ذریعۂ تعارف ہے صورت۔ حقیقت میں جو چیز پہچاننے کی ہے وہ صورت کے اندر ڈھلی ہوتی ہے اور اس کا نام سیرت ہے۔ تو صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہچاننے کا وسیلہ بنی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ولادتِ جسمانی ذریعہ بنی ولادت روحانی کے پہچاننے کا تا کہ اس ذات کو ظاہر کیا جائے۔ اس ذات سے دنیا کے لئے پھر کمالات نمایاں ہوں تا کہ دنیا ان کمالات پر چل کر خود سعادت حاصل کرے، تو اصل چیز سیرت ٹھہر جاتی ہے۔

سیرتِ مقدسہ اور عصمتِ انبیاء کا جزِ اوّل...... سیرتِ مقدسہ میں سب سے پہلا جز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کا آتا ہے وہ عصمت ہے۔ اہل سنت والجماعت اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نبوت ملنے سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں...... یعنی وہ پہلی زندگی میں بھی گناہ نہیں کر سکتے اور نبوت ملنے کے بعد تو معصومیت نمایاں ہے، پھر تو گناہ کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر نبی کی زندگی میں کوئی ادنیٰ گناہ کا بھی تصور ہو تو پھر اس کی زندگی نمونہ نہیں بن سکتی، جو لوگ اس کے مطابق عمل کریں گے احتمال ہوگا کہ یہ چیز غلطی سے کی ہو، یہ چیز ممکن ہے...... گناہ ہو، تو چونکہ امتی کے لئے نبی کی زندگی قول وفعل میں نمونہ بنتی ہے، ہر شخص نبی کے قول وفعل پر عمل کرنے کا پابند ہے، تو یہ جبھی کر سکتے ہیں کہ جب ہر قول وفعل اتنا پاک اور مقدس ہو کہ اس میں نافرمانی کا شائبہ تک نہ ہو، کسی گناہ کا شائبہ نہ ہو، کسی معصیت کا احتمال نہ ہو، اگر نبی کی زندگی میں گناہ اور معصیت کا احتمال ہو گیا تو زندگی بے اعتبار ہو جائے گی۔ پھر وہ نمونہ اور تقلید کے قابل نہیں رہے گی۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ معصوم پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے گناہ نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کے معصوم ہونے کی فطری وجہ...... انبیاء سے گناہ کیوں نہیں ہو سکتا! اسکی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو انبیاء علیہم السلام کی طینت اور مادہ اتنا پاک رکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر گناہ کی کھپت نہیں ہوتی۔ حدیث میں نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: کہ انبیاء علیہم السلام پیدا تو کئے جاتے ہیں مٹی سے، لیکن ان کی مٹی میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہوتا ہے۔ترابِ جنت (جنت کی مٹی) سے ان کا بدن بنایا جاتا ہے۔اب ظاہر ہے کہ جب جنت کی مٹی کا عنصر شامل کر دیا گیا اور دنیا کی مٹی معمولی درجہ میں ہے، غالب حصہ وہ ہے جو جنت کی مٹی ہے تو جنت کی مٹی سے...... پاک مٹی دوسری نہیں ہوسکتی، اِس خاک کے اندر کدورت ہے اور اُس خاک کے اندر طہارت اور پاکیزگی ہے، لطافت اور نورانیت ہے۔تو گویا انبیاء علیہم السلام جنتی الاصل ہوتے ہیں، ان کی اصل جنت کی ہے، ہماری اصل اس دنیا کی ہے۔ہم اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ گناہ کی لذتوں کی طرف بڑھتے ہیں۔اور انبیاء علیہم السلام اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ پاکی، طہارت، نیکی اور تقویٰ وتقدس کی طرف بڑھتے ہیں۔مثل مشہور ہے "کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے، جو اصلیت ہوتی ہے اس میں وہ ظاہر ہوتی ہے۔تو انبیاء میں اصلیت جنت کی مٹی ہے اس لئے دنیا میں رہ کر بھی ان کا قلب رجوع رہتا ہے جنت کی طرف، دنیا کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔اپنی اصل کی طرف جاتے ہیں۔تو جنت کی مٹی چونکہ پاک ہے، اس واسطے نیک طینت ہونے کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے اندر گناہ کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب تصور ہوگا پاکی کا ہوگا، اسی لئے نبی کی طبیعت اتنی پاک بنتی ہے کہ طبیعت کو جب بھی آزاد چھوڑ دیں خیر ہی کی طرف جائے گی، اصلاح ہی کی طرف جائے گی، نیکی ہی کی طرف چلے گی...... کبھی شر کی طرف نہیں جائے گی، نیک عمل ہی کی طرف جائے گی۔آپ کے عرف میں کہاوت ہے جو آدمی نیک ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "بہت نیک طینت آدمی ہے" یعنی معلوم ہوتا ہے مٹی بہت اچھی ہے کوئی برائی کا کام کرتا ہی نہیں۔تو معلوم ہوا کہ جوہر اگر پاک ہو تو پھر اس سے افعال بھی پاک ہی سرزد ہوں گے۔اور جوہر میں اگر کدورت ہو تو افعال میں بھی کدورت ہوگی۔تو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں جنت کی مٹی شامل ہوتی ہے اور غلبہ اسی کا ہوتا ہے اس واسطے ان کی سیرت اتنی پاک ہوتی ہے کہ طبیعت پاک بنتی ہے، نبی کی طبیعت کو جب چھوڑا جائے تو خیر کی طرف ہی چلے گی، بدعملی کی طرف نہیں جائے گی۔رُخ ہی طبیعت کا یہ ہے تو انبیاء علیہم السلام چونکہ نیک طینت اور پاک طینت ہوتے ہیں اس لئے طبیعت بھی پاک ہوتی ہے۔اس طبیعت سے جو بھی وہ عمل کریں گے نیک ہی ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ شریعت جو اترتی ہے تو نبی کی طبیعت پر اترتی ہے...... جتنے افعال انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں وہ افعال ہی شریعت بنتے ہیں۔نبی کا کہا ہوا اور کیا ہوا ہی تو شریعت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہہ دیا وہ نمونہ اور شریعت بن گیا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بات کریں اس طرح تم بات کرو، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوتے تھے...... اس طرح آپ کو سونا چاہیے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا کھاتے تھے...... اس طرح آپ کو کھانا کھانا چاہیے، جس طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنستے تھے آپ کو بھی یوں ہی ہنسنا چاہیے۔یہ ہنسنا، بولنا، کھانا اور پینا طبیعت ہی کے افعال ہیں اور جب حضور کے یہ سارے افعال نمونہ ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شریعت نبی کی طبیعت کے اوپر اترتی ہے، جو نبی کہہ دے وہ شریعت، جو کر کے دکھلا دے وہ شریعت، تو جب تک طبیعت اتنی مقدس اور پاک نہ ہو کہ اس میں برائی کا شائبہ نہ ہو تو شریعت کیسے بنے گی؟ اس لئے نبی کی طبیعت پر شریعت اترتی ہے اور نبی کی عقل پر علم اُترتا ہے کہ اس طبیعت سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ شریعت ہو جاتے ہیں اور علم کے بارے میں نبی کے اقوال جو ہوتے ہیں وہ وحی ہوتے ہیں کیونکہ عقل کامل پر وحی آتی ہے تو علم بھی انبیاء علیہم السلام کا کامل، عمل بھی کامل تو...... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم ہیں: اولاً تو اس لئے کہ طبیعت پاک پیدا کی گئی؟ اس لئے کہ جوہر پاک رکھا گیا، جنت کی پاک مٹی سے انبیاء کے بدن کو بنایا گیا کہ جب بھی وہ چلے گا نیکی کی طرف چلے گا، اولاً تو اس وجہ سے معصومیت آتی ہے کہ گناہ کی طرف نبی کی طبیعت رجوع ہی نہیں ہو سکتی، یہ فطری بات ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السّلام کا دوسرا جزو...... دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اللہ کے جلال اور جمال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کا قلب ہر وقت اللہ میں منہمک اور اس کی محبت میں غرق ہوتا ہے اور اتنی کامل محبت حاصل ہوتی ہے کہ گویا ہر وقت وہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کے دربار میں اگر آپ جائیں اور نگاہوں کے سامنے بادشاہ ہو کیا اس وقت آپ کو تصور آئے گا کہ آپ اس بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کریں؟ جب کہ بادشاہ کی عظمت سامنے، اقتدار سامنے اور شاہی تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا ہے تو نافرمانی کرنا تو بجائے خود ہے...... آپ کی یہ بھی جرأت نہ ہوگی کہ نگاہ ادھر ادھر بھی پھیریں۔ ادب کے ساتھ نگاہ نیچی رہے گی۔ بادشاہ سامنے موجود ہے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں تو جب ایک معمولی بادشاہ کے مشاہدہ کا اثر انسان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ نہ بے ادبی کر سکتا ہے اور نہ ہی شاہی دربار میں گستاخی کر سکتا ہے، نہ نافرمانی کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ جس ذات کو ہو اور ہر وقت رہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی پر آمادہ ہو! کس طرح ممکن ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے یا منشاءِ حق کے خلاف کرے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام مشاہدہ کے سبب سے بھی معصوم ہوتے ہیں تو ایک معصومیت آتی ہے جوہر (مٹی) کی پاکی کی وجہ سے، دوسری معصومیت آتی ہے مشاہدۂ حق کی وجہ سے کہ اللہ کا جلال و جمال سامنے ہے، ہر وقت اللہ کے سامنے ہیبت زدہ ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں! آپ کو یقین ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ انسان کبھی جرأت نہیں کر سکے گا کہ سنکھیا کھالے۔ جہالت سے یا لاعلمی سے کھالے تو کھالے، لیکن اگر علم ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سنکھیا ہے تو آدمی اس سے دور چلے گا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا دھواں میرے ناک میں چلا جائے اور میں موت کے قریب ہو جاؤں۔ اس لئے کہ آپ کو علم ہے کہ سنکھیا موت لانے والا ہے حالانکہ آپ نے تجربہ نہیں کیا کہ سنکھیا کھا کے دیکھا ہو اور آدمی کا انتقال ہوا ہو اور انتقال کے بعد دوبارہ پتہ چل گیا ہو، تو تجربہ عملاً نہیں ہے محض دوسروں سے سننے پر یقین ہے۔ تو جب دوسروں کے سننے پر یقین ہو جائے اور آدمی اس پر بھی کھانے کے لئے آگے نہ

بڑھے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو سنی سنائی نہیں، بلکہ اللہ کے جلال و جمال کا آنکھوں دیکھا یقین ہے اور وہ مشاہدہ کررہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور اپنے بھی یقین کے خلاف کریں!۔

تو دو باتیں ہوئیں ایک یہ کہ طینت (مٹی) پاک ہے اس کی وجہ سے نبی کی طبیعت کبھی شر کی طرف نہیں جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مشاہدۂ حق ان کے سامنے رہتا ہے۔ ہر وقت اللہ کی عظمت، اس کا قہر، اس کا جلال، اس کی رحمت اور اس کی شان جلال و جمال آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، گویا نبی ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ تو شاہی دربار میں رہ کر بادشاہ کی خلاف ورزی اور بادشاہ کی نافرمانی کا تصور نہیں آسکتا، پھر کیسے ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہ کی طرف چل پڑیں!۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا جزوِ سوم...... اور تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو طینت پاک، پھر مشاہدہ حق اور اس کے ساتھ ساتھ حفاظتِ خداوندی بھی شامل ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت بشریت کے تقاضے سے طبیعت مائل بھی ہو جائے تو اللہ کی حفاظت ہوتی ہے کہ نبی گناہ کر نہیں سکتا اور اس کی زندگی پاک رہتی ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ زلیخا نے جب سات کمرے بنوائے اور یوسف علیہ السلام کو اندر بلایا اور تمام کمروں کے تالے لگوا دیئے تو اس کے بعد اپنی بات اور مقصد سامنے رکھا۔ قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ ① کہ زلیخا نے بھی ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام نے بھی۔ یعنی بتقاضائے بشریت وسوسہ کے درجہ میں ایک چیز دل میں آئی، فرمایا ﴿لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ ② ہوسکتا تھا کہ یوسف مبتلا ہو جائیں یعنی ارادہ کرلیں، عملاً تو نہیں کرسکتے تھے، مگر ارادۃً۔ مگر خدا نے حفاظت کی کہ وسوسہ سے بھی دور رہے۔

یوسف علیہ السلام کی وسوسے سے حفاظت کا طریقہ...... یہ حفاظت کیسے ہوئی؟ حدیث میں ہے ممکن تھا کہ یوسف علیہ السلام کے دل میں خواہش کا وسوسہ پیدا ہو...... لیکن جو چھت کی طرف نگاہ اٹھائی تو یعقوب علیہ السلام کا چہرۂ مبارک چھت پہ نظر پڑا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی یوسف علیہ السلام بھاگے۔ وہاں سات دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ جس دروازے پر پہنچے تالا ٹوٹتا گیا، دروازہ کھلا آگے پہنچے...... وہ بھی دروازہ کھلا، آخر ساتوں کمروں سے باہر آگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے انبیاء علیہم السلام کی طینت پاک ہے اور جیسے مشاہدۂ جلال و جمال کی وجہ سے حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرسکتے، اسی طرح حفاظتِ خداوندی بھی شاملِ حال ہوتی ہے کہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی بات وسوسہ کے درجہ میں آئے تب بھی وہ عمل نہیں کرسکتے، اللہ ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

قبل از نبوت بھی نبی معصوم ہوتا ہے، حضور کا ایک شادی میں شرکت کا واقعہ...... حدیث میں ہے کہ آپ نے خود اپنا واقعہ بلکہ دو واقعے ارشاد فرمائے، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ نبوت سے پہلے بھی نبی معصوم ہوتے

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴.   ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴.

ہیں تو حفاظتِ خداوندی کی مثال دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میری عمر چودہ سال کی تھی، مکہ میں قریش میں کوئی شادی تھی اور شادی بڑے گھرانے میں تھی، تو ناچنے گانے کا بھی کچھ سامان تھا۔ جب دولت بڑھتی ہے تو اسی قسم کی خرافات لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ مفلسی رہے اور کچھ دولت کم ہو تو سیدھا سادھا شادی بیاہ کا معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن دولت بڑھتی ہے تو طغیانی اور سرکشی بھی بڑھتی ہے۔ اگر حق تعالیٰ حفاظت نہ فرمادیں اور کسی کے دل میں صلاحیت نہ ہو تو دولت آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ تو وہاں بھی یہ ہوا کہ دولت مند گھرانہ تھا، ہونا تو یہ تھا کہ روٹی کی سوجھتی، سو جھی یہ کہ شادی میں کچھ رنگ ہو، کچھ ناچ ہو، کچھ تعیّش ہو اور کچھ کھیل تماشے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ قریش کے ہم عمر نوجوان کچھ لڑکے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا: چلو وہاں شادی ہے اور قریش کی برادری ہے ہم بھی شادی میں چلیں۔ یہ تفصیلات تو آپ کے سامنے نہیں تھیں کہ وہاں ناچ رنگ ہوگا، مگر یہ تھا کہ بہر حال تھوڑی بہت کچھ رنگ رلیاں ہوں گی تو لڑکپن کے زمانے میں اس طرف طبیعت کا میلان ہو جانا کوئی عجب بات نہیں ہے۔ دس بارہ برس کے بچوں نے کہا کہ ہم بھی شادی میں شریک ہوں اور وہاں کھیل تماشے بھی ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ساتھ چلا گیا، کھیل تماشے شروع ہونے کا وقت رات کا تھا، جیسے ہمارے ہاں بھی ان کاموں کے لیے عشاء کے بعد رات کا وقت ہوتا ہے، تو عشاء کے بعد ناچ رنگ تھے تو فرماتے ہیں کہ میں جا کے بیٹھ گیا، ابھی پروگرام شروع نہیں ہوئے تھے کہ مجھ پر اتنی شدید نیند طاری ہوئی کہ بیٹھنا میرے قبضہ میں نہ رہا اور میں سو گیا۔ ساری رات سوتا رہا مجھے خبر نہیں کہ ناچ ہوا یا گانا ہوا اور رنگ رلیاں منائی گئیں یا کیا قصہ ہوا! پوری رات اللہ نے میری حفاظت کی اور جب میں اٹھا ہوں تو سُننے میں آیا کہ بہت باجے گاجے بجے، بہت گانے باجے بجائے گئے، بہت ناچ رنگ ہوئے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لیکن مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ ① یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ارادے سے بھی نہیں گئے تھے کہ وہاں ناچ رنگ میں شریک ہوں گے مگر یہ ضرور تھا کہ کچھ کھیل تماشہ ہوگا تو بارہ تیرہ برس کی عمر میں کسی کھیل تماشے کے لئے بچہ جائے یہ کوئی بری چیز نہیں ہوتی، اتنا قلب مبارک میں آیا کہ کچھ کھیل تماشہ ہے لیکن کھیل ناجائز قسم کا تھا، اس لئے کہ اس میں باجے تھے۔

مزامیر کی ممانعت اور دف کی اجازت کی توجیہ...... اور حدیث میں مزامیر کی ممانعت فرمائی گئی ہے اگر اجازت دی گئی ہے تو دف کی اجازت ہے، کہ نکاح ہوا اس میں دف بجا دی تو اس میں کچھ تعیّش نہیں ہوتا بلکہ کانوں کو اور بھی تکلیف ہوتی ہے راحت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ جبکہ ستار میں یا ہارمونیم میں تعیّش اور غفلت کی بات ہوتی ہے، وہ دف کے اندر نہیں ہوتی۔ مگر وہاں مقصود حقیقت میں دف بجانا بھی نہیں وہ تو اعلان مقصود ہوتا ہے کہ نکاح ہو

---

① اخبار مكة للفاكهي، ج: ۴، ص: ۳۹۵، رقم: ۱۶۶۱، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: تاريخ الاسلام للامام الذهبيؒ، مقدمة باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ۱ ص: ۱۶.

دف بجادو تاکہ اعلان ہو جائے تو بہر حال دف اور چیز ہے، باجے گانے اور چیز ہیں کیونکہ شرعاً ممنوع ہیں۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ نے میری حفاظت کی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ باجا بجا ہے یا ناچ گانا ہوا ہے۔ ایک تو یہ واقعہ ہے جس سے واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جیسے طینت پاک ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ نہیں کرتے اور جیسے انہیں مشاہدہ ہوتا ہے؛ اللہ کے جلال و جمال کا جس کی وجہ سے گناہ نہیں کرتے، ویسے ہی اللہ کی حفاظت بھی شامل حال ہوتی ہے۔ اگر کبھی بشری تقاضے سے وسوسہ بھی قلب میں آئے تو اللہ کی حفاظت گناہ ہونے نہیں دیتی اس کی نظیر ایک تو یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

قبل از نبوت بیت اللہ کی تعمیر کا واقعہ...... دوسرا واقعہ پیش آیا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف غالباً ۲۵ برس کی تھی، مکہ مکرمہ میں ایک سیلاب آیا اور مکہ چونکہ نشیب میں ہے، چاروں طرف پہاڑ ہیں، بارشیں تو بہت کم ہوتی ہیں مگر جب زیادہ ہوتی ہیں تو سارا پانی حرم میں آجاتا ہے اور بیت اللہ بالکل بیچ میں ہے گہرائی میں تو سیلاب آیا اور بیت اللہ کے اندر پانی داخل ہو گیا، جس کی وجہ سے دیواروں کے اندر کا چونا بھی نکل گیا، بنیادیں گر گئیں، ایسا ہو گیا گویا پتھر اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے، مصالحہ باقی نہیں رہا، اندیشہ تھا کہ دیواریں گر جائیں۔ قریش نے ارادہ کیا کہ بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر کریں، اس کے لئے چندہ جمع ہوا مگر اس زمانے کے قریش باوجود یکہ شرک میں مبتلا تھے اور انتہائی بدعملیوں کا شکار تھے، لیکن اللہ کے گھر میں مشتبہ مال لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو ڈکیتی بھی مارتے تھے سود اور سٹہ وغیرہ بھی کرتے تھے، جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی تھی۔ لیکن باوجود اس شرِ نفس کے...... ان میں یہ احساس تھا کہ خدا کا گھر پاک کمائی کا مستحق ہے، اس میں کوئی مشتبہ کمائی نہیں آنی چاہیے۔ تو چندہ لینے دینے میں یہ عہد کیا گیا کہ مال ڈکیتی کا نہ ہو، سود کا نہ ہو اور بیواؤں کا نہ ہو، کمائی وہی ہونی چاہیے جو خالص حلال کے ذریعے ہو جو ہم اپنی تجارت کے ذریعے اور زراعت کے ذریعے کماتے ہیں۔ اس کو لے کر جو چندہ جمع کیا گیا تو وہ اتنا نہیں ہو سکا کہ بیت اللہ کی تعمیر ابراہیمی بنیادوں کے اوپر کی جائے۔ تو اسے گوارا کیا کہ پوری تعمیر نہ ہو حطیم کا حصہ چھوڑ دو، حطیم کو چھوڑ کر پھر بیت اللہ کی تعمیر کرو تو چندہ کافی ہو جائے گا۔ چنانچہ آج بھی وہ حصہ حطیم کا چھوٹا ہوا ہے۔ جو حج کر کے آئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ جو بیت اللہ شریف کے متصل ایک گول دائرہ سا بنا ہوا ہے، جس میں حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہما السلام کی قبریں ہیں، اس کے درمیان اور بیت اللہ کے درمیان میں تقریباً پونے دو گز کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، وہ بھی بیت اللہ کا حصہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو خود بنا (تعمیر) کی تھی اور تعمیر بنائی تھی اس میں وہ حصہ بھی بیت اللہ کے اندر شامل تھا، لیکن قریش کا چندہ اتنا نہیں ہو سکا کہ پوری بناءِ ابراہیمی پر تعمیر کر دیں، اس لئے اس حصہ کو چھوڑ دیا اور چھوڑ کر خالص کمائی سے بیت اللہ کو تعمیر کر دیا (۱)۔ یہ تو تھی نیک بات کہ پاک کمائی لگنی چاہیے اللہ کے گھر میں مشتبہ کمائی نہ لگے۔

مگر ایک حرکت جہالت کی بھی تھی، آخر تھے تو جہلائے عرب ہی، کوئی اسلام کی روشنی تو آئی ہی نہیں تھی۔ انہوں

نے یہ سوچا کہ بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اوران کپڑوں میں کریں جن میں رات دن گناہ کرتے ہیں، جن میں رات دن معصیتیں کرتے ہیں، سیاہ کاریاں کرتے ہیں، ان کپڑوں کے اندر کیسے تعمیر کریں! لہٰذا ننگے ہوکر تعمیر کروتا کہ بالکل پاکی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہ جہالت کا شوشہ تھا، اس واسطے کہ بالکل ننگا ہونا تو بے حیائی کی بات تھی۔ تو اگر لباس میں کوئی ناپاک حرکت کی تھی کہ کوئی گناہ کیا ہے تو ننگا ہونا بھی تو گناہ میں شامل ہے۔ تو ایک گناہ سے بچے تو دوسرے گناہ کی طرف آ گئے۔ بقول شخصے کہ ''کنوئیں میں سے نکلے تو کھائی میں جا گرے'' انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جو گناہ کرتے ہیں تو ان کپڑوں میں تھوڑا ہی کرتے ہیں، اس بدن میں کرتے ہیں تو پھر کھال کو بھی کھینچ دینا چاہیے کہ اس کھال سے کیسے بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اور اس بدن سے کیسے کریں جس میں ہم گناہ کرتے ہیں۔ آخر کپڑوں نے بے چاروں نے کیا قصور کیا تھا کہ بدن تو گناہ کر کے پاک کا پاک اور کپڑے ہو گئے ناپاک! اس میں ہم نے چوری کی تھی اور ڈکیتی ڈالی تھی! بھئی کپڑے کا کیا قصور؟ قصور تو تمہاری کھال کا اور تمہارے گوشت پوست کا ہے، اُسے کھینچتے اور اُسے بدلتے..... مگر یہ جہالت کی کہ بولے: ننگے ہو جاؤ، اس لئے کہ کپڑوں نے گناہ کیا ہے تو کپڑوں کو پھینک دو۔

حضور کی حفاظت کا واقعہ...... چنانچہ برہنہ ہو کر تعمیر شروع کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں آیا تو قریش نے کہا: اے محمد! تم بھی شریک ہو جاؤ تعمیر میں، یہ مقدس کام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ مگر قریش نے کہا: دیکھو ننگے ہو جاؤ، برہنہ ہو جاؤ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا۔ شریعت تو نہیں اتری تھی کہ یہ مسئلہ معلوم ہوتا کہ ستر کہاں تک ہے، کتنے بدن کو چھپانا واجب ہے اور کتنے کو نہیں؟ مگر نبی کی طبیعت میں ہی، فطرت میں ہی پاکی ہوتی ہے، سلامتی ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ میں برہنہ ہو جاؤں۔ مگر قریش نے زور دیا کہ نہیں! جب تمہارے سارے عزیز بلکہ بزرگ لوگ بھی سب برہنہ ہو کر تعمیر میں لگے ہوئے ہیں! تمہاری عمر تو ابھی چھوٹی ہے، ابھی تم لڑکپن میں ہو، اپنے بزرگوں کی تعمیل کرو۔ فرماتے تھے میں نے کچھ ارادہ بھی کیا کہ جب یہ سب اس طرح ہیں تو میں بھی برہنہ ہو کر تعمیر کروں، میں اس ارادے اور خیال ہی میں تھا اور گویا میں نے ابھی لنگی پر ہاتھ ڈالا ہی تھا تو اچانک مجھ پر اس زور کی غشی طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر گیا، جیسے کوئی پٹخ دیتا ہے زمین کے اوپر اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا! افاقہ اس وقت ہوا جب تعمیر مکمل ہو چکی تھی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ الغرض حق تعالیٰ نے مجھے برہنہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ① تو برہنگی فی الحقیقت ایک معصیت کی شان ہے، ستر کا کھل جانا معصیت کی شان ہے۔ اسلام میں مرد کا ستر رکھا گیا ہے ناف سے لے کر گھٹنوں تک۔ اس حصّہ بدن کو چھپانا واجب ہے، نماز کے اندر اس حصّہ میں سے کوئی حصّہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی، چاہے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو نماز نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ حصّہ بدن واجب الستر ہے۔ عورت کا ستر گردن سے ٹخنوں تک ہے اس حصہ بدن سے کوئی حصہ اگر کھل جائے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔

① تاریخ الاسلام للامام الذهبي، مقدمة، باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ۱ ص: ٦١.

تہذیب مغرب کی تباہ کاریاں ......آج کل تو ہماری بہنیں جو لباس پہنتی ہیں...... بازو ہیں تو وہ الگ کھلے ہوئے، گلے الگ کھلے ہوئے، سینے کا حصہ الگ کھلا ہوا تو ایسے لباس میں نماز مطلقاً نہیں ہوتی (بشرطیکہ ہماری بہنیں نماز پڑھیں اور جو نماز کے قریب ہی نہ جائیں تو......؟) ان کی آرائش زیبائش ممکن ہے ہو جائے، لیکن اللہ کے ہاں کوئی تقریب یا قرب وطاعت اس میں نہیں ہوتی...... جب کہ یہ حصۂ بدن کھل جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: بہت سی عورتیں زمانے میں پیدا ہوں گی جو کَاسِیَاتٌ ہوں گی عَارِیَاتٌ ہوں گی، لباس پہنے ہوئے ہوں گی اور پھر بھی ننگی ہوں گی، لباس ہوگا بدن پر اور پھر بھی برہنہ ہوں گی، مَائِلَاتٌ مُمِیْلَاتٌ خود بھی مائل ہوں گی اجنبی مردوں پر اور ان کو بھی مائل کریں گی اپنے اوپر، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ عورتیں جنت میں داخل نہیں کی جائیں گی۔ ① اس لئے کہ انہوں نے فتنے کا دروازہ کھول دیا، دنیا کو جہنم میں دھکیلنے کا انہوں نے ارادہ کرلیا تو دو لفظ فرمائے گئے کاسیات عاریات لباس پہن کر پھر بھی ننگی ہوں گی۔ اس کی تین صورتیں ہیں کہ لباس پہنے ہوئے بھی ہوں پھر بھی ننگی ہوں۔

برہنگی کی تین صورتیں اور مادر زاد برہنگی کا فیشن ......پہلی صورت تو یہ ہے کہ لباس ہی نہ ہو؛ یعنی بالکل عریانی ہو، یہ بھی آج کل فیشن چلا ہے۔ یہاں مشرق میں تو نہیں آیا مگر یورپ میں اور جرمنی وغیرہ میں یہ فیشن آیا تھا اب معلوم نہیں باقی ہے یا نہیں۔ لیکن میں آج سے تیس برس قبل کی بات کر رہا ہوں کہ ایک مستقل احاطہ بنوایا گیا تھا جس کا نام ''ایوانِ فطرت'' رکھا گیا، اس میں وہ لوگ داخل ہو سکتے تھے جو بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ کوئی لباس ان پر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ننگے رہو، فطرتاً پیدا بھی ننگے ہوئے تو اب کیوں کپڑے پہنتے ہو؟ وہاں کی گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا کہ ان کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ عنایت کی گورنمنٹ نے کہ ان کے لئے احاطہ بنوا دیا، جو وہاں داخل ہوتا تھا ان پر پابندی ہوتی تھی کہ لباس سے داخل نہ ہوگا تو وہاں تو کَاسِیَاتٌ کا کوئی سوال ہی نہیں کہ کس پر لباس ہوگا! وہاں تو عَارِیَاتٌ ہی عَارِیَاتٌ ہیں، عریانی ہی عریانی ہے۔

لیکن حدیث جو بیان کر رہی ہے وہ: کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ ہیں کہ لباس پہنے ہوئے اور پھر بھی ننگی۔ اس کی تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ لباس ناقص اور ناتمام ہو، یعنی لباس پہنا ہے مگر بازو کھلے ہوئے ہیں، لباس پہنے ہوئے ہے مگر سینہ کھلا ہوا ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر کمر کھلی ہوئی ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر پنڈلی کھلی ہوئی ہے، تو کَاسِیَاتٌ بھی کہا جائے گا کہ لباس پہنے ہوئے ہے مگر پھر بھی ننگی ہیں، اس لئے کہ ستر کھل گیا تو عَارِیَاتٌ بھی کہا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لباس پہنے ہوئے ہو وہ گردن سے لے کر ٹخنوں تک پورا ہو، مگر وہ اتنا باریک ہو کہ لباس سے سارا بدن نظر آ رہا ہو، کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں، لباس پہنے ہوئے ہیں مگر پھر بھی برہنگی اور

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب النار یدخلها الجبارون والجنة ... ج:۴ ص:۱۲۹۱.

عریانی ہے۔اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس بدن پر ہے اور پورے بدن پر ہے اور وہ باریک بھی نہیں ہے، موٹا لباس ہے مگر اتنا چست ہے بدن کے اوپر کہ بدن کی حیثیت پوری نمایاں ہے، جیسے آج کل کے بعض مہمل پائجامے دیکھے گئے ہیں جنہیں عورتیں پہنتی ہیں، یہاں سے لے کر وہاں تک بالکل بدن کے اوپر لپٹے ہوئے ہیں، جیسے کہ پونچھڑے کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہے۔ خدا جانے اس طریقہ میں کیا حسن و جمال ہے؟ جب لباس میں عریانی آگئی تو سارے بدن پر چھا گئی...... سوچنے کی ضرورت ہی نہیں کرتے کہ اصلیت اور اپنی ذات کے لحاظ سے یہ کام بھلا ہے یا بُرا ہے، اک فیشن ہے بس چلنا چاہیے۔ دین کے بارے میں کوئی تقلید کرلے تو طعن کرتے ہیں کہ یہ تقلید کررہا ہے بے شعوری سے عمل کررہا ہے اور دنیا کے بارے میں رات دن تقلید ہے کہ ایک صدا امریکہ سے یا برطانیہ سے چلی...... آنکھ بند کرکے لوگوں نے اس کے اوپر عمل کیا تو کون سی اس میں تحقیق کرتے ہیں؟ کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نقصان ہے! کچھ نہیں بس فیشن چلنا چاہیے، تو یہی لباس چل پڑا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک ٹانگوں سے رانوں تک پاجامہ لپٹا ہوا ہو تو اگرچہ کپڑا تو موٹا ہے مگر بدن کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ غرض تین صورتیں ہوئیں کہ باوجود لباس کے پھر ننگا پن نمایاں ہو یا تو لباس ناتمام ہو کہ اس سے کچھ بدن ڈھکا ہوا تھا کچھ کھلا، یا لباس پورے بدن پر ہے مگر نہایت باریک کہ جس سے بدن جھلک رہا ہو، یا لباس پورے بدن پر ہے موٹا بھی ہے مگر چست اتنا ہے کہ بدن کی حیثیت نمایاں ہے۔ یہ سب کَاسِیَاتٌ اور عَارِیَاتٌ کے حکم میں ہیں۔ تو عورتوں کا لباس ایسا ہونا چاہئے کہ بدن نہ جھلکے، اگر باریک ہو تو کم از کم نیچے کوئی ایسا کپڑا ہو کہ جس سے بدن چھپ جائے یا اوپر ہی کوئی باریک کپڑا پہن لے اور اتنا چست بھی نہ ہونا چاہیے کہ بدن کی پوری حیثیت نمایاں ہو بلکہ ایسا کچھ فراخ ضرور ہو کہ بدن کی حیثیت بھی نمایاں نہ ہو اور بدن ڈھلکے بھی ناں۔

ستر اور حجاب میں فرق...... وجہ اس کی یہ ہے کہ عریانی سے شریعت نے روکا ہے ایک حصّہ بدن کھولنے کی اجازت دی ہے اور ایک حصّہ کی...... کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ جس حصہ کو کھولنے کی اجازت دی ہے اور اس کے کھلے ہونے کی حالت میں نماز ہو جاتی ہے، وہ چہرہ ہے اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ نماز میں ہاتھ پیر ڈھانپنا عورت پر ضروری نہیں ہے یہ حصے کھلے رہیں تو نماز ہو جائے گی لیکن گردن سے لے کر ٹخنوں تک کا کوئی حصّہ نہیں کھلنا چاہیے، یہ ستر کا حصّہ ہے۔ جیسے مرد میں ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصّہ ستر ہے جو نہیں کھلنا چاہیے۔ اب آگے جو عورت کے لئے پردہ ہے وہ حجاب کہلاتا ہے وہ ستر میں داخل نہیں ہے، کوئی اجنبی آ گیا تو نقاب ڈال لیا ورنہ ضروری نہیں ہے یا اجنبی دور اور بعید ہے کہ پہچان ممکن نہ ہو تو بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے تو حجاب کا تعلق دوسروں سے ہے اور ستر کا تعلق اپنی ذات سے ہے، حجاب جب ہوگا جب کوئی اجنبی دیکھنے والا ہوگا اور ستر ہر صورت میں ہوگا کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ہر صورت میں حصّۂ ستر چھپانا ضروری ہوگا۔ نماز میں یہ حصہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی۔

بہر حال عریانی اور ننگے پن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو جس شریعت میں عریانی کو برا کہا گیا اس شریعت

کے لانے والے پیغمبر کیسے عریاں ہو سکتے تھے! کیسے بدن کو ننگا کرتے! تو آپ کی فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ برہنہ نہ ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ نہیں کیا، محض کچھ وسوسے کے درجے میں ایک چیز قلب میں آئی تو حفاظتِ خداوندی شامل ہوگئی اور پھر اس طرح سے میں گرا ہوں کہ جیسے کسی نے پٹخ دیا ہو۔ یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔

انبیاء میں عصمت جبری نہیں بلکہ ارادی ہے...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی سیرت میں بنیادی چیز عصمت اور معصومیت ہے یعنی گناہ سے پاکیزگی، تو نبوت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام گناہ نہیں کرتے اور نبوت کے بعد بھی۔ اور گناہ نہ کرسکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حق تعالیٰ مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ نہ کرسکیں اور معاذ اللہ انبیاء میں کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ کمال تو یہ ہے کہ انبیاء اپنے ارادے سے بچیں، یہ کمال ہے، مجبور ہو کر بچنا یہ کمال میں شامل نہیں ہے۔ تو اس کی صورت میں نے عرض کی کہ انبیاء اپنے ارادے سے ہی معصیت سے بچتے ہیں مگر معصیت کا ارادہ کر نہیں سکتے کیونکہ ان کے جوہروں میں معصیت کی طلب نہیں ہے جب مٹی پاک رکھ دی تو برائی کی طلب کہاں سے پیدا ہوگی؟ اور اس کے ساتھ ساتھ جب انہیں اللہ کی ذات وصفات کا مشاہدہ ہے گویا ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہیں تو پھر برائی کا ارادہ کرنے کی ہمت کیسے ہوگی! معصیت کا ارادہ کیسے کرسکتے ہیں! اور تیسری چیز کہ اگر بتقاضائے بشریت بھی وسوسے کے درجے میں کوئی بات دل میں آئے تو حفاظتِ خداوندی انہیں گناہ کرنے نہیں دیتی، اس لئے ان کی زندگی معصوم اور پاک رہتی ہے۔

حضور کی حفاظت خداوندی کا ایک اور واقعہ...... حدیث میں ہے کہ جب آپ کے اوپر وحی آئی تو وحی آنے کے کچھ عرصہ بعد وحی کا انقطاع ہوگیا۔ اسے "فترت کا زمانہ" کہتے ہیں کہ وحی منقطع ہوگئی اور چند دن وحی آنا بالکل بند ہوگئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک انقباض اور قبض طاری ہوا اور طبیعت اس درجہ بے چین رہتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے کہ اب زندگی بے کار ہے۔ جب وہ جلال و جمال سامنے آ کر چھپ گیا تو اب زندگی بے کار ہے، اس کے بغیر زندگی کوئی چیز نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودکشی کا ارادہ کیا کہ بس میں اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میں چلا تاکہ پہاڑ سے اپنے کو گرالوں، تو چلنے کے وقت ہی اچانک آواز آئی: "یا محمد!" دیکھتا ہوں تو کہنے والا نظر نہیں آتا، ادھر آواز نے متوجہ کیا اور میں اس فعل (خودکشی) سے رُک گیا۔ بعد میں پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو گرادوں یہ بھی کیا زندگی ہے! نہ وہ مشاہدہ، نہ وہ جمال اور نہ وہ تجلیات، سامنے کچھ بھی تو نہیں، کیا فائدہ اس زندگی کا! پھر ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو گرادوں۔ پھر آواز آئی اور کسی نے بازو تھام لیا کہ کیا کرتے ہو؟ پھر میں رک گیا مگر نظر کوئی نہیں آیا۔ اس کے بعد ایک دن پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو ختم کرلوں...... تو حضرت جبریل علیہ السلام کی صورت ظاہر ہوئی

اور اصلی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا۔①

معصیت کو ذریعۂ تبلیغ بنانا اصولِ تبلیغ کے خلاف ہے...... یہی ہے وہ حفاظت خداوندی، خودکشی چونکہ اس دین کے اندر ناجائز اور ممنوع تھی اور بعد میں پیغمبر ہی ارشاد فرمانے والے ہوئے کہ خودکشی حرام ہے، تو پہلے کیسے اس کا ارتکاب کر سکتے تھے! یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی داعی، کوئی واعظ اور کوئی نصیحت کرنے والا کوئی نیکی کرانا چاہے مگر یوں سمجھے کہ نیکی کا کام تب ہی کرا سکوں گا جب اتنی کچھ برائی کرالی جائے گی، کیونکہ لوگ بغیر برائی کے جمع نہیں ہونگے، جیسے باجے گاجے اور ہارمونیم سے لوگوں کو مناسبت ہے تو کچھ باجے گاجے اور ہارمونیم رکھ لیں کہ اس حیلے سے لوگ جمع ہوجائیں گے پھر میں وعظ سناؤں گا تو معصیت کو تبلیغ کا ذریعہ بنانا یہ تو نہایت ہی مضر چیز ہے اس لئے کہ آپ جب ایک دفعہ باجا بجا چکے اور لوگوں کو جمع کر لیا اور اب جو لوگوں کو منع کیا تو وہ کہیں گے جناب آپ نے کیوں بجایا تھا؟ تو کسی ایسی معصیت کو نیکی کا ذریعہ بنانا جو ناجائز اور ممنوع ہے...... یہ تبلیغ کی حکمت کے خلاف ہے۔ یہ تو اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لینے والی بات ہے۔ آج دین کے کسی مسئلہ میں تساہل کیا اور ڈھیل دے دی، کل کو اگر کوئی فتوی پوچھے گا تو یہ جواب دینے کا ہمارا منہ نہیں ہوگا کہ یہ ناجائز ہے، وہ تو کہیں گے یہ چیز کل آپ نے بھی کی تھی، اب آپ کہتے پھریں کہ کل یہ مصلحت تھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ مسئلہ کے مقابلہ میں مصلحت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سیدھا سادھا مسئلہ ہے اس پر عمل کیا جائے، کاہے کی مصلحت! مصلحت یہی کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے اس پر عمل کرو اور بس۔

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ آئندہ حکم دینے والے تھے کہ ناچ گانا ممنوع ہے، خودکشی کرنا حرام ہے تو خود کبھی بھی اس کا ارتکاب نہیں فرما سکتے تھے۔ وسوسے کے درجہ میں ایک بات آئی بلکہ وہ بھی خیال گذراں کے طور پر...... تو فوراً حفاظتِ خداوندی شامل حال ہوگئی۔ اپنے نبی کو ایسی چیزوں سے بچایا کہ کل نصیحت کرنے کا منہ رہے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، کوئی گناہ صغیرہ اور کبیرہ نہیں کر سکتے اگر ادنیٰ درجہ کا بھی گناہ سرزد ہوجاتا تو دوسروں کو نصیحت کرنے کا منہ نہ رہتا لوگ کہتے کہ آپ کی پہلی زندگی تو یہ ہے ساری رنگ رلیاں آپ منا چکے ہیں پھر آخر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں؟ ہم کو بھی تھوڑا بہت گناہ کرنے دیجیے ہم بھی کل کو بچ جائیں گے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچ گئے۔ یہ تہمت تھی اور اسی تہمت سے بچانے کے لئے اللہ نے اپنے انبیاء کو اتنا مقدس پیدا کیا کہ نبوت سے قبل بھی ان سے گناہ سرزد نہیں ہونے دیا اور بعد از نبوت بھی۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زندگی کا سب سے بنیادی پتھر اور پہلی اینٹ عصمت اور معصومیت ہے جس سے انکی زندگی مقدس بن جاتی ہے، اس کے بعد وہ اب جو کام کریں گے وہ اسوۂ حسنہ ہوگا، نمونہ ہوگا اور امت کو حکم کیا جائے گا کہ تم بھی اس کے اوپر چلو۔ اس لئے نبی کی زندگی میں معصیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا گناہ نہیں ہوتا۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِ مبارک کی بنیادی چیز درحقیقت عصمت ہے جو ولادت سے شروع

① السمط الثمین فی فضائل امهات المؤمنین، باب فضائل خدیجة رضی اللہ عنها، ص: ۵۳۔

ہوتی ہے، چالیس برس جو نبوت سے قبل کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں اور ۲۳ برس جو بعد کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں۔اس طرح سے ۶۳ سال کے اس طویل عرصہ میں ادنیٰ درجہ کی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس پر انگلی رکھی جا سکے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر غیر مُسلموں کی شہادت، ایک واقعہ......یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اپنے بلکہ غیر مسلم بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جو تاریخ دان انصاف سے غور کرتے ہیں اور نبوتوں کی زندگی سے من جملہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں، انہوں نے شہادتیں دی ہیں کہ دنیا میں ایسا کامل و مکمل انسان جس کی زندگی پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

لکھنؤ میں آج سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے ایک جلسۂ سیرت ہوا۔''فردوسِ ادب'' ایک بڑی انجمن ہے وہ ہر سال لکھنؤ میں جلسہ کرتی ہے، سیرتِ طیبہ سننے کے لئے بڑا اجتماع ہوتا ہے، کوئی پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ آدمی جمع ہوتے ہیں، جہاں تک نگاہ جاتی ہے آدمی آدمی نظر آتے ہیں، اکثر مجھے بلاتے رہتے ہیں، مگر فرصت نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ میری شرکت ہوئی۔آدمیوں کا سمندر معلوم ہوتا تھا۔تو انہوں نے ''کے ایم منشی'' جو کہ یو پی گورنمنٹ کے گورنر تھے اور ہیں یہ ہندو......ان کو بھی دعوت دی اور صدارت بھی انہیں کی رکھی۔ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی، شرکت کی دعوت دینا تو ٹھیک ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حالات سنیں۔لیکن ایک مقدس جلسہ کی صدارت یا اس میں ایسی توقیر کسی مقدس ہستی کیلئے ہونی چاہیے غیر مسلم کے لئے موزوں نہیں، کسی مسلم یا نیک کی ہی ایسی توقیر ہونی چاہیے، اس میں اس شخصیت کی طرف میلان اور جھکاؤ بھی ہوتا ہے، چنانچہ اگر توقیر بھی کی جائے تو مسلم ہی کی کی جائے، اس لئے کہ جلسہ کا مقصد اسلام پیش کرنا ہے تو اسلام (والے) ہی کی عظمت نمایاں ہونی چاہیے۔پیش کر رہے ہوں آپ اسلام اور تعظیم......نمایاں ہو غیر اسلام یا غیر مسلم کی! یہ اصول کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ہاں سیرت کے جلسوں میں شرکت کی دعوت سب کو دی جائے، تا کہ غیر مسلم پیغمبر کے حالات کو سنیں اور دین کی طرف ان کی توجہ ہو۔الغرض انہوں نے دعوت دی......مگر کے ایم منشی نے معذرت کی اور کہا مجھے کام زیادہ ہے فرصت نہیں ہے کہ میں آسکوں اور مزید کہا کہ باوجودیکہ میرے دل کا تقاضا ہے کہ اس مقدس جلسے میں شریک ہوں مگر کام اتنا پڑا ہوا ہے کہ مجھے کان کھجانے کی فرصت نہیں ہے، ہاں میں اپنا پیغام لکھ کر بھیج دیتا ہوں جو میری طرف سے شریک ہونے والا میرے پیغام کو پڑھ کر سنا دے گا۔پچیس تیس ہزار کے مجمع میں وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا یو پی کا گورنر تھا اور مذہباً ہندوؤں میں سے تھا۔اس کے پیغام کے دو جز تھے پہلا جز تو یہ تھا کہ: ہم تاریخی اعتبار سے اس بات کا یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ دنیا میں اتنا کامل اور مکمل انسان کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ان کی زندگی پر کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ حصہ کمزوری کا ہے۔ جس پہلو کو دیکھو مقدس اور کامل ہے؛ گھریلو زندگی کو دیکھو تو اعلیٰ درجہ کی مقدس، جماعتی زندگی کو دیکھو تو ہر برائی سے

مبرّا اور منزہ، اجتماعی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی، تنہائی کی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی۔غرض اجتماعی وانفرادی، سونے کی، جاگنے کی، ہنسنے کی، بولنے کی اور ہر پہلو کی زندگی بے مثال ہے۔کوئی پہلو زندگی کا ایسا نہیں ہے جس میں ادنیٰ درجے میں کوئی طعنہ دیا جاسکے یا ادنیٰ درجے میں کوئی اعتراض کیا جاسکے۔اور بعض لوگ جو پھر بھی اعتراض کرتے ہیں تو ایسے لوگ اعتراض کرنے کو تو خدا پر بھی کردیتے ہیں۔دہریئے تو خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو اس بدطینتی کا تو کوئی علاج نہیں۔لیکن انسان جب اپنی انسانیت کے ساتھ غور کرے اور عقل سے سوچے اور تاریخ کو سامنے رکھے تو وہ لازماً اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی کامل اور مکمل ہستی ہیں کہ کہیں ادنیٰ درجہ کے طعن وملامت کی گنجائش نہیں، یہ تو پہلا جز تھا۔اور دوسرا جز پیغام کا یہ تھا کہ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلام کے اصولوں پر بنایا ہے اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھ کر بنایا ہے جس نے آپس کی اونچ نیچ ختم کردی، چھوت چھات ختم کردی، نسلی امتیازات ختم کردیے، رنگ وروپ کا کوئی فرق نہیں رکھا، ملک والوں کے سب کے حقوق برابر ہیں، راستہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے ترقی کرے، جس کا جی چاہے آگے بڑھے، اب کوئی خود کسی کے آڑے آ گیا وہ بات الگ ہے یا تعصبات کیوجہ سے کوئی کسی کا راستہ روک دے وہ انفرادی دوڑ ہے، وہ اشخاص کی بدطینتی ہوگی اور قانون کا نقصان نہیں کہلائے گا۔

اسلام ابدی اور عالمگیر قانون ہے...... دوسرا جز انہوں نے یہ لکھا کہ ہم فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کا قانون اسلام کو سامنے رکھ کر بنایا ہے، گویا مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت کا موقع ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے قانون بنانے میں اگر بنیاد ہاتھ لگی تو اسلام ہی کی بنیاد ہاتھ لگی۔اس زمانے میں انصاف دینے والا اگر کوئی قانون ہے تو وہ اسلامی قانون ہے اور دوسرے قوانین اس دور میں نہیں چل سکتے، نجات اسی قانون کے اندر منحصر ہے وہی سامنے آئے گا تو نجات ہوگی۔آج اگر ہم چھوت برتنے لگیں تو دنیا تو بین الاقوامی ہوگئی ہے کہیں ہوائی جہازوں کا سفر، کہیں ریلوں کا سفر...... وہاں آپ چھوت چھات کریں گے، دوسرے کے سائے سے بھی بچیں گے تو سوال یہ ہے کہ آپ جہاز میں تشریف کیسے لائے؟ دوسرے ملک میں کیسے جارہے ہیں؟ وہاں تو لوگوں کے سائے ملیں گے تو اگر بعض اقوام کا سایہ بھی ناپاک ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟ تو دنیا بین الاقوامی ہوگئی اور انٹرنیشنل ہوگئی ہے آج اس کے اندر چھوت چھات چل سکتی ہے اور نہ نسلی امتیازات چل سکتے ہیں، جو چلانے والے ہیں وہ بالآخر ندامت کے ساتھ اسلام کی طرف رجوع کریں گے، آج کی دنیا میں وہ لوگ چل نہیں سکتے، انہیں دنیا ہی کے ساتھ چلنا پڑے گا۔

ہندوؤں کے ہاں چھوت چھات کی بیماری...... میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں کے مذہب میں بنیادی چیز چھوت چھات تھی، ان کے ہاں برہمن پر غیر برہمن کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے ورنہ ناپاک ہوجائے گا، برہمن غیر برہمن کے ہاتھ کا کھا نہیں سکتا، غیر برہمن کا کھانے کو ہاتھ لگ جائے تو برہمن کے لئے وہ نجس ہوگیا، لہٰذا وہ دور سے کھانا

دے گا کہ سایہ بھی نہ پڑے، ہندو غیر ہندو میں فرق، غیر ہندو کا سایہ پڑ جائے تو چیز ناپاک ہوگئی، وہ دور سے کھانا دیں گے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ یہ چھوت چھات ہے جس کے چھوڑنے پر آج دنیا مجبور ہے اور وہی لوگ ناکام ہوئے جو بنیادی طور پر اس مذہب کے حامل تھے۔ خود گاندھی جی جن کے ہاں بھنگی نجس العین کا درجہ رکھتا ہے تو خود انہوں نے بھنگی بستی میں قیام کیا تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ اب بھنگی غیر بھنگی کا فرق نہیں چل سکتا۔ اب تو دنیا میں رائے شماری اور فرد شماری ہے۔ ہر عاقل بالغ ملک کے اندر ایک درجہ رکھتا ہے، وہاں اونچ نیچ یا امتیازات کی کوئی کھپت نہیں ہے، ہمارے ہاں یوپی کے وزیر اعظم تھے گورنر کملا پنڈت۔ ان کا یوپی کا دورہ ہوا، ہمارے دیوبند کے قریب ایک گاؤں رن کھنڈی ہے، دورے میں وہ گاؤں بھی شامل تھا تو ان کا پروگرام چھپا۔ پروگرام یہ تھا کہ رن کھنڈی میں آ کے مندر کے ایک چمار کے گھر میں ٹھہریں گے اور اس کے گلاس میں دودھ پئیں گے تاکہ یہ بتلا سکیں کہ آج نسلی امتیازات ختم ہو چکے ہیں، آج وہ چلنے والے نہیں ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں صدیق وفاروق کی عظمت...... انگریز کے دور میں جب ابتداء میں کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی جو کہ عارضی تھی لیکن بعد میں پھر مستقل ہوگئی، اس وقت گاندھی جی نے ایک مضمون لکھا تھا جو انڈیا کے اخبارات میں چھپا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر ہمارے ہندوستانی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور ہمارے منسٹرز عالمگیر عظمت چاہتے ہیں تو انہیں صدیق وفاروق کا نمونہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ روم اور شام کی حکومتیں ان کے قدموں میں گریں۔ لیکن ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ فقر وفاقہ چھوٹا اور نہ ان کے زہد وقناعت میں کوئی فرق آیا تو اگر ہمارے کانگریسی منسٹرز چاہتے ہیں کہ دنیا میں وقار حاصل کریں تو صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں تو...... کتنی عبرت کی چیز ہے کہ آج غیر مسلموں کو بجز مسلمانوں کی زندگی کے اور کوئی نمونہ نہیں ملتا، نمونہ ملا تو وہی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما۔ اپنی قوم میں انہیں کوئی ایسا نمونہ نظر نہیں پڑا کہ وہ قوم کو نصیحت کرتے کہ فلاں کی زندگی پر چلو۔ انہیں مستند طور پر کسی اور قوم میں بھی کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں پڑی جو تاریخی طور پر سامنے آئے اور ان کو اپنی مثال پیش کرنے کے لیے مجبور کر سکے، اگر نمونہ ملا بھی تو صدیق اکبر کا نمونہ، فاروق اعظم کا نمونہ، علی المرتضٰی کا نمونہ اور عثمان غنی کا نمونہ ملا رضی اللہ عنہم اجمعین...... جس سے اندازہ ہوا کہ غیر مسلم بھی سمجھتے ہیں کہ یہی شخصیتیں مقدس تھیں جن کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

احوالِ صحابیتؓ سے عصمتِ نبوی پر استدلال اور درجاتِ عصمت...... تو جس ذات بابرکات کے خدام ایسے تھے کہ آج دنیا ان کا نام لے کر کہتی ہے کہ ان کا نمونہ اختیار کرو تو خود اس ذات بابرکات کا نمونہ کیا ہوگا! خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات کا کیا مقام ہوگا! حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر پھل کڑوا ہے تو کہیں گے درخت بھی خراب ہے اگر پھل کانٹے دار ہے تو کہیں گے درخت بھی بُرا، پھل شیریں ہے تو کہیں گے درخت بھی عمدہ تو درخت پہچانا جاتا ہے اپنے پھل سے جس

ذات کے پھل ایسے تھے جیسے صدیق اکبر، فاروق اعظم اور ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ان کو اپنے جیسا نمونہ بنا کر پیش کیا۔ جس کے بنائے ہوئے افراد ایسے تھے خود وہ ذات کیسی ہوگی! جس درخت کے پھل ایسے تھے تو اس درخت کی شاخ کیسی ہوگی...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں سب سے پہلے بنیادی چیز جو آتی ہے وہ عصمت اور معصومیت ہے اس کے بعد آگے اسوۂ حسنہ آتا ہے۔ اگر معاذ اللہ گناہ کا شائبہ نبی کی زندگی میں پایا جائے تو زندگی امت کے لئے نمونہ نہیں بن سکے گی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ نبی کی زندگی میں گناہ کی کوئی سبیل نہیں، ممکن نہیں کہ نبی سے گناہ سرزد ہو جائے تو نبی کی ہر نقل و حرکت پاک ہوگی اور شریعت بننے کے قابل ہوگی۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے اخلاق کا، اس کے بعد اعمال کا اور پھر احوال کا۔ یہ معصومیت کے درجے ہیں تاکہ جب اخلاق سامنے آجائیں تو وہ بھی خرابی سے معصوم ہوں، اعمال سامنے آئیں تو ہم کہہ سکیں کہ یہ بھی پاک تھے...... ان میں بھی عصمت تھی لہٰذا ان کا نمونہ اختیار کرو۔ احوال سامنے آئیں تو ان میں بھی عصمت تو وہ بھی معصوم تھے اس لئے انہیں اختیار کرو تو پہلے عصمت، اس کے بعد اخلاق، پھر اعمال، پھر احوال، پھر اقوال اور پھر پوری زندگی آتی ہے اور ان میں بھی بنیادی درجہ اخلاق ہی کو حاصل ہے۔ (معصومیت کے ساتھ) انبیاء علیہم السلام کے اخلاق وہ ہوتے ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی نظیر اور مثال پیش نہیں کی جاسکتی وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ پیغمبر کو اپنے اخلاق کا نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں تو پیغمبر کا ایک ایک خلق اللہ کے اخلاق کی مانند ہوتا ہے، گویا اگر اخلاق ربانی کو مجسم کرنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات بن جائے گی، وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوگا۔ علم، صبر، شجاعت، سخاوت اور زہد...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک چیز مثالی ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ کی ادنیٰ سی جھلک...... حدیث میں ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلاً" ① عام حالات میں تو سخاوت تھی ہی لیکن رمضان شریف کے بارے میں تو کہا گیا کہ آپ کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے نسیم صبح چلتی ہے۔ صبح کی ٹھنڈک اور ہوا ہر گھر میں، ہر قلب میں اور ہر دماغ میں پہنچتی ہے، اس سے فرحت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی کوئی گھرانہ ایسا خالی نہیں ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کے آثار اس گھر تک نہ پہنچتے ہوں، آپ کی داد و دہش عام ہوتی تھی، ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تقسیم فرماتے اور اشیاء تقسیم فرماتے تھے۔ "اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلاً" چھوٹی ہوئی ہوا سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت تھی، ہوائیں اتنی نہیں پھیلتی تھیں جتنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت پھیلتی تھی۔

سخاوت اس وقت کامل ہوگی جب زہد کامل ہوگا اگر دنیا کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہوگا تو دوسرے کو دینا طبیعت گوارا نہیں کرے گی۔ اس لئے ایسا آدمی شریعت پر عمل کرنے کے لئے دنیا کی ہر چیز سے بالاتر ہوگا کہ سارا مال نکل جائے

① الصحيح لمسلم، كتاب الفضائل، باب كان النبي صلى الله عليه وسلم اجود الناس بالخير من الريح المرسلة، ص: ١٠٨٩ رقم: ٦٠٠.

تب بھی پرواہ نہ ہوگی، یہ جب ہوگا جب زہد کامل ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام کے زہد سے بڑھ کر کس کا زہد وقناعت ہوسکتا ہے! اور پھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زہد وقناعت ...... اس کی تو کوئی حد ونہایت ہی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مغرب کی نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے، اذان ہوچکی تھی صفیں درست ہوچکی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مصلّی پر تشریف لائے تکبیر بھی ہوچکی تھی قریب تھا کہ نیت باندھ لیں لیکن ایک دم گھبرا کر گھر تشریف لے گئے اور کچھ منٹ وقفہ کرنے کے بعد واپس تشریف لائے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز پڑھائی۔ نماز پوری ہونے کے بعد حضراتِ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تکبیر ہوجانے کے بعد خلافِ معمول گھر تشریف لے گئے، کچھ دیر لگی اور بعد میں تشریف لائے یہ کیا بات تھی؟ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک دینار رکھا ہوا ہے؛ اس زمانے کی اشرفی جو ہمارے ہندوستانی سکے کی قیمت میں اڑھائی روپے سمجھ لیجیے؛ تو گھر کے طاق میں دینار رکھا ہوا تھا جب میں نیت باندھنے لگا تو مجھے یاد آگیا اور نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ رات گذر جائے اور اس کے گھر میں سونا چاندی ہو اسی لئے میں گھبرا کر گھر گیا اس کو صدقہ کیا اور گھر کو پاک کیا پھر آکر تمہیں نماز پڑھائی ① ظاہر ہے کہ یہ زہد وقناعت تو انبیاء ہی برت سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادت وخصلت اپنانا ہر کسی کا بس نہیں ...... آج لوگ کہتے ہیں کہ سیرت کا جلسہ کرو۔ سیرت کہتے ہیں عادت وخصلت کو، تو کس کی جرأت ہے کہ انبیاء کی ان عادات کی پیروی کرے تو سیرت نبی کی ذاتی زندگی کا نام ہے۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہ انبیاء کی ذاتی زندگی پر چل سکے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بس میں نہیں ہوا کہ سب حضور کی ذاتی زندگی پر چل سکیں ایک دو چل سکے ہیں ورنہ عام صحابہ قانونِ شریعت پر چلتے رہے ہیں اور اسی میں ہماری بھی سعادت ہے۔ یہ حوصلہ کرنا کہ ہم ہُو بہُو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کریں اور قدم بہ قدم چلیں ...... یہ ہماری مجال نہیں ہے۔ خاص اولیاء اللہ میں سے تو کوئی چل سکتے ہیں اور رہی ہماری بات! ہم اگر شریعت کے دائرے میں ہی رہیں تو یہی ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر آدمی حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے یہ اس زمانے کا جنید وشبلی ہے۔ آج کا جنید وشبلی پہلے کا سا نہیں ہوسکتا کہ ایک مستحب کا ترک نہ ہو اور ایک مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔ آج کا بڑا مقدس شخص وہی ہے جو فرائض ادا کرتا رہے اور حرام سے بچ جائے، بس اس سے زیادہ کوئی کامل نہیں۔ فتنے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اس زمانے میں آدمی یوں چاہے کہ میں زندگی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی طرح گذاروں تو یہ ممکن نہیں ہے، نہ زمانے کے حالات ہیں اور نہ ہمارے اندر طاقت ہے، نہ ہی ہمیں حوصلہ کرنا چاہیے۔ بس حوصلہ کی بات یہ ہے کہ شریعت کے دائرے سے باہر نہ نکلے، ناجائز چیزوں کا ارتکاب نہ کرے، جائز چیزوں کی حدود کے اندر رہے اور مشتبہ اور حرام سے بچ جائے بس اتنا کافی ہے، ورنہ انبیاء کی زندگی پر تو اکابر اولیاء اللہ بھی نہ چل سکے۔

---

① السنن للنسائي، كتاب السهو الرخصة للامام في تخطي رقاب الناس ج: ٥ ص: ١٩٢.

عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ کا واقعہ......تاریخ میں ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کے دس دس ہزار مریدین ایک وقت میں جمع رہتے تھے اور لنگر سے کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ ایک دن تشریف لائے اور باورچی خانے کو دیکھا جہاں ان دس ہزار کا کھانا پکتا تھا۔ فرمایا کیسا کھانا ملتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: گوشت روٹی، کبھی دال بھی ہوتی ہے اور کبھی چاول بھی۔ فرمایا: اللہ اکبر! ہم یہاں اس لئے بیٹھے ہیں کہ نبی کی سُنتوں کو رائج کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کی روٹی کے سوا کوئی چیز نہیں کھائی اور ہم یہ گوشت روٹی اور دال کھا رہے ہیں! چنانچہ حکم دیا بند کر دو یہ سب چیزیں اور وہی جو کی روٹی کھلاؤ۔

اور جو کی روٹی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہوتی تھی تو وہ جَو بھی چکی کا پسا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو جَو کھاتے تھے وہ تو ایسا تھا کہ پتھر کی رکابی میں جَو ڈال کے اسے پتھر سے کوٹ لیا دو ٹکڑے ہو گئے پھونک ماری تو بھوسہ اڑ گیا (اسی سے کھاتے تھے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور یہ جَو بھی مہینے میں دو تین مرتبہ نصیب ہوتی تھی ورنہ فاقے پہ فاقے! ایک ایک مہینہ گذر جاتا تھا کہ گھرانۂ نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا۔ ① تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ ہم یہاں نیابت کے لئے بیٹھے ہیں، گویا نائب رسول اللہ کی گدّی ہے اور ہم یہ مزے اڑائیں! سب کو جَو کی روٹی دی جائے۔ چنانچہ یہ سب چیزیں بند کر دی گئیں؛ گوشت، دال اور چاول وغیرہ سب ختم ہو گئے۔ جَو کی روٹی اور زیتون کا تیل دیا جانے لگا۔ ظاہر بات ہے کہ روحانیت تو الگ چیز ہے لیکن معدہ بھی تو جَو کی روٹی کا تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے ہاضمے خراب ہو گئے، کسی کو دست آنے لگے، کسی کو بخار آ گیا۔ تو آدھے سے زیادہ لوگ بیمار ہو گئے۔ ذکر اللہ کی جو مجلسیں تھیں وہ سُونی ہونے لگیں، کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے اور کوئی بخار میں مبتلا ہے۔ خانقاہ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ حضرت شیخ نے تین دن کے بعد فرمایا کہ ذکر اللہ کی آوازیں کیوں نہیں آتیں؟ عرض کیا گیا کہ حضرت نے حکم دیا تھا کہ گندم کی روٹی بند کر دی جائے اور جَو دیئے جائیں۔ گوشت دال بند کر دی جائے اور زیتون کا تیل کافی ہے، اس سنت کے مطابق چلو۔ اس پر عمل کیا گیا......لوگ اس روٹی کو ہضم نہیں کر سکے برداشت نہیں کر سکے، سب کے سب بیمار ہو گئے۔ اب یہ سارے حجروں میں بیمار پڑے ہوئے ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ ذکر اللہ وغیرہ سب ختم ہو گیا تو حضرت شیخ جیلانیؒ نے کانوں کو ہاتھ لگا کے فرمایا: ہم نے گستاخی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کا حوصلہ کیا۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے یہ انبیاء ہی کے ظرف تھے، وہ اس چیز کو برداشت کرتے تھے۔ ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ جائز کے دائرے میں رہیں ناجائز سے بچیں۔ پھر حکم دیا کہ گوشت روٹی پکے، وہی چیزیں جو پکتی تھیں پکائی جائیں، ہمارے پیٹ اس قابل نہیں ہیں کہ وہ جَو کی روٹی برداشت کریں۔

سیرت کے نام جلسہ کرنے کی نزاکت......تو حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی ذاتی زندگی جس کا نام سیرت ہے

① كتاب الجوع لابن ابى الدنيا ص: ٣.

اس پر عمل کرنا یہ ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں تو بعض اوقات کہا کرتا ہوں کہ سیرت کے نام سے جلسہ کرنا بعض دفعہ تو ڈر لگتا ہے کہ یہ بے ادبی کی بات نہ ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کا جلسہ ہوگا، سیرت بیان ہوگی اور کیوں ہوگی! تا کہ ہم سیرت پر عمل کریں۔ہم لوگ کہاں اس قابل ہیں کہ سیرت پر چلیں! کیا آپ میں اور ہم میں......اور سب کے ساتھ میں اپنے کو بھی کہتا ہوں کہ ہم میں یہ جُرات ہے کہ گھر میں جتنا سونا چاندی ہو، بیوی سے لیکر سب صدقہ کر دو کہ میرا گھر پاک ہو جائے؟ اسلئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصلّی پر نماز نہیں پڑھائی جب تک گھر کو سونے سے پاک نہیں کیا، کیا کسی میں جُرات ہے؟ کوئی نہیں کرسکتا۔ کیا کسی میں یہ جُرات ہے کہ آج سے جَو کی روٹی شروع کر دے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نہیں کر سکے۔ ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے؟ تو بہر حال سیرت کا نام لے کر جلسے کرنا بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بے ادبی میں داخل نہ ہو جائے!۔ جلسہ ہونا چاہیے......اصلاحی جلسہ، وعظ وتقریر کا جلسہ۔ سیرت کے جلسہ کے معنی ہیں کہ ہم سیرت پر عمل کریں گے۔ حالانکہ شریعت تو ہم سے نبھتی نہیں، ناجائز چیزوں میں تو ہم مبتلا ہیں اور ہم عمل کریں گے سیرت کے اوپر......آرزو تو کرو مگر......اپنی بساط کو دیکھ کر آرزو کرو۔ یہ کہ ہم بالکل قدم بہ قدم سیرت پہ چلیں گے یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا زہد وقناعت میں ٹھیک رسول اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے میں دوسروں پر سختی فرمانا

......تو بہر حال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زہد وقناعت کو دنیا برداشت نہیں کرسکتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تک برداشت نہ کرسکے، ایک آدھ گنے چنے صحابہ ہیں جنہوں نے ٹھیک حضور کی ذاتی زندگی پر عمل کیا: جیسے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، ان کا مذہب یہ تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو شام کا کھانا جمع کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ذخیرہ ہے اور کنز میں داخل ہے۔ یہ تو خزانہ ہوگیا جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے کہ اگر کنز اور خزانہ بنایا تو جہنم میں اس سونے چاندی کے مال کو پگھلا کے جہنمی مالک کو داغ دیا جائے گا تو یہ ان کا ذاتی مذہب تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو رات کے کھانے کی فکر جائز نہیں ہے، یہ توکل کے خلاف ہے۔ اگر ایک لباس بدن پر ہے تو دوسرا لباس رکھنا جائز نہیں ہے، یہ بھی توکل کے خلاف ہے۔ تو صحابہ میں یہ ایک نمونہ ہے دوسرے برداشت نہیں کر سکے۔ چنانچہ ملکِ شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور شام کا متمول ملک......تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دسترخوان پہ کئی کئی کھانے ہوتے تھے۔ لباس میں بھی عمدگی اور ایک لطافت پیدا ہوگئی تھی۔ مکان بھی ذرا اچھے بن گئے تھے اور یہ کوئی ناجائز بات بھی نہیں تھی، کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ'' ① یعنی اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، دولت دے تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس کے اثرات بھی اس کے اوپر دیکھیں، ڈھنگ کا کھانا اور ڈھنگ کا پہننا ہو، پھٹے حال سے نہ رہے، خراب خستہ حال نہ رہے۔ تو منشاءِ خداوندی یہ ہے کہ نعمت دی جائے تو اس کا اثر بھی بدن کے اوپر آنا

① السنن للترمذی، کتاب الأدب، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری......ص: ۱۹۴۳ رقم: ۲۸۱۹.

چاہیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اگر اچھا لباس پہنا اچھی غذائیں کھائیں تو معاذ اللہ کوئی ناجائز کام نہیں کیا، ان سے زیادہ مقدس کون ہے! مگر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر پہنچے اور دیکھا کہ دستر خوان بچھ رہا ہے اور دو کھانے رکھے ہیں ......بس لاٹھی لے کر کھڑے ہو گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستر خوان پر کب دو کھانے تھے؟ تم نے یہ کیسے رکھ لیے؟ ہٹاؤ ان کو۔ یہ نہیں تھا کہ فقط نصیحت کر دیتے، لاٹھی لے کے مار کٹائی شروع کر دیتے تھے کہ اس کھانے کو ہٹاؤ، کسی کے گھر اگر دو چار کپڑے اندر رکھے ہوئے ہیں تو لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں کب زائد کپڑے تھے جو تم نے رکھے ہوئے ہیں صرف وہ کپڑے رہنے چاہئیں جو بدن کے اوپر ہیں۔ یہ صندوق میں کیوں دو جوڑے رکھے ہیں ......پھر لاٹھی مار کے حکم دیتے تھے کہ نکالو اور ان کو صدقہ کرو۔ آخر لوگ تنگ آ گئے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ انہوں نے تو سب کی زندگی تلخ کر دی ہے! اب سب تقویٰ کے اس انتہائی مقام کو کیسے پہنچیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام تھا۔ اور کس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کریں! آپ انہیں حکم دیجیے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ شریعت میں توسّعات (گنجائشیں) ہیں، اگر کوئی مالدار ہے زکوٰۃ دے دے گا تو مال پاک ہو گیا، یہ نہیں ہے کہ وہ سارا مال جا کے سمندر میں بہا دے تو پاک ہو گا۔ کسی کے پاس دو جوڑے کپڑے ہیں؛ پرانے ہوں یا نئے، فقیروں کو بھی دے دیئے خود بھی پہن لیے بس پاک ہو گئے۔ اب یہ کہ کوئی اچھا کپڑا پہننے ہی نہ پائے یہ تو شریعت کا معارضہ ہے، شریعت تو گنجائش دے اور یہ گنجائش نہیں دیتے! آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ آپ شہر چھوڑ دیں اور جنگل میں قیام کریں۔ ①

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکالیف دوسرے انبیاء سے بڑھی ہوئی ہونے کی توجیہ ......تو اسلام خُلقِ عظیم سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبر، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحمل، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت وغیرہ...... یہ وہ اخلاقِ ربانی تھے جنہوں نے واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے پیغمبر اور اس کے رسول ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معجزات اور پھر وحی کے ذریعہ آنے والے علوم یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ذریعے قلوب کے اندر ایمان پیدا ہوتا ہے اور لوگ دین کی طرف آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کسی نبی کو کسی قوم سے وہ اذیتیں نہیں اٹھانی پڑیں جو مجھے جھیلنی پڑی ہیں اور جتنی تکلیف مجھے پہنچی ...... تنی تکلیف کسی نبی کو نہیں پہنچی ② حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو زیادہ تکلیف پہنچائی گئی، ساڑھے نو سو برس تبلیغ فرمائی اور قوم ان کا مذاق اڑاتی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے تکلیفیں پہنچیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں۔ پھر کیوں فرما رہے ہیں کہ جتنی اذیتیں مجھے پہنچیں وہ کسی کو نہیں پہنچیں؟ اس کی بناء (وجہ) یہ

① اس سے آگے تقریر کا کچھ حصہ ریکارڈ نہ ہو سکا ۱۲ منہ ② حلیة الاولیاء، مالک بن انس، ج: ۳ ص: ۱۱۶۔

ہے کہ اذیت جب زیادہ پہنچتی ہے جب شفقت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی آپ کو کسی سے محبت ہوگی اس سے اگر آپ کو تھوڑی بھی تکلیف پہنچے گی تو زیادہ محسوس ہوگی کیونکہ اسے تکلیف پہنچانے کا حق نہیں تھا، میں تو اتنی محبت کروں اور یہ ایذاء پہنچائے، اگر دشمن آپ کو گالیاں بھی دے آپ خیال بھی نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو گھر سے نکال دیں گے اور انتہائی صدمہ پہنچے گا کیونکہ اس سے یہ توقع نہیں تھی، کہ جس پر اتنی شفقت اور رحمت ہو وہ تکلیف پہنچائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چونکہ امت کے حق میں بے حد شفقت تھی اور بے حد رحمت تھی اس لئے ان کی اذیت دگنی اور تگنی ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لگتی تھی کہ میں تو اتنا شفیق اور یہ میرے ساتھ یہ برتاؤ کریں، تو شدّتِ شفقت کیوجہ سے اذیت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

اسی لئے حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ ذرا سی اس شفقت میں کمی کریں، اتنی زیادہ شفقت نہ کریں کہ اخیر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی بھگتنی پڑے۔ فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ ① شاید آپ اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ کیوں نہیں مسلمان ہوجاتے۔ آپ ان کو چھوڑ یئے، تبلیغ کردیجیے، نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا کیوں دُکھ اٹھاتے ہیں، لیکن غایتِ رحمت کیوجہ سے دُکھ اٹھاتے تھے، انتہائی شفقت اور خُلقِ عظیم کیوجہ سے اس درجہ رحیمانہ اخلاق تھے کہ حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ اتنی شفقت بھی نہ کریں کہ خود آپ کو تکلیف پہنچے۔

خاتم النبیّین کا مطلب..... تو حاصل یہ نکلا کہ (نبی میں) صبر ہو، سخاوت ہو اور شجاعت ہو۔ چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اس واسطے اخلاق میں بھی خاتم الاخلاق ہیں کہ اخلاق کا وہ درجہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا، علم کا جو درجہ دوسرے انبیاء کو دیا گیا اس سے دُگنا چوگنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو مقامِ علم ہے وہ مقام دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا۔ جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال کا ہے وہ دوسرے انبیاء کو نہیں دیا گیا..... اس لئے اور انبیاء علیہم السلام فقط نبی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں تھے بلکہ خاتم النبیّین تھے۔ اور خاتم النبیّین کا مطلب یہ ہے کہ نبوت، علم اور اخلاق کے جتنے مراتب ہیں وہ سب آپ کی ذات بابرکات کے اوپر ختم ہوچکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے کمالات کے منتہاء ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر آکر سب کمالات کی انتہاء ہوگئی تھی۔ گویا اب کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی آئے اور اس درجہ کو لے کر چلائے اور تبلیغ کرے۔ آپ کی ذات بابرکات کے اوپر سارے مراتب ختم کردیے گئے، اس لئے آگے نہ نبوت کی ضرورت تھی اور نہ شریعت کی ضرورت تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین خاتم الادیان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب خاتم الکتب تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت خاتم الشرائع تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعرآء، الآیۃ: ۳.

خاتم الانبیاء تھی۔ تو ختم نبوت کیوجہ سے ہر چیز کا انتہائی مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا؛ علم کا، اخلاق کا اور سارے کمالات کا کیوں کہ نبوت ختم ہوچکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔

نبوت رحمت ہے تو اس کا ختم ہونا زحمت ہے، اشکال اور اس کا جواب...... ممکن ہے کوئی شخص یہاں شبہ کرے کہ نبوت ختم ہوچکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے کوئی نبی نہیں تو نبوت تو سب سے بڑی رحمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا تو ہزاروں نبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آنے چاہئیں تھے مگر معاذ اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو رحمت نہیں زحمت بن گئے کہ نبوت جیسی رحمت کا دروازہ ہی بند ہوگیا کہ نبی آنے ختم ہوگئے، تو یہ رحمت کہاں ہوئی معاذ اللہ! یہ تو زحمت ہوگئی۔ اس لئے آپ کے رحیم ہونے کا تقاضا ہے کہ نبوت کا دروازہ کھلا رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہزاروں نبی آنے چاہئیں۔ بعض ایسے لوگوں نے جو خود چاہتے تھے کہ ہم نبی بن جائیں مگر بن نہیں سکے۔ اتفاق سے دعوے بھی بہت کچھ کئے مگر نبوت پھبی نہیں۔ قطعِ نظر اس کے کہ نبوت ختم ہوچکی تھی مل نہیں سکتی تھی...... پھر بھی اس کا دعویٰ ان کی ذات پر پھبا ہی نہیں۔ جیسے بعض لوگ ٹوپی اوڑھ لیتے ہیں اور ان کو اچھی نہیں لگتی، اسی طرح کوئی چہرہ تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کوئی لباس پہن لے پھب جاتا ہے اور کوئی ایسا بھدّا ہوتا ہے کہ لباس بھی اس کے اوپر بھدّا ہوجاتا ہے۔ تو قطعِ نظر نبوت ختم ہونے یا نہ ہونے کے...... نبوت ان کی ذات پر پھبی نہیں اور چسپاں نہ ہوسکی، مگر انہوں نے نبوت کے دعوے کرنے کے لئے یہ شبہ پیدا کیا کہ نبوت عظیم رحمت ہے اور جو نبوت کا دروازہ بند کرے وہ رحمت کہاں رہا؟ وہ تو زحمت بن گیا تو دروازہ کھلا رہنا چاہیے، نبی آتے رہنے چاہئیں۔ یہ شبہ ممکن ہے کسی کے ذہن میں ہو یا ڈالا جائے اس کے لئے جواب عرض کرتا ہوں۔

جواب...... حاصل یہ ہے کہ ختم نبوت کا معنی قطعِ نبوت کا نہیں کہ نبوت قطع ہوگئی اور دنیا سے منقطع ہوگئی بلکہ ختم نبوت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں، یعنی نبوت کامل ہوگئی اور چیز کے کامل ہونے کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رات کا وقت ہے اور ستارے چمکنے شروع ہوئے، غروب کے بعد ایک چمکا، دوسرا، تیسرا، ہزار، لاکھ، کروڑ، دس کروڑ...... حتیٰ کہ سارا آسمان جگمگا اُٹھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور چاند بھی نکلا ہوا ہے تو چاند ستارے نور پھیلا رہے ہیں لیکن رات نہیں جاتی، دن نہیں ہوتا، رات کی رات رہتی ہے۔ سب نے مل کر کتنی روشنی دی مگر رات موجود ہے اور رات نہیں جاتی۔ آفتاب کے آنے کا جب وقت ہوا تو ابھی نکلا نہیں تھا صرف پوپھٹی تھی کہ بس صبح صادق نے اطلاع دیدی کہ آفتاب آرہا ہے۔ بس خبر آئی تھی کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہوا اور دنیا میں چاندنا ہوگیا۔ ایک ہی ستارے (یعنی سورج) نے آکے سارے جہاں کو چمکا دیا۔ یعنی وہ تو لاکھوں کروڑوں مل کر روشنی ڈال رہے تھے مگر رات کو زائل نہیں کرسکے، دھکا نہیں دے سکے، رات کی رات ہی رہی۔ اور ایک ستارہ ایسا نکلا کہ اس نے آکے ساری رات کو دھکیل دیا۔ پورے عالم میں چاندنا ہوگیا۔ اگر آفتاب

یوں کہے کہ: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" میں نے سارے انوار کو ختم کر دیا، سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں اور نہ اب کوئی نیا ستارہ آنے والا ہے اس لئے کہ میں اتنا کامل نور لے کے آیا ہوں کہ اب کسی ستارے کی حاجت نہیں۔ جو موجود تھے ان کا بھی نور ماند پڑ گیا، ان کے نور بھی غائب ہو گئے اور اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب نے ستاروں کا نور چھین لیا ہے۔ وہ تو منوّر ہیں مگر آفتاب کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی چمک ماند ہے، وہ نظر بھی نہیں آتے۔ ایسے وقت میں آفتاب یوں کہے: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہ میں ہوں خاتم انوار، سارے انوار اور ساری چمکیں مجھ پر ختم ہو گئی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب نور کا کوئی ایسا درجہ باقی نہیں ہے کہ اب کوئی اور ستارہ آئے اور نور پھیلائے۔ اب مغرب کے وقت تک میں اکیلا ہی کافی ہوں کسی ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں یہ دن ہی ختم ہو جائے، یہ جہاں ہی ختم ہو جائے تو یہ بات الگ ہے۔ لیکن جب تک یہ دن موجود ہے کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انوار میری ذات کے اُوپر ختم ہو گئے۔ تو کیا آفتاب کے "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہنے کا یہ مطلب ہوگا کہ نور ختم ہو گیا! نور مٹ گیا دنیا سے! اندھیرا چھا گیا! یا یہ مطلب ہوگا نور کے ختم ہونے کا کہ نور کے مراتب ختم ہو گئے، کامل ہو گئے...... اب کسی دوسرے ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں، دوسری چمک کی حاجت نہیں ہے۔ تو ختم انوار کے معنی قطعِ انوار کے نہیں بلکہ تکمیلِ انوار کے ہیں کہ نور کامل ہو گیا اور اب کسی اور نور کی ضرورت نہیں ہے۔

آفتابِ نبوت کا طلوع...... اسی طرح سمجھ لیجئے کہ نبوت ایک آسمان ہے۔ سب سے پہلے نور کا ستارہ حضرت آدم علیہ السلام کا چمکا اور اس نے آ کے نور پھیلایا، اس کے بعد نوح علیہ السلام کے نور کا ستارہ چمکا، پھر حضرت ہود علیہ السلام کا، پھر حضرت صالح علیہ السلام کا اور ﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا﴾ ① پھر پے در پے انبیاء علیہم السلام آنے شروع ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام آرہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام آرہے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں سے آرہے ہیں۔ گویا آسمانِ نبوت ستاروں سے بھر گیا مگر دنیا میں چاندنا نہ ہوا، یعنی دن نہ نکلا۔ رہی رات کی رات۔ پھر فاران کی چوٹیوں سے صبح صادق علیہ السلام کا طلوع ہوا۔ اس نے خبر دی کہ آفتابِ نبوت آنے والا ہے۔ ابھی آیا نہیں تھا خبر آئی تھی کہ دنیا میں چاندنا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ستارے گُل ہونا شروع ہو گئے اور آفتاب نے نکلتے ہی اعلان کیا کہ اب میں آچکا ہوں، اب کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ میرا نکلنا ہی کافی ہے، پوری دنیا کے لئے اب میں کافی ہوں۔ نبوت ختم ہو گئی یعنی مراتبِ نبوت میری ذات پر منتہی ہو گئے، کامل ہو گئے۔ مزید نبوت کو پھیلانے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں اور اب کسی کو نبی بنا کر نہیں لایا جائے گا۔ اب میری نبوت غروبِ آفتاب تک کام کرے گی...... یہاں تک کہ صبح قیامت طلوع ہو جائے اور یہ دن ختم ہو جائے۔

① پارہ: ۱۸، سورة المؤمنون، الآية: ۴۴.

اس کے بعد اللہ کو اختیار ہے دنیا بنائے یا نہ بنائے یا سب کو جنت میں رکھے۔ مگر جب تک یہ دنیا قائم ہے میں آفتاب ہوں، میرا نور کافی ہے، میرے بعد بڑے بڑے لوگ آئیں گے..... مگر ان کے راستے سے بھی میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔

انوارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی صورتیں..... محدثین آئیں گے تو ان کے راستہ سے میری نبوت کا نور ظاہر ہوگا، فقہاء آئیں گے؛ ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ وغیرہ..... ان سب کے اندر سے میرے انوار ظاہر ہوں گے، خود ان کا کوئی نور نہیں ہوگا۔ صوفیائے کرام آئیں گے؛ جنید، شبلی اور بایزید بسطامی وغیرہ..... ان کی ذات کا کوئی نور نہیں ہوگا، سب سے میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔ کسی طبقے سے میرے علم کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے اخلاق کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے زہد وقناعت کا نور نمایاں ہوگا۔ سب میرے انوار کو ظاہر کریں گے اور ایک میری نبوت قیامت تک کافی ہوگی۔ اس کے لئے آئینے آتے رہیں گے، ان میں سے وہ نور چھنتا رہے گا چمکتا رہے گا، دنیا کو روشنی ملتی رہے گی۔ نبوت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ نبوت کے سارے درجات میرے اوپر ختم ہوگئے۔ تو یہاں ختم نبوت کا یہ معنی لینا کہ نبوت کا دروازہ بند ہوگیا یہ دنیا کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ نبوت مکمل ہوگئی ہے اور وہی کام دے گی قیامت تک..... نہ یہ کہ نبوت منقطع ہوگئی ہے اور دنیا میں اندھیرا پھیل گیا ہے۔ نہ علم رہا اور نہ اخلاق رہے تو یہ معنی نہیں کیا گیا۔ اس لئے دھوکے میں نہ پڑا جائے، ختم نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں، بلکہ کمالِ نبوت اور تکمیلِ نبوت کے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مراتبِ نبوت ختم ہوگئے ہیں اب جتنے بھی مجدد آئیں گے، محدث آئیں گے، آئمہ آئیں گے، صلحاء وشہداء آئیں گے اور مجاہدین آئیں گے..... سب کے اندر ایک ہی نور کام کرے گا۔ سب پیکر ہوں گے اور ان سب پیکروں سے ایک ہی کا نور ظاہر ہوگا، ہوں گے وہ کمالاتِ نبوت۔ تو گویا ''ایک ذات'' اللہ نے ایسی پیدا کی کہ اس کے انوار وبرکات سے پچھلوں کو نبوتیں ملتی چلی گئیں، اگلوں کو ولایتیں ملتی چلی گئیں..... پہلے نبی بنتے گئے، بعد والے ولی بنتے چلے گئے، تو ولایت بھی وہیں سے چلی، نبوت بھی وہیں سے چلی۔ تو اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نکتۂ خیر ہیں کہ پچھلے انبیاء کی نبوتیں درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے مستفیض ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے فائدہ اٹھاتے رہے اور بعد میں آنے والے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سے ولی، مجدد اور محدث بنتے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت درجۂ کمال پر ہے..... فلاسفہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا ہی نور درحقیقت ستاروں میں کام کرتا ہے، چاند میں اپنا ذاتی نور نہیں ہے۔ ستاروں میں اپنا نور نہیں ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ذات (سورج سے) صیقل شدہ ہیں، آفتاب کا جہاں مقابلہ ہوا ان میں چمک پیدا ہوگئی۔ تو درحقیقت اولیاء اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم آئینوں کی مانند تھے، وہ چمک لیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کی۔ نبوت آج بھی آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی کام کر رہی ہے۔ کوئی اور نبوت نہیں ہے وہی نبوت ہے جو چل رہی ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں اور ختم نبوت کے معنی کمالات نبوت کی انتہاء اور تکمیل نبوت کے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو لا کر نبوت کے تمام مراتب ختم کر دیے گئے۔

نبوت کی دو بنیادیں ہیں...... اور نبوت کی دو ہی بنیادیں ہیں: ایک کمالِ علم اور ایک کمالِ اخلاق، تو علم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلیٰ اور اخلاق بھی اعلیٰ۔ علم تو ایسا کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں أُوتِيتُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ① اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کر دیے گئے ہیں، میرے سینے میں بھر دیئے گئے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے فرمایا ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ ② اے نبی! ہم نے آپ کو ان چیزوں کی تعلیم دی جو آپ پہلے سے نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔ اور اخلاق کے بارے میں فرمایا ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ ③ آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں۔ یعنی اخلاق کا جو انتہائی مرتبہ ہے وہ آپ کو دیا گیا ہے۔ تو جب علم بھی انتہائی اور اخلاق بھی انتہائی ہے ...... بس یہی دو بنیادیں ہیں نبوت کی، تو پھر نبوت بھی انتہائی ہوگئی اور یوں آپ خاتم النبیین ہیں۔ تو ختم نبوت میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پوشیدہ ہے۔

ابتدائی درجہ عصمت اور معصومیت کا ہے، اس کے بعد اخلاق کا ہے، اس کے بعد اعمال کا ہے اور اس کے بعد احوال کا ہے۔ تو میں نے کچھ روشنی ڈالی عصمت کے اوپر، کچھ روشنی ڈالی اخلاق کے اوپر، اعمال اور احوال کا باب بہت وسیع ہے...... اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے وقت تنگ ہو گیا ہے، اخیر ہو گیا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ اب اس تقریر کو ختم کیا جائے۔

قرآن ہی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے...... اور کون ہے جو سیرت کی ساری چیزیں بیان کر سکے، اس واسطے کہ سیرت کے بارے میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ تو فرماتی ہیں کہ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ہے۔ جسے اخلاق دیکھنے ہوں قرآن دیکھ لے۔ ④ تو قرآن کے عجائبات قیامت تک تمام نہیں ہوں گے تو سیرت کے عجائبات کہاں سے تمام ہو سکتے ہیں! قیامت تک لاکھوں بیان کرنے والے بیان کرتے جائیں پھر بھی سیرت مکمل بیان نہیں ہو سکتی۔

اختتامِ تقریر...... اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ اب بیان ختم کروں، میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ: ﴿مَا كَانَ

① روح المعانی عن القسطلانی، سورة الكهف، الآية: ٨٢ ج: ١١ ص: ٣٨٠.

② پارہ: ٥ سورة النساء، الآية: ١١٣.

③ پارہ: ٢٩، سورة القلم، الآية: ٤.

④ مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضي الله عنها ج: ٥٠ ص: ١١٦.

مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ ① محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں یعنی نسبی رشتہ نہیں ہے، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی روحانی رشتہ کے باپ ہیں اور مادی اور نسبی رشتے کے باپ نہیں ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: " اَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ② میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں یعنی روحانی باپ۔ تو جیسے اولاد ماں باپ سے تربیت (جسمانی پرورش) پاتی ہے تو روحانی اولاد روحانی ماں باپ سے تربیت (روحانی پرورش) پاتی ہے۔ تو میں روحانی باپ ہوں اور سارا عالم میرے زیرِ تربیت ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ روحانی باپ ہو یا مادی باپ وہ ایک ہی ہوا کرتا ہے، دودو باپ کسی کے نہیں ہوا کرتے۔ تو میں چونکہ روحانی باپ ہوں اس لئے ایک ہوں تو میرے بعد کوئی اور باپ آنے والا نہیں ہے۔ میری اُبُوّت اتنی مکمل ہے کہ وہ تربیت کے لئے کافی ہے: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اب نبوت کا یا باپ ہونے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ نبوت کے درجہ میں کوئی روحانی باپ بن جائے، نبوت ختم ہو چکی۔ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ نبوت کو ایک محل سمجھو جس کی تعمیر ہو رہی تھی جسکی آخری اینٹ میں ہوں۔ میں نے قصرِ نبوت کو مکمل کر دیا۔ ④ اب کوئی انتظار کی حالت باقی نہیں ہے اب نہ باہر سے کوئی چیز آئے گی نہ اندر سے باہر جائے گی۔

خلاصۂ بیان ...... بہر حال چونکہ جلسہ کا موضوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِ مبارک تھا تو ایک میلادِ جسمانی کا ذکر کیا اور زیادہ تفصیل میلادِ روحانی کی کی کیونکہ ہماری سعادت کا تعلق میلادِ روحانی سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت سے ہے اور رسالت کے اخلاق، اعمال اور احوال سے ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں نے زیادہ کی اور اسی لئے یہ آیت پڑھی تھی کیونکہ وہ ساری تفصیلات اس آیت میں تھیں لیکن چھپی ہوئی تھیں اور وہ آیت ختمِ نبوت کے بارے میں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی کمالات اسلئے ہیں کہ آپ کی نبوت انتہائی تھی اور اس واسطے آپ کے انتہائی علم و اخلاق کا ذکر بھی آیا، اس لئے ختمِ نبوت کا ذکر بھی آیا۔ اور چونکہ ختمِ نبوت کا ذکر کرنا تھا تو آیت وہ پڑھی جس میں ختمِ نبوت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسی سے یہ سیرت شروع کی۔

اب وقت زیادہ ہو گیا ہے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس پاک اور عظیم الشان پیغمبر کی زندگی اور نقشِ قدم پر چلنا نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے نبی پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے اور ہم کو سچا اور سیدھا مسلمان بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

① پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰. ② السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب کراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، ص: ۱۹۲۳ رقم: ۸. ③ پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰.

④ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونه ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۴۰۴.

مقام نبوت اوراس کے آثار ومقاصد

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـا وَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُا...... قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① . وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ. اَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ . ②

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس دنیا میں ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جب اس کی ضد سامنے آتی ہے تو اصل چیز گویا واضح ہو جاتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے اس دنیا کو اضداد پر قائم کیا ہے۔ یہ عالم بھی عالمِ اضداد ہے جو بھی کمال اس دنیا میں لایا گیا اس کے مقابلے میں اس کمال کی ایک ضد ضرور رکھی گئی ہے تاکہ وہ کمال کھل جائے اور واضح ہو جائے، خواہ وہ کمال مادی ہو یا روحانی ہو...... ضد سے خالی نہیں ہے۔ اس دنیا میں اگر نور رکھا گیا ہے تو نور کے مقابلے میں ظلمت بھی رکھی گئی ہے۔ تاکہ ظلمت کے تقابل سے نور کو لوگ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر دنیا میں چمکتا ہوا دن لایا گیا ہے تو اس کے مقابلے میں ظلمانی رات بھی رکھی گئی ہے تاکہ دن کی خوبیاں رات کے تقابل سے واضح ہو جائیں۔ اگر اسلام لایا گیا تو اس کے مقابلے میں کفر رکھا گیا تاکہ اس کی ٹکر سے اسلام کی خوبیاں اور قوتیں واضح ہوں۔ اگر ایک طرف اخلاص لایا گیا تو اس کے مقابلے میں نفاق رکھا گیا تاکہ نفاق کے مقابلے سے اخلاص کے کمالات کھل جائیں۔ اگر صدق رکھا گیا تو صدق کے مقابلے میں کذب اور جھوٹ بھی رکھا گیا تاکہ کذب کے مقابلے سے صدق کی خوبیاں واضح ہوتی رہیں۔ اسی طرح چلتے رہیے علم رکھا گیا تو اس کے مقابلے میں جہالت رکھی گئی۔ اخلاق لائے گئے تو اس کے مقابلے میں بداخلاقی لائی گئی تو ہر خوبی کے مقابلہ میں خرابی ضرور رکھی گئی ہے۔

عالمِ اضداد میں اشیاء کے تقابل کی حکمت...... اور یہ اس لئے ہے تاکہ جب خوبی اور خرابی کا مقابلہ ہو تو

① السنن لابن ماجة، کتاب السنة، باب فضل العلماء...... ص: ۱۹۴۲۴۹ رقم: ۲۲۹.

② السنن الکبری للبیهقي، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

خوبی کی قوتیں کھل جائیں۔ بغیر مقابلہ اور تقابل کے کسی کمال کی خوبی کھلتی نہیں ہے۔ جب تک علم کو آپ جہالت سے ٹکرائیں گے نہیں اس وقت تک علم کے مخفی گوشے واضح نہیں ہوسکتے۔ اگر علم کے مقابلے میں اعتراضات نہ کئے جائیں اور سوالات نہ کئے جائیں جو جہل پر مبنی ہوتے ہیں تو جواب سے جو علم کے کمالات کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے علم کو ٹکر دی جاتی ہے جہل سے، کبھی اعتراضات کی صورت سے، کبھی شبہات کی صورت سے اور کبھی الزامات کی صورت سے تاکہ جواب دینے والے جواب دیں تو اس کے مخفی گوشے کھل جائیں۔ قرآن کریم میں بھی اسی لئے فرمایا گیا کہ: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ﴾ ① نہیں، بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تاکہ باطل کے ٹکراؤ سے حق کی مخفی قوتیں نمایاں ہوں اور کھلتی رہیں۔ تو اس دنیا میں اضداد بھی ہیں اور اضداد کا ٹکراؤ بھی ہے۔ بغیر ٹکراؤ اور تصادم کے کمالات کی خوبیاں واضح نہیں ہوتیں۔

مثلاً دو پہلوان ہیں اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں لیکن ان میں کشتی اور ٹکر نہ ہو تو ٹکراؤ کے بعد جو مخفی قسم کے داؤ پیچ کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے پہلوان کو پہلوان سے ٹکرایا جاتا ہے تاکہ فن کی مخفی قوتیں واضح ہوں۔ ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے...... اس واسطے اس عالم کو ظلمانی بنایا گیا اور نورانی بھی بنایا گیا تاکہ ظلمت اور نور کے تقابل سے نور کی اصلیت اور اس کی قوت کھلے۔

اندھیروں میں آفتاب...... سب سے زیادہ ظلمت اور اندھیرے کا زمانہ اس دنیا میں وہ تھا کہ جس کے خاتمہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کی بعثت سے پہلے کا دور انتہائی ظلمت کا دور تھا، انتہائی اندھیری کا دور تھا۔ کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو اس زمانۂ جاہلیت میں موجود نہ ہو۔ جہالت کی برائیاں الگ، بداخلاقی کی برائیاں الگ، بدعملی کی برائیاں الگ، بداعتقادی کی برائیاں الگ، غرض جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ سب کی سب ایک زمانے میں جمع ہوگئی تھیں اور وہ زمانہ: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ② کا مصداق تھا کہ ظلمت در ظلمت اور پے در پے اندھیریاں دنیا کے اندر چھائی ہوئی تھیں۔ اسی لئے حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: "اِنَّ اللهَ نَظَرَ اِلٰى قُلُوْبِ بَنِيْ اٰدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ اِلَّاغُبَرَ اَهْلِ الْكِتٰبِ" ③ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضب آلود نگاہ سے دیکھا، عرب کو بھی عجم کو بھی۔ یعنی کہیں خیر باقی نہیں رہ گئی تھی، ہر جگہ ظلمت ہی ظلمت تھی، ہر جگہ برائی ہی برائی پھیلی ہوئی تھی سوائے چند اہل حق کتابیوں کے جو پہاڑوں میں اور گھاٹیوں میں پڑے ہوئے تھے اور بستیوں میں ان کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تو کلیتہً دنیا میں ایسا دور تو کبھی نہیں آیا کہ حق سرے سے باقی ہی نہ رہے۔ یہ دنیا قائم ہی حق کے اوپر ہے۔ باطل محض

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۸۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۰۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمها، باب الصفات التی یعرف بها اهل الجنة، ص: ۱۱۷۴ رقم: ۷۲۰۷۔

ہو تو دنیا اسی دن تباہ کر دی جائے گی۔ تو ایسا کوئی دور نہیں آیا کہ حق سرے سے دنیا میں نہ رہے یہ ضرور ہوتا ہے کہ حق مخفی ہو گیا، مغلوب ہو گیا، کم ہو گیا، لیکن رہا ضرور۔

تو اس دور میں یہ کیفیت تھی فرمایا کہ ''اِلَّا غُبَرَ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' سوائے چند اہلِ کتاب کے جو بیچارے گرد آلود اور بہت ہی پھٹے پرانے حال میں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے اپنے دین کو بچائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے دنیا قائم تھی، اگر دنیا میں اتنا حق بھی نہ ہوتا تو یہ (دنیا کا) خیمہ اُکھڑ جاتا۔ حدیث شریف میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا دنیا کے اندر موجود رہے گا، جب ایک بھی نہ رہے گا اسی وقت قیامت قائم کردی جائیگی۔ ① تو قیامت عالم کی موت کا نام ہے یعنی موت نہیں آئے گی جب تک حیات کی ذرا بھی رمق باقی رہے گی اور اس عالم کی حیات اللہ کا ذکر اور اس کا نام ہے۔ تو ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود رہے گا تو قیامت نہیں آئیگی، جب ایک بھی نہیں رہے گا وہی وقت عالم کی موت کا ہوگا۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے لیکر قیامِ قیامت تک کوئی دور ایسا نہیں آیا اور نہ آئے گا جس میں حق کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ بس جب دنیا کو ختم کرنا ہوگا تب حق کا نشان مٹ جائے گا باطل ہی باطل رہ جائے گا۔ تو اس زمانۂ جاہلیت میں جب باطل انتہا کو پہنچ گیا تھا، جب ظلمتیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں...... تب بھی گنے چنے اہلِ کتاب یعنی اہلِ حق موجود تھے، جو پہاڑوں میں پڑے ہوئے تھے۔ بستیوں سے الگ چھپے ہوئے تھے، وہ اللہ کا نام لیتے تھے جس کی وجہ سے یہ (دنیا کا) خیمہ کھڑا تھا۔ عام حالت ظلمت کی تھی تو اللہ نے بنی آدم کے قلوب پر نگاہ کی'' فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ'' غضب آلود نگاہ سے دیکھا عرب کو بھی عجم کو بھی۔ قلوب کے اندر خیر باقی نہیں تھی ظلمت ہی ظلمت تھی۔ ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ان اندھیریوں میں غیرتِ خداوندی جوش میں آئی کہ اس ظلمت میں چاندنا کیا جائے تو فاران کی چوٹیوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہاتھ میں سورج تھا اور ایک ہاتھ میں چاند۔ دو روشن چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں، ایک چمکتا ہوا سورج اور ایک چمکتا ہوا چاند۔ کیونکہ اس ظلمت کو دور کرنے کے لئے دو قسم کی روشنیوں کی ضرورت تھی، دُھری روشنی کی ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور بائیں ہاتھ میں چاند۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ یہ سورج ہوگا جو آسمان پر چمکتا ہے اور یہ چاند ہوگا جو رات کو چمکتا ہے۔ ان چاند وسورج کی کوئی حیثیت اور وقعت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے سامنے ان انوار کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

آپ کا اعلانِ تبلیغ اور عرب قوم کا طرزِ عمل...... انکی تو کُل حیثیت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها، باب الصفات التی یعرف بها اهل الجنة، ص: ١١٧٤ رقم: ٧٢٠٧.

جب راہِ حق کی دعوت دی اور پورا عرب دشمن ہوگیا تو قریش نے مل کر ابو طالب کو واسطہ بنایا اور کہا: خدا کیلئے اپنے بھتیجے سے کہہ دو کہ وہ جو چاہے ہم سے لے لے مگر ہمارے بتوں کا برائی سے نام نہ لے، ہمارے دین کی تضحیک نہ کرے، وہ جو چاہے ہم سے لے لے۔ تم اپنے بھتیجے کو سمجھا دو ورنہ پھر اس کے بعد ہمارے اوپر ذمہ داری نہیں رہے گی۔ تو ابو طالب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: کہ اے میرے بھتیجے! قوم نے مجھے وکیل بنا کے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں قوم کا پیغام تیرے پاس پہنچا دوں اور وہ یہ ہے کہ تو نے ۔ وہ دعویٰ کیا ہے اور دعوت دینا شروع کی ہے اگر تیرا مقصد یہ ہے کہ کچھ پیسے روپے جمع ہوں، سونا چاندی جمع ہو...... تو تیری قوم اس کے لئے تیار ہے کہ پورے ملک کا سونا جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈال دیا جائے، اگر حسن و جمال مقصود ہے تو قریش کی بیٹیاں حاضر ہیں جس کو تو چاہے قبول کر لے، اگر سرداری مطلوب ہے تو آج سے ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ تجھے پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیں اور ہم تمہارے سامنے رعیت کی حیثیت سے آ جائیں...... جو تمہارا مقصد ہو کر لو مگر خدا کے لئے ہمارے معبودوں کو جو ہم نے بنا رکھے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو اور ہمارے دین کے بارے میں کوئی برا کلمہ استعمال مت کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے چچا! کہہ چکے جو تم نے کہنا تھا؟ قوم کا پیغام سنا چکے؟ ابو طالب نے کہا: ہاں سُنا چکا۔ فرمایا کہ میری طرف سے تم انہیں کہہ دو کہ اے میری قوم! تم اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج لا کر رکھ دو اور ایک ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دو تب بھی میں یہ کلمہ کہنا نہیں چھوڑوں گا جو میں زبان سے نکال چکا ہوں...... بس یا تو میں اپنی جان ختم کر دوں گا یا دنیا میں اس کلمہ کو پھیلا کر رہوں گا۔ تو اس چاند سورج کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کل یہ حقیقت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ دونوں بھی آ جائیں تو میں اپنا کلمہ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یعنی وہ کلمہ جس کو میں لے کر کھڑا ہوا ہوں جو توحید و رسالت کا بیان ہے، اس کے مقابلے میں اس چاند سورج کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ① تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں جو تشریف لائے تو ہاتھ میں یہ چاند سورج نہیں تھا۔ اس چاند سورج کی تو کوئی وقعت اور حقیقت ہی نہیں ہے۔ میری مُراد سورج اور چاند سے کیا ہے......؟ آپ اس شان سے آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب موجود تھی جو سورج سے زیادہ روشن تھی اور بائیں جانب "قلبِ محمدی" تھا جس میں اخلاق کی نورانیت بھری ہوئی تھی۔ تو ایک طرف آفتاب کہ جس کی روشنی علم خداوندی تھی، یعنی قرآن کریم جو اس علم سے لبریز ہے۔ اور ایک طرف اخلاقِ محمدی کی روشنی تھی جو قلب نبوت میں بھرے ہوئے تھے۔ تو دو چیزیں آپ لے کر آئے تھے ایک چمکتا ہوا علم اور ایک چمکتے ہوئے اخلاق۔ ایک روشن کتاب اور ایک روشن دل۔

بنیادِ نبوت ...... اور یہ اس لئے کہ بہر حال حکماء و فلاسفہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ چاند میں خود اپنی روشنی نہیں ہوتی۔

① الابانة الكبرى، ج: ١٠ ص: ٩٣.

بلکہ سورج اس کے مقابلہ میں آتا ہے سورج ہی کی روشنی اس میں سے ہو کر گزرتی ہے تو وہ ٹھنڈی بن جاتی ہے۔ وہی سورج کی تیز روشنی تھی جب چاند میں آتی ہے تو وطن کی اور موقع کی خصوصیات کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے آگ کو اگر کسی خاص وطن سے اور موقع سے گزارا جائے تو وہ برودت کے آثار پیدا کرتی ہے۔

یہی آپ کی بجلی جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے اگر آپ اس کو کسی مشین کے اندر لگا دیں تو وہ آگ ہے (ہیٹر وغیرہ)، اس میں تیزی ہے، اسمیں گرمی اور حدت ہے، ہاتھ لگا دیں تو آپ کے ہاتھ کو پکڑ لے گی اور جلا دے گی لیکن یہی بجلی اگر اس کو ریفریجریٹر کے ذریعہ سے نمایاں کریں تو یہی بجلی ٹھنڈی ہو جاتی ہے، پھل رکھ دو تو ٹھنڈے ہوں گے، کھانا رکھ دو تو ٹھنڈا ہوگا۔ یہ وہی آگ ہے جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے لیکن مقام اور موسم کی خصوصیت کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک کے آثار پیدا ہو گئے۔ تو ایک چیز ایک جگہ آگ ہوتی ہے جو قابل تحمل نہیں ہوتی اور وہی چیز دوسرے مقام میں لا کے رکھی جائے تو قابل برداشت ہو جاتی ہے۔

تو اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب یعنی علمِ خداوندی اتنا بالا اور اُونچا تھا کہ مخلوق اس کا تحمل نہیں کرسکتی تھی مگر جب اسی علم الٰہی کو قلبِ نبوت سے گزارا گیا اسمیں اعتدال کی روشنی پیدا ہوگئی۔ اس میں ٹھنڈک اور برودت آگئی جو قابل قبول بن گئی تاکہ دنیا اس سے استفادہ کر سکے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا میں اس شان سے تشریف لائے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں سورج تھا یعنی اللہ کی روشن کتاب اور ایک ہاتھ میں چاند تھا یعنی اخلاق نبوت اسمیں بھرے ہوئے تھے اور اسمیں روشنی بھی تھی۔ تو ایک علم اور ایک اخلاق۔ یہ چیزیں آپ لے کر آئے۔ آپ دیکھیں اور غور کریں کہ نبوت کی بنیاد دو چیزوں کے اوپر ہے ایک علمی کمال اور ایک عملی کمال۔ یہی دونوں چیزیں ہیں جو تمام کائنات کی سعادت ہیں۔ علم کامل اور عمل کامل، اگر علم نہ ہو روشنی نہیں ہوسکتی، راستہ نظر نہیں آسکتا، منزل مقصود سامنے نہیں آسکتی اور اگر اخلاق نہ ہوں تو راستہ کے اوپر چلنے کی قوت پیدا نہیں ہوسکتی، اخلاق قوت مہیا کرتے ہیں، علم راستہ نمایاں کرتا ہے تو عالم کا علم اس کو چلا نہیں سکتا، صرف راستہ دکھلانا علم کا کام ہے، چلنا آدمی قوت سے ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تب منزلِ مقصود پر آدمی پہنچتا ہے۔ تو اس لئے علم کی بھی ضرورت پڑتی ہے عمل کی بھی تو نبوت کی بنیاد دو چیزیں ہیں: ایک علمی کمال اور ایک اخلاقی کمال۔

کمالِ علم وعمل کی کل چار قسمیں ہیں...... اسی واسطے قرآن کریم میں کمالِ علم اور کمالِ عمل کے لحاظ سے چار نوعیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ ① جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ کن لوگوں کے ساتھ ہوگا؟ وہ نبیوں کے، صدیقوں کے، شہداء کے اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ تو چار قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک نبی، ایک صدیق، ایک شہید اور ایک صالح۔ غور کیا جائے تو یہ چاروں

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۶۹.

قسمیں علم اور عمل کے لحاظ سے مزید دو قسمیں ہیں۔ علم کی بارگاہ کی دو قسمیں ہیں نبی اور صدیق اور عمل کی بارگاہ کی بھی دو قسمیں ہیں شہید اور صالح۔ پہلی قسم: یعنی علم اولاً نبی کے قلب پر آتا ہے کہ نبی علم کے لحاظ سے اصل ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ تو صدیق اور تصدیق یہ بھی علم کی ایک قسم ہے۔ نبی گویا نَبَأ سے ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ اور صدیق کے معنی تصدیق کنندہ کے ہیں اور تصدیق خود علم کی قسم ہے تو حاصل یہ نکلا کہ نبی اور صدیق یہ علم کے دو افراد ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ نبی علم میں اصل ہے اور صدیق تابع ہے۔ بالذات اور اصل علم کے لحاظ سے نبی ہے اور تابع ہونے کی حیثیت دیکھی جائے تو وہ صدیق کی ہے۔ تو صدیق نبی کے تابع ہوتا ہے اس لئے علم کے دو افراد ہو گئے: ایک نبی اور ایک صدیق۔ عمل کے بھی دو ہی افراد ہیں ایک شہید اور ایک صالح۔ شہید اصل ہوتا ہے عمل میں اور صالح اس کے تابع ہوتا ہے۔ شہید اسے کہتے ہیں جو اللہ کے راستے میں فقط خواہشات ہی نہیں بلکہ اپنے نفس کو بھی ختم کر دے۔ جو جان تک اللہ کے راستے میں لگا دے وہ شہید ہے اور صالح اس کو کہتے ہیں جو نیکی کا راستہ اختیار کر لے یعنی نفس کی خواہشات کو پامال کرتا رہے جو اللہ کی مرضی کو آگے رکھے اسے صالح کہتے ہیں۔ تو شہید اگر جان دے کر فضا ہموار نہ کرے صالحین کی صلاح چل نہیں سکتی۔ صالحین اپنی صلاح پر جبھی قائم رہیں گے جب فضا پُر امن ہو فتنے نہ ہوں اور امن قائم ہو۔ اگر دنیا میں فتنہ پھیلا ہوا ہے تو نمازی کو نماز کی ہوش رہے گی نہ تلاوت کرنیوالے کو تلاوت کا ہوش رہے گا، نہ درود پڑھنے والے کو درود کا ہوش رہے گا تو شہداء اپنی جان دے کر فضا صاف کرتے ہیں تا کہ صالحین اپنی صلاح کو برت سکیں۔ اس لئے اعلیٰ ترین عمل شہید کا ہوتا ہے، صالح اس کے تابع ہوتا ہے تو عمل میں شہید اصل ہے اور صالح اس کے تابع۔ علم میں نبی اصل ہے صدیق اس کے تابع ہے۔ تو ایک علم کا کمال ہے اور ایک عمل کا کمال ہے۔ تو دو فرد علم کے ہیں اور دو فرد عمل کے ہیں، نبی اور صدیق علم کے فرد ہیں، ایک اصل اور ایک تابع۔ اور شہید اور صالح عمل کے افراد ہیں: ایک اصل اور ایک تابع۔ یہ دو چیزیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ دنیا کے اندر سعادت کی بنیاد دو ہی چیزیں ہیں ایک علم اور ایک عمل۔ تو نبوت کی بنیاد در حقیقت یہی دو چیزیں ہیں انبیاء علیہم السلام ایک علمی کمال لے کر آتے ہیں اور ایک عملی کمال جن کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں۔

عمل کی بنیاد اخلاق ہیں...... اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں اگر اندر اخلاق نہ ہوں عمل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے اندر شجاعت کے اخلاق موجود ہیں تو حملہ آوری، ہجوم اور اِقدام کے افعال آپ سے سرزد ہوں گے، اگر آپ کے اندر سخاوت کا مادہ اور خُلق موجود ہے تو داد و دہش، دینا اور غریبوں کے ہاتھ پہ رکھنے کے افعال آپ کے ہاتھ سے نمایاں ہوں گے، اگر بخل کا مادہ موجود ہے تو آپ عطاء نہیں کریں گے، اگر بزدلی کا مادہ موجود ہے تو آپ پیچھے کو ہٹیں گے۔ تو اندر کا مادہ فعل کو حرکت دیتا ہے۔ اسی اندرونی مادے کو جو فعل کو حرکت میں لایا اخلاق کہتے ہیں تو جیسے اخلاق ہوں گے ویسے اعمال سرزد ہوں گے تو عمل کی قوتیں در حقیقت اخلاق ہیں لیکن اخلاق اپنا کام کر نہیں

سکتے جب تک کہ راستہ نظر نہ آئے، علم راستہ دکھاتا ہے۔ تو دو ہی چیزیں کمالات کی بنیاد ہو گئیں ایک علم اور ایک اخلاق۔ علم راہ دکھلائے گا اور اخلاق اس پر چلائیں گے، اخلاقی قوت آدمی کو اس پر دوڑائے گی۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ریل گاڑی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ انجن دوڑتا ہے اور ہزاروں لاکھوں من بوجھ والی لوہے کی گاڑی کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جاتا ہے، مگر انجن کے چلنے اور منزل تک پہنچنے کی شرط کیا ہے؟ ایک تو یہ کہ اس کے سامنے لائن بنی ہوئی ہو، لوہے کی لائن اس کے سامنے بچھی ہوئی ہو، جس پر انجن کو اتارا جا سکے اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے اندر اسٹیم کی طاقت بھری ہوئی ہو، آگ اور پانی کو جمع کر کے بھاپ کی طاقت اس کے اندر بھر دی جائے۔ تو اگر لائن بچھی ہوئی نہ ہو تب بھی انجن نہیں چل سکتا اور لائن بچھی ہوئی ہو مگر انجن کے اندر اسٹیم کی طاقت نہیں ہے تب بھی انجن نہیں چل سکتا۔ لائن پر انجن کھڑا ہوا ہے مگر اندر نہ آگ ہے نہ پانی اور بھاپ کی طاقت پیدا نہیں ہوتی تو دھکیل دھکیل کے آپ اسے کہاں تک چلائیں گے؟ ہزاروں آدمی مل کر دھکا دینے لگیں گے تو یہ بالشت بھر چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ تو جب تک انجن کے اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو نہیں چل سکتا۔ اور اگر اندر طاقت بھری ہوئی ہے مگر لائن بچھی ہوئی نہیں ہے تو جتنا زور سے چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا، منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچے گا۔ تو منزل مقصود تک پہنچنے کی دو ہی شرطیں ہیں کہ لائن بھی بچھی ہوئی ہو اور اس لائن پر چلنے کی قوت بھی موجود ہو اور اسٹیم کی طاقت بھی ہو تب چلے گا۔ اور چلے گا تو پھر ایسا چلے گا آپ اس کے ساتھ ہزار ہا من لوہا اور ہزار ہا من بوجھ جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ ہزاروں ڈبے، ہزاروں انسان، ہزاروں اشیاء اور سامان سب کو گھسیٹ گھساٹ کے منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ اس لئے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

شریعت اور طریقت کا حسین امتزاج...... تو ٹھیک اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر انسان مثل انجن کے ہے، اس میں بھی دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ اس کے سامنے کھلا ہوا چلنے کا سیدھا راستہ، اسے منزل سامنے نظر آئے اور ایک اس کے اندر چلنے کی طاقت موجود ہو، تو وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر یہ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی کا نام صراط مستقیم ہے اور شریعت حقہ ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ ① یہ ہے میرا سیدھا راستہ، اس کا اتباع کرو اس کی پیروی کرو۔ تو وہ راستہ جس پر آدمی چلے گا اس کا نام شریعت ہے لیکن راستہ سامنے ہو، محض نظر آ جائے، مگر اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو آدمی چل نہیں سکے گا۔ وہ اندر کی طاقت کیا ہے؟ وہ اخلاق کی قوت ہے...... جس کو طریقت، ریاضت اور مجاہدہ سے پیدا کرتی ہے، پھر عشقِ نبوی کی وہ آگ پیدا ہوتی ہے جو ہر مسلمان کے اندر سلگ رہی ہے تو آگ اور اسٹیم اسے اس راستے کے اُوپر دوڑاتی ہے۔ اگر راستہ سرے سے نہیں ہے چلنے کی کوئی شکل نہیں ہے اور نہ اندر عشقِ محمدی موجود ہے نہ عشقِ خداوندی موجود ہے تو اس میں چلنے اور دوڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ تو شریعت کا علم راستہ دکھلاتا ہے اور طریقت کی ریاضت چلنے کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ جب دونوں

---

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳۔

چیزیں جمع ہوتی ہیں تو پھر ایسے آدمی صرف خود ہی نہیں چلتے بلکہ ان کے پیچھے ہزاروں انسانوں کو جوڑ دو وہ سب کو گھسیٹ کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ان میں اس کی طاقت ہوتی ہے۔تو دو طاقتوں کی ضرورت ہے ایک شریعت کی طاقت اور ایک طریقت کی طاقت۔طریقت اخلاق بنائے گی اور شریعت راستہ دکھلائے گی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان کے لئے مدرسہ کی بھی ضرورت ہے اور خانقاہ کی بھی ضرورت ہے۔اگر مدرسہ نہ ہو اور تعلیم نہ ہو تو علم سامنے نہیں آسکتا اور اگر خانقاہ نہ ہو اور اخلاق درست نہ ہوں تو چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوسکتی۔تو مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو جمع کیا جائے جب جا کے آدمی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

مولویت اور صوفیت میں جنگ کیوں؟...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ جو آجکل مولویوں اور صوفیوں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے پچھلوں کی جنگ تو ایسی نہ تھی۔اگر حقیقی معنوں میں ایک سچا عالم ہو تو صوفی کا اس سے زیادہ قدردان کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔اور اگر سچا درویش اور صوفی ہو تو عالم کا اس سے زیادہ قدردان کوئی نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر علم بھی ناتمام ہو اور عشق بھی ناتمام ہو تو یہ اس کا مدِ مقابل ہوگا وہ اس کا مدِ مقابل ہوگا۔یہ لڑائی اب بعد کے لوگوں میں چلی ہے، پہلے کے کاملین میں کبھی لڑائی پیدا نہیں ہوئی۔

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی محفل سماع اور حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا احتساب

......حضرت سلطان المشائخ وسلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین دہلویؒ آپ جانتے ہیں کہ کتنے بڑے پائے کے عالم ہیں، درویش ہیں، صوفیاءِ چشتیہ میں اُن کا آفتاب کا سا مقام ہے۔ایک روشن دل اللہ نے ان کو عطاء فرمایا تھا۔بہت بڑی ذات ہے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی۔اُس زمانے میں جبکہ حضرت خواجہ کے فیوض وبرکات سے دنیا مالا مال ہو رہی تھی، اخلاقی دولتیں کما کما کے لے جارہی تھی...... اسی زمانے میں حکومت کی طرف سے حکیم ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہ جو کوتوال اور محتسب تھے اس کی نگرانی کرتے تھے کہ کوئی بداخلاقی یا خلافِ شرع حرکت نہ کرنے پائے۔کسی کو بھی دیکھا کہ بدعات میں مبتلا ہے یا خلافِ شرع امور میں مبتلا ہے فوراً گرفتار کرتے تھے۔پھر حکومت کی جانب سے احتساب ہوتا تھا اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

پہلے تو یہ واقعہ سُناؤں کہ دونوں کا مقام کیا ہے؟ حضرت سلطان المشائخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یارانِ طریقت بیٹھے ہوئے تھے اور سماع ہو رہا تھا مگر سماع کی صورت باجے گاجے کی نہیں تھی جو مُحقِّق مشائخ ہیں ان کے ہاں مزامیر اور باجے گاجے نہیں ہوتے۔سماع کے معنیٰ یہ تھے کہ خوش آوازی سے پڑھنے والا کوئی نعت پڑھ رہا تھا کوئی غزل پڑھ رہا تھا جس میں اربابِ احوال کے قلوب کی گرہیں کُھل جاتی تھیں، گتھیاں کھل جاتی تھیں تو خوش آوازی سے کوئی پڑھنے والا مغنی پڑھ رہا تھا اور سب پر حالات طاری ہو رہے تھے اور کیفیات طاری ہو رہی تھیں۔اس لئے کہ سماع حضراتِ صوفیاء نے حظِ نفس کے لئے نہیں سُنا۔جب قبض طاری ہو تو قبض کو دفع کرنے کا ایک

علاج ہے ایک معالجہ ہے کوئی غذا نہیں ہے کہ رات دن کھائی جائے۔

محض ایک علاج ہے معالجہ کے طور پر اسے استعمال کرتے تھے تو انقباض رفع کرنے کے لئے یارانِ طریقت جمع تھے اور جائز حدود میں سماع ہو رہا تھا اس میں ''مزامیر'' نہیں تھے، باجے گاجے نہیں تھے مگر ظاہری طور پر بظاہر ایک ایسی چیز تھی کہ خلاف شرع مجمع نظر آتا تھا۔ یا اس درجہ کی چیز تھی کہ یہ تو خواص ہیں مگر ان کے اس فعل کو دیکھ کر عوام کہیں باجے گاجے بھی استعمال نہ کرنے لگ جائیں۔ تو حکیم ضیاء الدین سنامیؒ نے آ کر اس کو روکنا چاہا اور ڈانٹ کر کہا کہ خلاف شرع امر بند کرو مگر وہاں ہوش کسے تھا جو سنتا، وہاں تو سب ارباب احوال تھے اپنے اپنے حال میں غرق، لہٰذا کسی نے نہ سنا۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دیکھا کہ کوئی سنتا نہیں...... سمجھ گئے کہ صاحب حال لوگ ہیں، یہ نہیں کہ کوئی بغاوت یا تمرّد کر رہے ہیں، بلکہ واقعی حال میں غرق ہیں تو اوّل تو اتمام حجت کے لئے زور سے کہا کہ بند کرو اس سماع کو، لوگوں میں اس سے فتنہ پھیلے گا، وہاں کون سنتا تھا۔ سارے صاحب حال تھے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے حکم دیا کہ خیمے کی طنابیں کاٹ دو، جب خیمہ ان کے سر پر گرے گا جب یہ سماع کو بند کریں گے۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر طنابیں کاٹ دیں، مگر وہ خیمہ ہوا کے اوپر قائم رہا۔ ساری رسیاں کٹ گئیں خیمہ نہیں گرا۔ اب بے چارے حکیم ضیاء الدینؒ صاحب کیا کریں! امر بالمعروف بھی کر دیا اور تغییر بالید بھی کر دی کہ ہاتھ سے اس چیز کو مٹانا بھی چاہا مگر نہیں مٹی، اس واسطے کہ وہ تو سچے لوگ سن رہے تھے سب کے سب ارباب حال تھے۔ اب یہ دیکھا کہ کسی طرح نہیں بن پڑی تو یہ خیال ہوا کہ کہیں سپاہیوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہی امر حق ہے، یہ خواہ مخواہ ہم سے امر حق کا مقابلہ کرا رہے ہیں تو کہا دیکھو کہ یہ سارے بدعتی ہیں اور بدعت میں مبتلا لوگ ہیں مگر اس وقت یہاں سے چلو، اس وقت یہ غرق ہیں، کسی دوسرے وقت میں امر بالمعروف کریں گے۔ چنانچہ اپنے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور خیمہ اسی طرح کھڑا رہا۔ تو سماع کی یہ کیفیت تھی تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے مُریدین اور جو بیٹھنے والے تھے چونکہ سارے سچے تھے، ارباب حال تھے، اور سماع کسی حظِ نفس کے لئے نہیں تھا بلکہ ترقی مدارج کے لئے یا رفع قبض کے لئے تھا۔ اس سچائی کی وجہ سے خیمہ اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ اپنی جگہ درست تھے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی ڈانٹ ڈپٹ اپنی جگہ درست تھی۔ اس واسطے کہ وہ نظام شریعت کے قائم کنندہ تھے، انکی حیثیت پولیس اور فوج کی تھی۔ تو پولیس کا کام یہی ہے کہ قانون کے خلاف کوئی چیز دیکھے تو فوراً ڈانٹ ڈپٹ کرے۔

حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... اس کے ساتھ ساتھ دوسری کیفیت یہ تھی کہ جب حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کرائی کہ جا کے حکیم ضیاء الدین سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے تو حکیم صاحب نے اندر سے جواب بھجوایا کہ روک دو، میں بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ خواجہ نظام الدینؒ نے جواب بھجوایا کہ عرض کر دو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ اسی وقت حکیم ضیاء الدینؒ نے

اپنی پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کے خواجہ صاحبؒ اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے کے ساتھ قدم رکھیں ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحبؒ نے پگڑی کو اُٹھا کے سر پہ رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے اور اس شان سے تشریف لے گئے، آ کر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی موجودگی ہی میں حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آ گیا اور خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ الحمد للہ حکیم ضیاء الدینؒ کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا ہے کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

اپنے اپنے فرائض پہ دونوں قائم ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی پگڑی بھیجتے ہیں کہ جوتیوں سمیت قدم رکھ کے آئیں، ان کا یہ حال ہے کہ اسے سر کے اوپر رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے، میرے لئے سعادت ہے تو اِدھر ولی کامل ہیں جو طریقت میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور اُدھر عالم ربانی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کو پہچانتے ہیں اگر معاذ اللہ دونوں ناقص ہوتے...... وہ ان کے مقابل آتے اور وہ ان کے مقابل آتے۔ دنیا میں جھگڑا فتنہ پھیلنا شروع ہو جاتا تو کاملین کا فرق یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عظمت کو پہچانتے ہیں ایک دوسرے کی بڑائی اور بزرگی کو مانتے ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... انہیں حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت خواجہ صاحب کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو کسی نے ایک شعر پڑھا، خواجہ صاحبؒ پر وجد طاری ہوا اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دامن جھٹک کر کہا: بیٹھ جاؤ! خبردار! شریعت کی عظمت کو سامنے رکھو۔ خواجہ صاحبؒ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی نے شعر پڑھا، خواجہ نظام الدین پر پھر وجد طاری ہوا پھر کھڑے ہو گئے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے پھر دامن تھاما کہ بیٹھ جاؤ، آدابِ شرعیہ کو سامنے رکھو پھر بیٹھ گئے۔ تیسری دفعہ پھر کسی نے شعر پڑھا اور پورے وجد کے ساتھ خواجہ نظام الدین کھڑے ہوئے اور رقص کرنے لگے تو حکیم ضیاء الدینؒ بھی کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کے گردن جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو حکیم ضیاء الدینؒ سے پوچھا گیا کہ پہلے دو دفعہ میں تو تم نے دامن جھٹک کر خواجہ صاحبؒ کو بٹھا لیا اور تیسری دفعہ جب وہ کھڑے ہوئے تو تم بھی ان کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اگر بھلائی تھی تو پہلے کیوں روکا تھا؟ اور بُرائی تھی تو تیسری بار میں ہاتھ باندھ کے کیوں ساتھ ہو گئے؟ تو حکیم ضیاء الدینؒ نے جواب دیا کہ پہلی دفعہ جب خواجہ صاحبؒ کھڑے ہوئے تو انکی روح کو عروج ہوا، آسمانِ دنیا تک روح پہنچی، یہاں تک میری رسائی تھی میں پکڑ لایا اور کہا کہ تم فرشی ہو! بندگی کی صورت اختیار کرو، ایسا عروج مت اختیار کرو جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، وہاں سے پکڑ لایا۔ دوبارہ عروج ہوا تو پھر حضرت خواجہ صاحبؒ کی روح ساتویں آسمان تک پہنچی، میری بھی وہاں تک رسائی تھی تو پھر پکڑ کے لایا کہ اپنی حد پر قائم رہو زیادہ عروج میں مت آؤ۔ تیسری دفعہ عروج ہوا تو تجلیاتِ الٰہیہ سامنے تھیں...... میں بھی ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا، میں بدعتی کی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ تجلیاتِ الٰہیہ کے

سامنے کھڑا ہوا تھا۔

صوفیاء کیلئے علماء کی ذمہ داری......اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم ضیاء الدین خود بھی صاحب باطن تھے مگر ان کو شریعت کے نظام کو قائم رکھنے، اس کی بقاء اور اس کے استحکام کا کام سپرد تھا تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء کی مثال ہے جیسے مقربانِ بادشاہی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے دربار میں ہروقت حاضر ہیں۔ تو بادشاہ کے دربار میں لوگ بعض اوقات ایسی بے تکلفی کی باتیں کرتے ہیں کہ باہر آ کے وہ باتیں نہیں کر سکتے۔ بادشاہ کی موجودگی میں بے تکلفانہ کر گزرتے ہیں لیکن وہی باتیں اگر سڑک پر آ کر کریں گے تو پولیس کے آگے جوابدہ ہونگے۔ وہ چلاتے رہیں کہ ہم تو مقربانِ بادشاہی ہیں۔ پولیس کہے گی کہ بادشاہ کی مجلس میں جا کے جو چاہے کرو، منظر عام پر جب آ ؤ گے تو قانون کی پابندی کرنے پڑے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم قانون کی حفاظت کریں، جب تم مقامِ قرب میں پہنچو اور بادشاہی دربار میں موجود ہو تو جو تمہارا جی چاہے کرو وہ قانون سے بالاتر چیز ہے لیکن جب آ ؤ گے سڑک پر، جب آ ؤ گے میدان میں، جب آ ؤ گے لوگوں میں......تو یہاں قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔ ہم نہیں جانتے کہ تمہارا کیا حال ہے! کچھ بھی ہو مگر ہم قانون کے سپاہی ہیں تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء مقربانِ شاہی ہیں تو وہ اپنی بے تکلفی میں کچھ بھی کریں لیکن باہر آ کر کریں گے تو شریعت کے نظام کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

سماع کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط کا واقعہ......میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند جو صرف عالم ہی نہیں تھے عارف کامل بھی تھے، ربانی بھی تھے، درویش بھی تھے، صاحب کشف وکرامات اور اولیاء اللہ میں سے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دفعہ خلجے میں تشریف لے گئے۔ خلجے میں حضرت کے بہت سے مریدین اور متوسلین تھے تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو حضرت کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ان کے دیوان خانے میں عصر کے بعد حضرت کی مجلس ہوئی، چار پانچ سو آدمی حضرت کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، جنہوں نے مجھے یہ واقعہ سُنایا ان کا نام حاجی امیر شاہ صاحبؒ ہے، یہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص خدام میں سے تھے، مخصوص متوسلین میں سے تھے، انہوں نے واقعہ بیان کیا کہ حضرت کی مجلس تھی تو اس مجلس میں اچانک ان کا بھتیجا آ گیا۔ رنگ مست خان اس کا نام تھا، گلا نہایت بہتر پایا تھا، موسیقی کا بڑا بھاری استاذ تھا اور امیر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اس کی حالت یہ تھی کہ ایک دفعہ ہم دوست احباب جمع تھے، کچھ کھانے پکانے کا سامان ہو رہا تھا تو کچھ دوست گوشت دھو رہے تھے کچھ پیاز کاٹ رہے تھے اور کچھ لوگ پانی کے گھڑے بھر رہے تھے یعنی سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے تو رنگ مست خان آ گیا اور اس نے آ کر مکان کے دروازے میں داخل ہوتے ہی حافظ شیرازیؒ کی یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسے مستے کہ تاج دارانند ۔۔۔ خرابے بادۂ لعلے کہ ہوشیار انند

کہتے تھے کہ اس شان سے پڑھی ہے کہ ایسا سماں بندھا کہ جس کا چاقو پیاز میں تھا وہ پیاز ہی میں رہ گیا، جس کا

ہاتھ گھڑے پر تھا تو گھڑے پر رہ گیا، جو سل بٹے پر مصالحہ پیس رہا تھا اس کا ہاتھ بٹے پر رہ گیا جیسے معلوم ہو کہ سب پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی، لوگوں نے اپنے ہوش گم کر دیئے تو اس کی آواز اس غضب کی تھی۔

امیر شاہ صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں یہ رنگ مست خان آ گیا اور حضرت کی چار پائی پر پائنتیوں آ کے بیٹھ گیا۔ حضرت سرہانے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے حضرت کی پشت سے رنگ مست خان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ شروع کر دے۔ اس نے یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسے مستے کہ تاج دارانند

لیکن مست ''غلام نرگسے مستے'' تک آیا اور آگے چپکا ہو گیا اس کے بعد میرے پھوپھا نے حضرت ؒ کی پشت سے پھر اشارہ کیا کہ بھئی پڑھتا کیوں نہیں؟ اس نے پھر غزل شروع کی، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا پھر چپ ہو گیا۔ پھر میرے پھوپھا نے گھورا کہ پڑھتا کیوں نہیں؟ تو پھر اس نے لے باندھ کر یہ شروع کی اب کے صرف ''غلام'' کہہ کر رک گیا اور چپ ہو گیا...... یہاں تک کہ مجلس برخاست ہو گئی۔ تو امیر شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے کہا کہ کم بخت! اس دن تو تو نے اس طرح پڑھا کہ سماں باندھ دیا اور معلوم ہوا کہ سب پر سکتہ طاری ہو گیا ہے آج تجھ پر کیا مصیبت آئی تھی؟ اس نے کہا جو مجھ پر مصیبت آئی وہ تم نے نہیں دیکھی۔ کہا کیا مصیبت آئی؟ کہا کہ پہلی دفعہ جب میں غلام نرگسے مستے تک پہنچا ہوں تو حضرت نانوتوی ؒ کا ہاتھ بڑھا اور میری زبان پکڑ لی اب میں کیا کرتا چپ ہو گیا، پھر تم نے گھورا پھر میں نے شروع کیا، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا تو حضرت کا ہاتھ پھر بڑھا اور میری زبان پکڑ لی، میں مجبور ہو کر چپکا ہو گیا تیسری دفعہ تم نے گھورا، پھر شروع کیا اب کے ''غلام'' کہنے پایا تھا کہ پھر زبان پکڑ لی۔ انہوں نے کہا: کہ ہم نے تو نہیں دیکھا! کہا: خدا کی قسم تینوں دفعہ ہاتھ بڑھا اور میری زبان کھینچ لی۔ یہ تو اس نے کہا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خان صاحب کو (یعنی امیر شاہ صاحب) کو خطاب کر کے ایک جملہ فرمایا...... جس سے ان لوگوں کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے، فرمایا: کہ خان صاحب جس طرح سے میں ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے، اس کی رعایت کرنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اب اگر یہ غزل اس طرح سے ہو جاتی تو کہنے والے یوں کہتے کہ مولوی بھی گانے بجانے کے اندر مشغول ہو گئے یہ کوئی نہ دیکھتا کہ کونسی جائز حد تھی اور کونسی ناجائز حد تھی!۔

جائز اور مشتبہات میں خواص کی ذمہ داری...... تو خواص کو بہت سی جائز چیزیں بھی ترک کرنا پڑتی ہیں، اس بناء پر کہ کہیں عوام اس سے آگے نہ مبتلا ہو جائے۔ عوام کی خاطر بعضی جائز چیزیں ترک کر دینا پڑتی ہیں...... احتیاط سمجھ لیں، تقویٰ سمجھ لیں، بہر حال چھوڑ دینی پڑتی ہیں جیسے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَّبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِاسْتَبْرَأَ لِدِيْنِه ①

① الصحيح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ص: ٦ رقم: ٢.

حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام چیزیں بھی کھلی ہوئی ہیں، حلال وحرام کے بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، ان میں حلال ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے اور حرام ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے۔ متقی وہ ہے جو ان مشتبہات سے بچ جائے، جو بچ کر جائیگا وہ اپنے دین کو ہر بُرائی سے بری کر لے جائیگا۔ تو مشتبہات سے بچنا یہ تقوی کا ایک شعبہ ہے اور کاملین مشتبہات سے تو ضرور بلکہ بعض جائز چیزوں سے بھی بچ جاتے ہیں کہ لوگ حرام میں نہ مُبتلا ہو جائیں۔

عوام کو مکروہات سے بچانے کیلئے علماء کا جائز کو ترک کرنا...... امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اثر نقل کیا ہے اور اس کو حدیث مرفوع کہا ہے، سند جس درجے کی بھی ہو مگر بہر حال ایک چیز ہے جو قواعد شرعیہ کے بالکل مطابق ہے اور وہ اثر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب علماء جائزات کے حصول کی فکر میں پڑ جائیں گے تو عوام مکروہات کا ارتکاب کریں گے، جب علماء مکروہات کا ارتکاب کریں گے تو عوام حرام میں مبتلا ہوں گے اور جب علماء حرام چیزوں میں مبتلا ہوں گے تو عوام کفر میں مبتلا ہوں گے۔ اس واسطے سب سے زیادہ احتیاط خواص کے لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ عوام کی خاطر اور ان کو بچانے کی خاطر مکروہات تو مکروہات بعض جائز چیزوں کا بھی ترک کر دیں تا کہ ان کے جائزات کے ارتکاب کرنے سے عوام مکروہات کا ارتکاب نہ کرنے لگ جائیں تو حضرات اہل اللہ کی شان یہ تھی کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ جس طرح میں صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے اس کی رعایت رکھنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اگر یہ غزل آج ہو جاتی تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں تھا یہاں کوئی باجے گاجے نہیں تھے کوئی ہارمونیم نہیں تھا، کوئی ستار وغیرہ نہیں تھا۔ خوش آوازی سے ایک بات ہوتی مگر بہر حال مجلس مولوی کی تھی عوام یہ کہتے کہ گانا بجانا ہو رہا ہے وہ پھر اپنے لئے ستار بھی جائز کر لیتے۔ اس واسطے یہ اہل اللہ اتنی احتیاط برتتے ہیں۔

مقامِ علم و مقامِ اخلاق...... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مقام دو ہی ہیں؛ ایک علم کا مقام ہے اور ایک اخلاق کا مقام ہے۔ علم راستہ دکھلاتا ہے اخلاق چلنے کی قوت پیدا کرتے ہیں، دونوں چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تب آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ تو نبوت بھی درحقیقت دو ہی بنیادوں پر قائم ہے ایک کمالِ علمی ایک کمالِ اخلاقی، یہی دو چیزیں انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں اور یہی بنیادِ نبوت ہیں۔ جب یہ بنیاد نبوت کا معیار ہوئی تو اس سے خود سمجھ لیجیے کہ جو ذاتِ اقدس کمالِ علم میں اس رتبہ پر پہنچ جائے کہ اس رتبہ پر اور کوئی نہ پہنچا ہوا ہو اور اخلاقی کمال میں اس مقام پر پہنچ جائے کہ کوئی اس مقام پر بھی نہ آیا ہو تو وہی نبی سب سے بڑا نبی ہوگا، اس لئے کہ معیارِ نبوت جو کچھ تھا وہ اسمیں حدِ کمال پر آیا ہوا ہے۔

ذاتِ نبوی میں شانِ علم...... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو علم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ'' مجھے اگلوں کے اور پچھلوں کے تمام علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں جتنے پچھلوں کو علوم دیئے گئے...... تمام انبیاء جو جو علوم لے کر آئے ہیں

وہ سارے علوم میری ذات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تو اگلوں کے علوم یعنی انبیاءِ سابقین کے سارے علوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں اور پچھلوں کے علوم بھی یعنی قیامت تک جو آنے والے ہیں؛ علماء، فضلاء اور حکماء وغیرہ ان سب کے علوم بھی۔ ظاہر بات ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پروردہ ہیں، وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم سے ہی مستفیض ہیں، وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم، آپ ہی کی جوتیوں کے صدقے سے عالم عالم بنے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی جوتیوں کے صدقہ سے صدیق صدیق بنے، تو وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم۔ لیکن بتلایا گیا کہ پچھلے انبیاء کے جو علوم ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع کر دیئے گئے ہیں کہ جتنے اگلوں کے علوم تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں جمع ہیں اور جتنے پچھلوں کے علوم تھے وہ بھی ایک ذات میں جمع ہیں۔ تو ایک عظیم نکتۂ خیر اللہ نے پیدا کیا کہ اگلے اور پچھلے سارے علوم اس میں جمع کر دیئے گئے،

ذاتِ نبوی میں اجتماعِ علوم کی محسوس مثال ...... تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محسوس مثال علم کے لحاظ سے ایسی ہوگی جیسے کہ آپ اپنے اندر دیکھتے ہیں کہ چہرے پر آنکھ ہے تو آنکھ بھی عالم ہے مگر صورتا، رنگ کو دیکھے گی اور صورت وغیرہ کو پہچانے گی۔ آوازوں کا پہچاننا یہ آنکھ کا کام نہیں، ہاں کان ہیں وہ آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں کہ آواز اچھی ہے یا بُری، بلند ہے یا پست، تو کان آوازوں کے عالم ہیں، وہ صورتیں نہیں دیکھتے۔ ناک خوشبو اور بدبو کی عالم ہے وہ سونگھ کر بتلا دے گی کہ گلاب کا پھول ہے اور چنبیلی کا پھول ہے، لیکن ناک یہ چاہے کہ گلاب کی شکل دیکھ لے ...... یہ ناک کا کام نہیں ہے۔ زبان کا کام یہ ہے کہ وہ ذائقہ بتلائے کھٹا ہے یا میٹھا، یا نمکین ہے زبان کو اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تو آوازیں سُن لے تو زبان کا یہ کام نہیں ہے۔ تو اس چہرے میں آنکھ بھی موجود، کان بھی موجود، زبان بھی موجود اور ناک بھی موجود۔ دوسرے لفظوں میں گویا یوں کہا جائے کہ یہ علماء کی ایک بستی ہے اور ہر فن کا عالم الگ الگ ہے۔ آوازوں کا عالم کان ہے، صورتوں کی عالم آنکھ ہے، ذائقوں کی عالم زبان ہے، خوشبو اور بدبو کی عالم ناک ہے۔ یہ سارے علماء ہیں اپنے اپنے موضوع کا علم رکھتے ہیں۔ اور یہ اللہ کی صناعی اور حکمت ہے کہ اسی ایک بالشت کے چہرے میں ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں۔ کان میں اور آنکھ میں زیادہ سے زیادہ فرق ہے دو تین انچ کا، کان اور آنکھ میں کوئی زیادہ فاصلہ ...... میل دو میل کا نہیں ہے کہ کان آنکھ کے کاموں میں دخل نہ دے سکے، کان کو یہ موقع نہیں ہے کہ وہ آنکھ کا کام سرانجام دے۔ ملے ہوئے ہیں مگر اپنی حدود سے باہر قدم نہیں لے جا سکتے۔ تو ہر ایک اپنے اپنے علمی کام میں مشغول ہے۔ لیکن یہ سارے علوم کان، ناک، آنکھ، زبان کے ...... یہ خدا تعالیٰ نے حسِ مشترک میں جمع کر دیئے ہیں؛ جس کو ''اُمُّ الدِّ مَاغ'' کہتے ہیں۔ دماغ کا یہ جو ابتدائی حصہ ہے اس میں سارے علوم جمع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ آنکھ سے دیکھتے ہیں تو آنکھ تو دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہے لیکن صورت دماغ میں موجود رہتی ہے۔ اگر آنکھ میں صورت رہتی ہے تو پھر آنکھ نے اپنا کام جو ختم کیا تھا اور آنکھ پر پردہ آ گیا تھا تو صورت ماند ہو جانی چاہیے تھی، لیکن جس چیز کو آپ نے دیکھ لیا ہے دیکھنے کے بعد بھی آپ آنکھ بند کریں تب بھی

صورت آپ کے سامنے موجود رہتی ہے تو یہ کوئی خزانہ ہوگا جس میں یہ صورت جمع ہو جاتی ہے، وہی دماغ کا خزانہ ہے۔

آپ نے روٹی چکھ لی اور ذائقہ معلوم کر لیا لیکن جب کھانے پینے کا کام ختم ہو گیا تب بھی ذائقہ کا ایک اندازہ آپ کے قلب میں موجود ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں دستر خوان پر اتنے برس ہوئے میں نے کھانا کھایا تھا گویا اب تک وہی ذائقہ زبان میں موجود ہے تو یہ احساس کیسے ہے اب تک...... کیا یہ ذائقہ ابھی تک موجود نہیں ہے؟ کسی ذائقہ کا یاد رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ ذائقہ موجود ہے، کہ زبان نے ذائقہ چکھ لیا اور چکھ کر خزانے میں پہنچا دیا وہاں موجود ہے۔ آنکھ نے صورت کو دیکھ لیا اور صورت کو لے جا کے خزانے کے اندر جمع کر دیا، وہاں ساری صورتیں جمع ہیں اب جب آپ کا جی چاہے آپ انہیں دیکھ لیں۔ آپ نے اگر دِلّی کی سیر کی ہوگی جامع مسجد دیکھی ہوگی، لال قلعہ دیکھا ہوگا تو دیکھا تو ایک دفعہ تھا لیکن اگر دن میں دس بار اپنے ملتان میں بیٹھ کر دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار ؎ اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

بس جہاں گردن جھکائی پوری جامع مسجد سامنے موجود، پورا لال قلعہ سامنے موجود، تو کہیں تو جمع ہے...... تبھی تو سامنے ہو جاتا ہے، یقیناً اندر موجود ہے۔ تو یہ سارے حالات اندر کی کارگزاریاں ہیں اور جو کچھ انکی معلومات ہیں وہ آپ کے ذہن میں یا دماغ میں جمع ہیں تو یہ ام الدماغ ہے۔ یہ اُن سارے حالات کا مجموعہ ہے، اسمیں دیکھنے کی طاقت بھی ہے، سُننے کی طاقت بھی ہے، چکھنے کی طاقت بھی ہے اور خوشبو بدبو کے ادراک کی طاقت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سارے جب اپنا کام کر گذرتے ہیں تو ان کے محسوسات دماغ کے اندر جمع رہ جاتے ہیں تو خزانہ اصل ہوا، بلکہ غور کیا جائے تو دیکھنے میں آنکھ اصل نہیں ہے بلکہ دماغ ہی دیکھنے میں اصل ہے۔ دماغ متوجہ ہوتا ہے تب آنکھ دیکھتی ہے اگر دماغ متوجہ ہی نہ ہو آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ کُھلے بندوں آپ بازار چلے جائیں جہاں تماشے ہو رہے ہوں جب آپ واپس آئیں گے تو دوسرا بھائی کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑے تماشے ہو رہے تھے، آپ کہیں گے کیسا تماشہ؟ وہ کہے گا: یہ سب جلوس تھے اور رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں...... لیکن آپ کہتے ہیں: میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا، وہ کہے گا: بندۂ خدا! آپکی آنکھ کُھلی ہوئی تھی کہ نہیں؟ تو آپ یہی کہیں گے کہ اوہو! میں اپنے دھیان میں ہی غرق رہا مجھے پتہ ہی نہیں چلا کیسا جلوس، معلوم ہوا کہ دیکھنے والا آنکھ نہیں ہے، آپ کا دل دیکھنے والا ہے، دل متوجہ نہیں تھا تو آنکھوں سے آپ کو کچھ نظر نہیں آیا تو اصل میں دیکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے، چکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے اور سُننے کا خزانہ اندر موجود ہے، یہ کان اور ناک وغیرہ محض آلات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کی خدانخواستہ آنکھ پھوڑ دی جائے تو دماغ میں اس سے خلل نہیں آتا، کان نہ رہیں تو دماغ میں نقصان نہیں ہوتا لیکن دماغ پر لاٹھی ماردی جائے تو آنکھ بے کار، پاؤں بھی بیکار اور ناک بھی بے کار پھر کوئی حواس اس کے اندر باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ جب خزانہ ٹوٹ گیا جہاں سے فیض پہنچ رہا تھا تو کان، ناک، آنکھ تو سب بے کار ہو گئے۔ لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہے تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں، اس واسطے کہ وہ اصل خزانہ ہے۔

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو غور کیجئے کہ اس عالم میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے، ہر نبی کو کچھ خصوصی علوم عطاء کئے گئے ہیں، لیکن دین ایک ہی دیا گیا۔ مگر دین کے بتلانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مختلف علوم دیئے گئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اساء وصفات کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① یوسف علیہ السلام کو ملک گیری اور خوابوں کی تعبیر کا علم دیا گیا: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ② حضرت خضر علیہ السلام کو علم لَدنی دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ﴾ ④ سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر کا علم دیا گیا کہ پرندوں کی بولیاں جانتے تھے: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑤ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے۔ تو سارے انبیاء ایسے ہیں کہ کوئی آنکھ ہے، کوئی ناک ہے اور کوئی کان ہے، مختلف علوم کے حامل ہیں۔ لیکن جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اُمّ الدماغ کی ہے کہ سارے حواس کا علم لا کر اس دماغ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

دماغ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا دماغ ہی نہ رہے تو آنکھ، ناک اور کان وغیرہ کچھ نہیں رہتا لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہیں تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تو سارے انبیاء گذر چکے ہیں مگر دماغ اسی طرح قائم ہے۔ لیکن خدانخواستہ دماغ نہ ہوتا تو نہ آنکھ رہتی، نہ کان رہتے اور نہ ناک رہتی، کوئی چیز نہ رہتی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم درحقیقت خزانۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفاد اور نکلے ہوئے ہیں۔ اصل نکتۂ خیر حق تعالیٰ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے فیضان سے انبیاء میں نبوتوں کے علوم آئے یعنی سبب آپ بنائے گئے ہیں۔ آپ کے ذریعہ سے اور آپ کے سبب سے انبیاء علیہم السلام کو علوم عطاء فرمائے گئے ہیں۔

نبی الانبیاء پر ایمان لانے کیلئے انبیاء کو پابند کیا گیا ...... حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''خصائص کبریٰ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں: ''اَنَا نَبِیُّ الْاَنْبِیَاءِ'' اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں میں نبیوں کا نبی ہوں، میں نبیوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے اور کہا ہے کہ تم اس نبی پر ایمان لاؤ، فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ⑥ اللہ نے نبیوں سے عہد لیا، کیا عہد لیا؟ کہ جب میں تمہیں کتاب بھی دوں، حکمت بھی دوں، نبوت بھی عطا کروں اور پھر وہ رسول عظیم الشان...... کونسا؟ وہ جو تم سب کی تصدیق کرے، جو کچھ میں نے تمہیں علوم دیئے ہیں ان سب کی تصدیق کرے تو تمہارا کام کیا ہوگا؟ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ کہ تم اس کے اوپر ایمان

---

① پاره: ۱، سورة البقرة الآية: ۳۱. ② پاره: ۱۳، سورة يوسف، الآية: ۱۰۱. ③ پاره: ۱۵، سورة الكهف، الآية: ۶۵.
④ پاره: ۱۷، سورة الأنبياء، الآية: ۸۰ ⑤ پاره: ۱۹، سورة النمل، الآية: ۱۶. ⑥ پاره: ۳، سورة آل عمران، الآية: ۸۱.

لاؤ، اگر زمانہ پاؤ تو ایمان لے آؤ اور نہ پاؤ تو اپنی قوموں کو ہدایت کرو کہ ایمان لائیں، یہ بھی تمہارا ایمان لانا ہے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ آپ پر ایمان لانے کا نبیوں کو پابند کیا گیا ہے۔

اصل الاصل ایمان صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اصل میں ایمان نبی کا ہوتا ہے۔ مؤمن جو ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کا عکس ہوتا ہے۔ ہم تم جو مؤمن ہیں اصلی مؤمن نہیں ہیں، اصلی مؤمن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کے طفیل سے ہم ساروں پر ایمان کا عکس پڑ گیا تو ہم تم بھی مؤمن نظر آنے لگے۔ بالاستقلال ہمارا ایمان نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے تابع محض ہے کیونکہ اصل حقیقی مؤمن آپ ہیں اور آپ کے ایمان کی چمک اور روشنی جس پر پڑ گئی وہ مؤمن کہلانے لگا تو اصل میں ایمان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ ہمارے ایمان کا وجود تابع ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے وجود کے۔

بالکل اسی طرح جیسا کہ آفتاب نکلے اور مختلف دھوپوں کے ٹکڑے آپ دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں کوئی گول ہے، کوئی چوکور ہے، کوئی مثلث ہے اور کوئی مربع ہے تو اگر دھوپ سے پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ تو یوں کہے گی کہ آفتاب کا جز اور آفتاب کا ایک حصہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خود اصلی وجود کچھ نہیں، وجود تو آفتاب کا ہے اس کی وجہ سے میرا وجود بھی نظر آتا ہے۔ میں خود آفتاب سے کٹ کر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ میرا وجود اسی وقت تک قائم ہے جبتک کہ میں آفتاب کی کرنوں سے وابستہ رہوں۔ اگر میں اس سے کٹ جاؤں تو میرا وجود ختم ہو جائے۔

تو مؤمن کے ایمان کا وجود اصل میں نبی کے ایمانی وجود کے تابع ہے۔ تو جب انبیاء علیہم السلام مؤمن بنائے گئے اور ہدایت کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ تو ایسی صورت بن گئی کہ حقیقی ایمان صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور آپ کے فیضان سے پھر انبیاء علیہم السلام کو بھی ایمان عطاء کیا گیا۔ لہٰذا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و ایمان کا ''نکتۂ خیر'' ہیں۔

تو اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ **اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ** اگلوں کے...... یعنی سارے انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے ہیں وہ میرے سینے میں جمع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان سے دوسروں کو پہنچائے گئے ہیں۔ آپ حسِ مشترک اور ام الدماغ ہیں۔ اور انبیاء مثل آنکھ، ناک اور کان کے ہیں۔ جس کسی کو بھی کوئی علم ملا...... اس علم کا فیض یہاں سے پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں: "**عُلِّمَ اٰدَمُ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا كَمَا عُلِّمْتُ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**" آدم علیہ السلام کو سارے اسماء و صفات کا علم دیا گیا جیسا کہ سارے اسماء و صفات کا مجھے علم عطا کیا گیا ہے۔ ①

① کنز العمال، ج: ۱۲ ص: ۱۸۵، رقم: ۳۴۵۸۸ (الدیلمی عن ابی رافع)

تعبیر خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ علمی......حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیرِ خواب کا علم دیا گیا اور قرآن کریم میں متعدد واقعات خواب کی تعبیر کے آئے ہیں جو یوسف علیہ السلام سے وابستہ ہیں ۔ یہ بڑا عجیب علم ہے لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو آپ نے فقط خوابوں کی تعبیر ہی نہیں دی بلکہ فنِ تعبیر کے اصول بھی بتلا دیئے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت کے اندر بڑے بڑے مُعَبِّر بن گئے ۔ تعبیر خواب کے امام پیدا ہو گئے ، بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں ۔ تو یوسف علیہ السلام نے تعبیریں بتلائیں اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب کی تعبیر کے اصولِ کُلّی بتلائے ۔ اس سے تعبیر دینے والے تیار ہو گئے جو کہ لاکھوں کی تعداد میں گذرے ہیں ۔ یہ ایک مستقل علم اور فن بن گیا۔

تعبیر خواب کے عجائبات

واقعہ ۱: خواب میں آگ دیکھنا......امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ حضرت! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں ۔ فرمایا کہ جلدی جا اور اپنے گھر سے بال بچوں اور سامان کو نکال دے ، تیرا گھر گر پڑے گا۔ یہ گیا، جلدی جلدی سامان نکالا ، بیوی بچوں کو نکالا ، ساری چیزیں باہر نکالیں آخر چند گھنٹے کے بعد سارا مکان اوپر سے نیچے آن پڑا۔ تعبیر ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ ماہ کے بعد پھر ایک شخص آیا اور اس نے کہا: کہ حضرت! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: چار پائی کے نیچے کھدائی کر! تجھے سونا ملے گا۔ کھدائی کی تو دیکھا کہ لاکھوں روپے خالص سونا، زرِ سُرخ ملا اور وہ شخص مالدار ہو گیا۔

لوگوں نے امام ابن سیرینؒ سے عرض کیا کہ ایک شخص نے یہی خواب دیکھا آپ نے اس کا تو گھر گروا دیا اور دوسرے نے وہی خواب دیکھا تو اُسے خزانہ دلا دیا۔ ایک نے کیا قصور کیا تھا اور دوسرے نے کونسا انعام کا کام کیا تھا، خواب تو ایک ہے! فرمایا کہ پہلے نے گرمی کے موسم میں خواب دیکھا تھا اور گرمی میں چار پائی کے نیچے آگ دیکھنا یہ انہدام بنیاد کی دلیل ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر جائے گا۔ دوسرے نے یہ خواب دیکھا سردی کے موسم میں اور سردی میں چار پائی کے نیچے آگ انتہائی نعمت اور خوشگوار چیز ہوتی ہے اور اس کی آگ کی صورت سونے کی صورت کے مشابہ ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دیدی کہ سونا ملے گا۔ تو گویا فنِ تعبیرِ خواب کے اصول ہیں انہیں اصولوں کی رو سے تعبیریں منقّٰی ہو جاتی ہیں واضح ہو جاتی ہیں۔

واقعہ ۲: امام مالکؒ کا خواب اور ابن سیرین کی تعبیر......انہی ابن سیرینؒ اور امام مالکؒ کا زمانہ ہے۔ امام مالکؒ جلیل القدر امام ہیں، تابعی بھی ہیں اور صاحبِ مذہب ہیں ۔ امام مالکؒ کی حالت یہ تھی کہ مدینہ منورہ سے انتہائی محبت تھی اور مدینہ کی محبت میں غرق تھے ۔ درحقیقت محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی ، اس کی وجہ سے امام مالکؒ کو مدینہ کی ایک ایک چیز عزیز تھی ، مدینہ کی زمین کا ایک ایک ذرّہ عزیز تھا اور یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے

میں مدینہ کی زمین میں دفن ہو جاؤں۔اس ڈر کی وجہ سے نفلی حج ادانہیں کرتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر میرا انتقال نہ ہو جائے۔ یہ چاہتے تھے کہ یہیں انتقال ہو اور یہیں دفن ہو جاؤں۔ جی چاہتا ہے حج نفل ادا کرنے کو مگر اس ڈر کی وجہ سے نہیں جاتے تھے۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دربار ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دربار میں حاضر ہیں تو بڑے درد والتجاء سے عرض کیا اور بڑی لجاجت سے کہا: کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور اسی ڈر کے مارے حج نفلی نہیں ادا کرتا کہ مدینہ سے باہر جا کے کہیں میرا انتقال نہ ہو جائے اور مدینہ سے باہر دفن نہ کر دیا جاؤں تو مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ ابھی عمر کے کئی برس باقی ہیں تو ہر سال نفلی حج ادا کرلیا کروں گا۔ اس لئے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر اس طرح پانچ انگلیاں سامنے کر دیں اور ادھر انکی آنکھ کھل گئی۔ امام مالکؒ حیران کہ پانچ انگلیوں سے مراد آیا یہ ہے کہ پانچ ماہ تمہاری عمر کے رہ گئے ہیں! یا پانچ برس مراد ہیں! یا پانچ دن مراد ہیں! یا پانچ ہفتے مراد ہیں! میں نے عمر کی مدت پوچھی تھی آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں...... اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ ہفتے مراد ہیں! پانچ ماہ مراد ہیں! یا پانچ برس!۔

اس لئے ایک آدمی کو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا تا کہ اس خواب کی تعبیر پوچھ کر آئے مگر یہ تاکید کر دی کہ نام نہ لینا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے، یوں کہنا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے، میرا نام نہ لیا جائے، ذکر نہ کیا جائے۔ یہ خادم ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایک نیک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس نے پوچھا کہ میری عمر کتنی باقی رہ گئی ہے؟ آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں تو اس خواب دیکھنے والے نے تعبیر پوچھی ہے۔امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: اس شخص نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ فرمایا: کہ یہ خواب بہت بڑا عالم ہی دیکھ سکتا ہے، جاہل تو جاہل معمولی علم کا آدمی بھی یہ خواب نہیں دیکھ سکتا، یہ خواب کسی بڑے عالم کا خواب ہے اور مدینہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ تو کیا مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب یہ چپ ہو گیا فرمایا: کہ جاؤ اس سے اجازت لے کر آؤ آکر بتاؤ! تب میں تعبیر بتلاؤں گا وہ شخص واپس آگیا۔ اس نے جا کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: کہ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں، اس واسطے (نام ظاہر کرنے کی) اجازت دے دیجیے! فرمایا: اچھا میرا نام لے دو۔ اس نے آکے نام لے دیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خواب دیکھا ہے۔

فرمایا کہ امام مالکؒ ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے یہ چھوٹے موٹے عالم کا کام نہیں تھا کہ یہ خواب دیکھتا۔ فرمایا: جا کر امام مالک کو تعبیر بتلا دو کہ تم نے اپنی عمر پوچھی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ انگلیاں دکھلائیں...... تو نہ پانچ

برس مراد ہیں، نہ پانچ مہینے مراد ہیں، نہ پانچ ہفتے مراد، بلکہ اشارہ ہے حدیث کی اس روایت اور قرآن کی اس آیت کی طرف هِيَ مِنْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ ① کہ کسی کی موت کا وقت ان پانچ چیزوں میں سے ہے کہ جن کا علم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم کہ کب آئے گی، کسی کو پتہ نہیں دیا گیا کہ کب آنے والی ہے اور بارش کی اصلیت وحقیقت کہاں سے ہے، اس کا بتدائی سرچشمہ کون ہے، کہاں سے چلتی ہے؟ اللہ کے سوا دوسروں کو پتہ نہیں ہے۔ اسباب کے درجے میں ہم کچھ پتہ چلالیں کہ مون سون آئے گا وہ برسے گا اور بادل بنیں گے...... لیکن خود مون سون کیسے بنا! اس کے اوپر کا سرچشمہ کیا ہے اور اصل کی اصل کیا ہے! کس طرح پانی کی تکوین ہوئی؟ یہ سب اللہ ہی جانتا ہے۔

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ اور ان اصولوں سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ لڑکا بنے گا یا لڑکی بنے گی...... لڑکا ہوگا یا لڑکی! کسی جدید خبر گش سے کسی کو معلوم ہو جائے! یہ ممکن ہے، لیکن ان اصولوں کی اطلاع کہ لڑکا اور لڑکی رحمِ مادر میں کس طرح بنتے ہیں! یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کسی شخص کو پتہ نہیں ہے کہ کل کس زمین میں وہ دفن کیا جائیگا! تو امام مالک کو کہہ دینا جاکے، کہ پانچ انگلیوں سے پانچ دن، پانچ سال یا پانچ مہینے مراد نہیں ہیں بلکہ پانچ اصول مراد ہیں کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ کس زمین میں کون دفن ہوگا! کس زمین میں کس کا انتقال ہوگا! ۔تو امام ابن سیرینؒ نے یہ تعبیر دی اور فرمایا کہ امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں، اس واسطے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ علمی جواب دیا ہے کہ ہر عالم اس خواب کی تعبیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیریں دی ہیں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن وحدیث کی رُو میں تعبیر کے اصول قائم کر دیئے کہ جس سے تعبیر خواب ایک عظیم فن بن گیا اور اس سے بڑے بڑے امام بن گئے۔ بڑی بڑی کتابیں اس فن کے اندر لکھی گئیں۔ امام ابن سیرینؒ کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیریں اور اصولوں کو ایک کتاب کے اندر جمع کیا گیا ہے۔ دو بڑی ضخیم جلدیں ہیں ''تَأْثِيْرُ الْمَنَامِ فِيْ تَعْبِيْرِ الْمَنَامِ'' اس میں ہزاروں خوابوں کی تعبیریں ذکر کی گئی ہیں اور وہ اصول ذکر کئے گئے ہیں جن کے ذریعے خواب کی تعبیریں نکالی جاتی ہیں۔ ③ تو ابن سیرینؒ بڑے امام ہیں ان کے بعد بڑے بڑے علماء اور بھی گزرے جو بہترین تعبیریں دینے والے ہیں۔

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب سوال جبرئيل النبي صلى الله عليه وسلم عن الايمان والاسلام، ج: ١ ص: ٨٧ رقم: ٤٨.

② پاره: ٢١، سورة لقمان، الآية: ٣٤.

③ یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہو کر تعبیر الرؤیا کے نام سے اسلامی کتب خانوں میں عام دستیاب ہے۔

واقعہ۳: نواب صدیق کا حضور کی امامت کرنا...... قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے، مشہور تھے کہ ادھر تعبیر دی اور ہاتھ کے ہاتھ تعبیر کے مطابق واقعہ پیش آجاتا۔ ان کے زمانے میں ایک شخص نے خواب دیکھا جو ایک نوجوان اہل حدیث تھا اس نے خواب دیکھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا زمانہ ہے اس زمانے میں قاضی محمد ایوب صاحب بھوپال کے قاضی القضاۃ ہیں۔ ان کے دفتر میں وہ نوجوان اہل حدیث ملازم تھا۔ قاضی صاحب دورے پر گئے بھوپال سے کوئی چالیس میل کے فاصلہ پر پڑاؤ تھا۔ اس نے خواب دیکھا اور قاضی صاحب کے پاس آ کے ذکر کیا کہ حضرت میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ نماز کیلئے ایک بہت بڑی جماعت کھڑی ہوئی ہے، لاکھوں آدمی ہیں، صفیں بندھی ہوئی ہیں اور صفِ اولیٰ میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور نواب صدیق حسن خاں امامت کرا رہے ہیں۔ یہ میں نے خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر کیا ہے؟

تو وہ نوجوان یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اسمیں اشارہ ہوگا نواب صدیق صاحب کی کسی فضیلت کی طرف! کسی منقبت، بزرگی اور بڑائی کی طرف...... جو امامت کرا رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا: کہ کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ کہا کہ حضرت واقعی! فرمایا: کہ اگر واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بھی چُپکا ہو گیا، اس کے ذہن میں جو بات تھی تعبیر اس کے برعکس آئی کہ اگر واقعی ایسے دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں فوت ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے ان کی بیماری چل رہی تھی۔ سب لوگ دوڑ گئے اور ماتمی جنازہ بن گیا، تین دن ریاست کی طرف سے ماتم رہا۔ تین دن کے بعد یہی اہل حدیث نوجوان قاضی صاحب کے پہنچا کہ حضرت تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوئی، جیسے تعبیر دی تھی وہ واقعہ ہو گیا...... لیکن آپ نے خواب کی یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب کی کوئی بڑائی، کوئی عظمت اور کوئی فضیلت ظاہر ہوگی، ان کو امام کے درجے پر دکھلایا گیا تھا؟ لیکن آپ نے بالکل برعکس تعبیر دی، یہ تعبیر آپ نے کیسے سمجھی؟۔

سُبحان اللہ! عجیب اصول بیان کیا ہے، فرمایا: کہ میں نے اس سے یہ تعبیر سمجھی کہ نبی کی موجودگی میں کسی کو امامت کا حق نہیں ہے، اگر نماز میں نبی کے آگے کوئی ہوگا تو جنازہ تو ہو سکتا ہے زندہ نہیں ہو سکتا...... کہاں پہنچا دماغ؟ یہ تعبیر اصول کو سامنے رکھ کر دی تو بڑے بڑے مُعبّر اس اُمت کے اندر گذرے ہیں۔

واقعہ۴: یعقوب نانوتوی کا خواب اور قاسم نانوتوی کی تعبیر...... اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند بھی فنِ تعبیر خواب میں مشہور تھے کہ اِدھر تعبیر دی اِدھر واقعہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہو جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ عقلی دلائل بھی ہوتے۔ دلائل سے تعبیر دیتے کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہونی چاہیے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور فقط عالم ہی نہیں تھے عارف باللہ اور کامل اولیاء اللہ میں سے تھے اور صاحبِ کشف و کرامت لوگوں میں سے تھے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائی مولانا نانوتوی صاحب کی خدمت میں خواب پیش کیا۔ نانوتہ میں ہی خواب دیکھا، جامع مسجد میں نماز پڑھی اور حضرت نانوتوی سے عرض کیا کہ بھائی صاحب! میں نے خواب دیکھا ہے تعبیر کچھ سمجھ نہیں آئی۔

خواب یہ ہے کہ میں اپنے گھر سے چلا تو میں نے اپنے ساتھ دنبے کی شکل کا بھینسا دیکھا، جیسے بڑا...... بھینسا ہوتا ہے، ایسا وہ دنبہ ہے، وہ میرے مدّ مقابل آیا اور میرا راستہ روک لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینگ پکڑ لئے، میری اور اس کی کشاکشی ہو رہی ہے کبھی وہ مجھے دوگز دھکیل کے پیچھے کر دیتا ہے اور کبھی میں زور لگا کے اسے دھکیل دیتا ہوں اور وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ غرض اسی طرح کی کشاکشی ہوتی رہی...... اسی کشاکشی میں اس نے میری بائیں ران پر سینگ مارا تو دو تین قطرے خون کے نکل پڑے اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر انہوں نے عرض کیا: اس کی کیا تعبیر ہوگی؟ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حضرتؒ نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ''بنی اعمام'' میں کسی چھوٹی بچی کا انتقال ہو جائے گا۔ یہ تعبیر دے ہی رہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں فلاں صاحب کے جو بچی پیدا ہوئی تھی اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ فرمانے لگے لیجیے بھائی صاحب! تعبیر بھی آگئی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حیران، عرض کیا: کہ حضرت! تعبیر تو واقعی ہوگئی، مگر آپ اس سے کیسے سمجھے کہ ''بنی اعمام'' میں سے، چچا تایاؤں کی اولاد میں سے ایک بچی کا انتقال ہو جائے گا؟۔

تب حضرت نے اس کے دلائل بیان کرنا شروع کیے۔ یعنی خواب کا مسئلہ ہے اور اسے دلائل سے ثابت کر رہے ہیں۔ فرمایا: کہ آپ نے ایک دُنبے یا مینڈھے کو دیکھا جو بھینسے کی شکل میں ہے! پھر فرمایا: حدیث میں فرمایا گیا ہے: کہ موت کو قیامت کے دن مینڈھے کی شکل میں متشکّل کیا جائیگا اور جنت و دوزخ کے درمیان میں لاکر اس کو کھڑا کیا جائیگا۔ جنت والوں کو منادی کی جائیگی کہ سب جنت کی شہرِ پناہ پر آجاؤ تو جنت والے ڈریں گے کہ کہیں جنت سے ہمیں نکالا تو نہیں جا رہا! ڈرتے ڈرتے شہر پناہ کے اوپر آجائیں گے۔ پھر جہنم والوں کو منادی کی جائے گی کہ تم بھی شہر پناہ کے اوپر آجاؤ! تو وہ اس توقع میں خوش ہو کر آئیں گے کہ شاید ہمیں جہنم سے نکلنے کی اجازت ہو جائے۔ تو دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں گے بیچ میں ایک مینڈھا کھڑا کر دیا جائیگا۔ پوچھا جائے گا: کہ اے اہلِ جنت اور اہلِ نار! جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ کہیں گے کہ: یہ موت ہے۔ اس لئے کہ سب کو سابقہ پڑ چکا ہوگا تو یہی...... مینڈھے کی شکل میں موت ہوگی، جس سے سلبِ روح ہوتی ہے۔ پھر اس مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا، فرمایا جائے گا کہ اب موت کو موت آچکی ہے۔ اے اہلِ جنت! اب موت کا کوئی سوال نہیں، جنت میں ابدالآباد کی زندگی بسر کرو۔ اور اے اہلِ جہنم! اب موت کو موت آگئی ہے، ابدالآباد تک تم اسی جہنم میں رہو۔ تو جنت والوں کو اتنی خوشی ہوگی کہ اگر موت کو موت نہ آگئی ہوتی تو شاید شادیٔ مرگ سے وہ مر جاتے اور جہنم والے اتنے حسرت زدہ ہوں گے کہ اگر موت کو موت نہ آگئی ہوتی تو شاید حسرت و غم میں مر جاتے۔ بہر حال حضرتؒ نے مولانا

یعقوب کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ: موت کو مینڈھے کی شکل دی جائے گی اور آپ نے مینڈھے کو دیکھا اور سینگ پکڑ کر مقابلہ کیا تو آپ کا یہ مقابلہ موت سے ہوا۔ فرمایا: خواب کی تعبیر کا پہلا جز تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ عرب میں عربی زبان میں جب بھی قبیلوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو جدّی رشتوں کو بطن کہتے ہیں، یعنی پیٹ کا حصہ۔ دادا پردادا وغیرہ یہ بطون کہلاتے ہیں اور بنی اعمام یعنی چچا تائے کے لڑکے، ان کو فخذ سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ران کا حصہ۔ تو فرمایا کہ آپ کا موت سے مقابلہ ہوا اور مقابلہ میں موت کا سینگ آپ کی ران میں لگا اس سے میں سمجھا کہ بنی اعمام میں موت واقع ہوگی، جدی رشتہ والوں سے کوئی نہیں مرے گا بلکہ چچا تائے کے رشتہ والوں میں سے کوئی مرے گا اور فرمایا کہ بائیں ران سے خون نکلا تو اس سے میں سمجھا کہ مرنے والی لڑکی ہوگی کیونکہ لڑکی بائیں جانب کی پیدائش ہے اور فرمایا کہ خون کے صرف دو تین قطرے نکلے اس سے میں سمجھا کہ کوئی چھوٹی عمر کی بچی ہوگی۔ ان سارے مقدمات کو ملا کر میں نے تعبیر دی اور وہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوگئی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف کتنے خوابوں کی تعبیریں ہی ارشاد فرمائی ہیں بلکہ قرآن وحدیث میں ایسے اصول ارشاد فرمائے ہیں جس سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تعبیر دینے والے پیدا ہوگئے اور یہ ایک مستقل فن بن گیا۔

واقعہ ۵: تعبیرِ خواب میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی باریک بینی...... وہ بات یاد آگئی تو اسے بھی کہہ دوں پھر آگے چلوں۔ حضرت نانوتویؒ کی ہی خواب کی تعبیر کا ایک اور واقعہ بھی یاد آگیا۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ جو حضرتؒ کے بھائی تھے۔ وہ ایک دن تشریف لائے کہ بھائی صاحب! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ خواب یہ ہے کہ بریلی کی جانب سے کچھ بطخیں اُڑتی ہوئی آئیں اور میرے مکان پر آکر اُتر گئیں اس کی کیا تعبیر ہوئی؟

حضرت نے فرمایا کہ بھائی جان! اگر آپ مٹھائی کھلائیں تو ہم آپ کو بیس روپے مہینہ کی ملازمت دلا دیں اور اگر مٹھائی نہیں کھلاتے تو پھر گیارہ روپے مہینہ کی ملازمت، انہوں نے کہا کہ حضرت میں مٹھائی کھلاؤں گا۔ تو فرمایا کہ: اس کی تعبیر یہ ہے کہ بریلی میں بیس روپے ماہوار پر تمہاری نوکری ہو جائے گی۔ یہ تعبیر دی چار پانچ دن کے بعد مولانا محمد منیر صاحبؒ کے پاس ان کے کسی عزیز کا خط آیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ پر کچھ معاشی تنگی ہے، خرچہ نہیں چل رہا تو میں نے فرضی طور پر آپ کے نام کی ایک درخواست دیدی اور وہ قبول ہوگئی، بیس روپے مہینہ کی ملازمت آپ کی ہوگئی ہے آپ چلے آئیں۔ وہ حضرت نانوتویؒ کے پاس آئے کہ وہ جو تعبیر دی تھی...... تو واقعی بیس روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔ مگر اول تو یہ عرض ہے کہ آپ نے اس خواب سے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟

تو حضرتؒ نے واقعی عجیب دلیل بیان کی، فرمایا کہ: تم نے بریلی سے بطخیں آتی ہوئی دیکھیں، اس سے تو میں یہ سمجھا کہ بریلی کی طرف سے رزق حلال آئے گا اور تمہارے گھر میں رزق آگیا۔ پھر بطخوں کو تم نہیں لائے از خود آئیں اس سے میں یہ سمجھا کہ بلا طلب کے تمہاری ملازمت ہو جائے گی تو یہ بھی صحیح نکلا کہ تم نے درخواست بھی نہیں

دی تھی۔ اب یہ کہ ملازمت بیس روپے مہینہ کی ہو یا گیارہ روپے کی ہو! تو فرمایا: اس میں صورتِ حال یہ ہے کہ "بط" کا لفظ عربی میں تو مشددہ ہے، یعنی ایک ب اور دو ط سے اور فارسی میں یہ مخفف ہے ایک ب اور ایک ط سے۔ تو فارسی میں بط کہتے ہیں اور عربی میں بطّ کہتے ہیں۔

اب تعبیر دینے والے کو یہ اختیار ہے کہ فارسی کا لفظ لے لے یا عربی کا تو اگر میں فارسی کا بط لے لیتا تو اس میں ایک ب اور ایک ط ہے تو ب کے عدد دو اور ط کے عدد نو ہیں تو نو ۹ اور دو ۲ ملکر گیارہ ہوئے۔ اور عربی کا بط لیتا تو ایک ب اور دو ط ہوئیں تو ب کے دو، ایک ط کے نو اور دوسری ط کے بھی نو...... تو نو اور نو ملکر اٹھارہ، اٹھارہ اور دو بیس ہوگئے۔ معبر کو اختیار ہے کہ وہ فارسی کا بط لے یا عربی کا بط لے لے۔ اس واسطے میں نے یہ تعبیر دی تھی۔ یہ باریک بینیاں اسوقت تک نہیں ہوسکتیں جب تک تعبیرِ خواب کے اصول ذہن کے اندر نہ ہوں تو تعبیرِ خواب میں علم کی بھی ضرورت ہے، موسم کی پہچان کی بھی ضرورت ہے اور اعداد و شمار کے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ شریعت نے قرآن و حدیث میں بہت سے اصول قائم کر دیئے ہیں اور یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات میں علوم کی کثرت...... تو انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے وہ حدِ کمال کیساتھ جمع ہو کر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں ...... خواہ تعبیرِ خواب کا علم ہو، خواہ مَنطِقَ الطَّیر پرندوں کی بولیوں کا علم ہو اور خواہ اسماء و صفات کا علم ہو...... یہ سب علوم اسی ذات بابرکات میں جمع کر دیئے گئے ہیں اور آپکے بعد جو علماء آنے والے ہیں وہ آپ ہی کے در کے فیض یافتہ ہونگے، وہ تو عالم ہی اسلئے ہونگے کہ آپکا فیض پہنچ رہا ہے۔ تو ایک ذات بابرکات میں سارے علوم کا ایک جھمگٹ ہے۔ جس خصوصیت سے آپکو علم دیا گیا وہ اوروں کو نہیں ملا تو اور انبیاء کی حقیقت فقط انبیاء کی ہے وہ صرف نبی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں اور ختمِ نبوت کے معنی منتہاءِ نبوت کے ہیں کہ نبوت کی انتہا ہوگئی۔

یعنی سارے درجاتِ نبوت اس ذات اقدس کے اُوپر پورے ہوگئے۔ ظاہر بات ہے کہ جو خاتم النبیین ہوگا وہ تمام اوصاف و کمالات میں بھی خاتم ہوگا۔ تو خاتم العلوم بھی آپ کو کہا جائے گا کہ تمام علوم کے درجات آپکے سینے میں جمع کر دیئے گئے۔ آپ کو خاتم الاخلاق بھی کہا جائے گا کہ اخلاق کے سارے نمونے اور کمالات آپکی ذات بابرکات میں جمع کر دیئے گئے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ جب نبوت کا معیار اور مقامِ نبوت کی کسوٹی کمالِ علم اور کمالِ اخلاق ہے تو جس کا علم سب سے بڑا ہوگا اس کی نبوت بھی سب سے بڑی ہوگی۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا علم سب سے بڑھ کر بھی ہے اور سب پر حاوی بھی ہے، تمام علوم کے آپ جامع ہیں اور پھر آپ کے جو مخصوص علوم ہیں وہ الگ ہیں۔ اس لئے علم میں آپ سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور اسی واسطے آپ کو انبیاءِ سابقین کے لئے مُصَدِّق کہا گیا کہ آپ ان کی نبوت کی اور ان کے علوم کی تصدیق کرنے

والے ہیں اور تصدیق وہی کیا کرتا ہے جو پہلے سے علوم جانتا ہو، جو کسی چیز سے واقف نہ ہو وہ تصدیق نہیں کیا کرتا بلکہ وہ تو سلام کیا کرتا ہے تاکہ کسی کو علم نہ ہو جائے کہ یہ علم نہیں رکھتا۔ اور یہ کہنا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے اس چیز کو جانتا ہے تو آپ کو ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ① کہا گیا ہے کہ اے پیغمبرو! جو تمہیں علوم دیئے جائیں گے ان کی تصدیق کرنیوالے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے تو تصدیق کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ سارے علوم آپ کے اندر جمع تھے۔

اس کی شرح اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ کی حدیث نے کر دی یعنی مجھے اگلوں اور پچھلوں ...... سب کے علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں۔ جب آپ کی ذات بابرکات علوم میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہے تو نبوت میں بھی سب سے بڑا مقام ہوگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا نبی دوسرا نبی نہیں ہوسکتا، آپ ہی کو خاتم النّبیّین بننا چاہیے تھا، آپ ہی نبیوں کے سردار بننے والے تھے اور آپ ہی کو نبی الانبیاء کہا گیا۔ تو ایک رکن مقامِ نبوت کا کمالِ علم ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے اُونچے تھے تو آپ کا مقامِ نبوت بھی سب سے اونچا ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اخلاق ...... اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اخلاق میں بھی سب سے اونچا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطاء کیا گیا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو مقام سب سے آخری اور اونچا ہوتا ہے تو نیچے کے سارے مقامات اس میں جمع ہوتے ہیں مثلاً آپ یوں کہیں کہ فلاں آدمی ''بخاری'' پڑھا ہوا ہے تو بخاری آدمی کب پڑھے گا؟

پہلے میزان و مُنْشَعِب پڑھے، پھر قدوری پڑھے، پھر شرح وقایہ پڑھے اور پھر ہدایہ وغیرہ پڑھے ...... تب جا کے بخاری پڑھے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے بخاری آ گئی اسے میزان بھی آ گئی، اسے منشعب بھی آ گئی، اسے شرح وقایہ بھی آ گئی اور ہدایہ بھی آ گئی، نیچے کی ساری کتابیں آ گئیں۔ لیکن جو میزان پڑھ چکا ہے ضروری نہیں کہ اسے بخاری بھی آ جائے تو نیچے کی چیز جاننے سے اوپر کی چیز کا جاننا ضروری نہیں مگر جو اوپر والی چیز کو جان جائے تو نیچے کی ساری چیزیں جان جائے گا۔

قرآن وحدیث کی رُو سے اخلاق کی کُل تین قسمیں ...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اخلاق کا اعلیٰ مقام دے دیا گیا تو اس کے نیچے جتنے مقامات تھے وہ خود بخود اس میں آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامع اخلاق بھی ہیں۔ اور وہ کس طرح سے ......؟ وہ یہ کہ ہم نے جہاں تک غور کیا تو قرآن واحادیث سے اخلاق کی تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں: ایک اخلاقِ حسنہ، ایک اخلاقِ کریمانہ اور ایک اخلاقِ عظیم۔ خُلُقِ حَسَن، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خطاب فرمایا کہ: یَا خَلِیْلِیْ! حَسِّنْ خُلُقَکَ! اے میرے خلیل! اپنے اخلاق کو حسن بناؤ۔ اگرچہ کفار کے ساتھ معاملہ پڑے تب بھی اخلاقِ حَسَنَہ سے پیش آؤ۔ اس سے معلوم

① پارہ:۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

ہوا کہ ایک خُلقِ حَسَن ہے، جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔

ایک خُلُق کریم ہے جسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ کریمانہ اخلاق کو مکمل کر کے تمہارے سامنے پیش کردوں۔ اور ایک خُلُقِ عظیم ہے جو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذاتی خلق ہے، جس کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ② اے نبی! آپ خُلُقِ عظیم کے اوپر ہیں۔ تو تین قسمیں نکلیں، ان تینوں میں فرق کیا ہے؟ خلق حسن ابتدائی درجہ ہے، خلق کریم درمیانہ درجہ ہے اور خلق عظیم انتہائی درجہ ہے۔

اخلاقِ حَسَنہ کی تشریح...... خُلُقِ حَسَن کہتے کسے ہیں؟ عدل کامل کو یعنی آپس کے معاملہ میں کوشش کرو کہ اس میں حدِّ اعتدال سے نہ گزرو۔ اگر آپ کو خدانخواستہ کوئی ایک تھپڑ مار دے تو آپ بھی اتنے ہی زور سے تھپڑ مار دو جتنی زور سے اس نے مارا تھا تو کہا جائے گا کہ آپ خُلُقِ حَسَن کے اوپر ہیں لیکن اگر آپ تھپڑ کے جواب میں مُکّہ مارتے تو کہا جاتا کہ بڑے بداخلاق آدمی ہیں، اس نے تو تھپڑ ہی مارا تھا آپ نے مُکّہ مار دیا، تعدِّی کی اور زیادتی کی تو تعدِّی اور ظلم سے بچ جانا یہ خُلُقِ حَسَن ہے۔

یعنی عدل کے اوپر قائم رہنا اور بال برابر اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دینا یہ خُلُقِ حَسَن کا مفہوم ہے۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی کو ایک روپیہ دیا ہے اور آپ خواہش مند ہیں کہ بدلے میں وہ بھی مجھے ایک دے تو یہ خُلُقِ حَسَن کی بات ہے اور اگر آپ یوں کہیں کہ میں تو دُوں ایک اور اس سے وصول کروں پانچ، تو کہا جائیگا کہ یہ بداخلاقی کی بات ہے، یہ زیادتی کی بات ہے۔ تو خُلُقِ حَسَن کا حاصل اعتدال اور معاملات کا عدل ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر کوئی شخص کسی کے اوپر حملہ کر دے اسکی آنکھ پھوڑ دے تو اسے بھی حق حاصل ہے کہ حملہ کر کے آنکھ پھوڑ دے مگر ایک ہی پھوڑے دو نہیں پھوڑے، دو پھوڑے گا تو کہا جائے گا کہ ظالم ہے۔ تو غرض خُلُقِ حَسَن کا حاصل یہ ہے کہ اَدل بَدل ہو تو پورا پورا ہو، عدل کے مطابق ہو اور انصاف کے مطابق ہو اس سے گزرنا بداخلاقی ہے

اخلاقِ کریمہ کی تشریح...... دوسرا درجہ خُلُقِ کریم کا ہے اسمیں اَدل بدل تو نہیں ہوتا، اس میں ایثار ہوتا ہے کہ دوسرا زیادتی کرے آپ اسے معاف کر دیں۔ ایک نے تھپڑ مارا آپ نے کہا مجھے حق تو تھا بدلہ لینے کا مگر اس احمق اور بے وقوف سے کیا بدلہ لوں، جائیں معاف کرتا ہوں۔ یہ کریمانہ خُلُق ہے۔ دوسرے نے گالی دی آپ کو بھی حق تھا کہ اتنی زیادتی آپ بھی کرتے لیکن آپ نے معاف کر دیا تو یہ ایثار کا درجہ ہے اس کو خُلُقِ کریم کہیں گے۔

اخلاقِ عظیمہ کی تشریح...... اور تیسرا درجہ خُلُقِ عظیم ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو نہ صرف یہ کہ آپ معاف بھی کر دیں بلکہ اُلٹا اس کے ساتھ احسان بھی کریں، یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے۔ جس کو حدیث

---

① السنن الکبریٰ للبیهقي، کتاب الشهادات، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیها ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸. ② پاره: ۲۹، سورة القلم، الآية: ۴.

میں فرمایا گیا کہ: صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَکَ وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَآءَ اِلَیْکَ ① جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے تم جوڑنے کی کوشش کرو اور جو تمہارے ساتھ بُرائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی کوشش کرو یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے اور یہ خُلُق جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدی کے درمیان اخلاق کا موازنہ..... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خُلُقِ حسن کی تعلیم دی یعنی مکمل عدل واعتدال کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ② ہم نے تورات میں فرض کر دیا تھا اور لاگو کر دیا تھا کہ اَدل بدل ہوگا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی دانت توڑو تمہاری کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ دو انتقام لینا تورات میں واجب کیا تھا معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ ③ سخت شریعت تھی تو ناک کا بدلہ ناک، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت، اور کوئی زخم لگائے تو تم بھی زخم لگاؤ برابر سرابر تو یہ خلقِ حسن تھا جس کی تعلیم موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دَور ہے، انہوں نے خُلُقِ کریم کی تعلیم دی۔ یہاں مذہب عیسوی میں تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو نہ یہ کہ تم بدلہ نہ لو بلکہ بایاں گال بھی سامنے کر دو کہ بھائی! ایک تھپڑ اور مارتا چل۔ یہ ایثار کی بات ہے کہ بدلہ نہیں لیا بلکہ معاف کر دیا بلکہ اپنے کو پیش کر دیا کہ لے اور مار لے..... اگر تیری خوشی اسی میں ہے اور تیرا جی اسی میں ٹھنڈا ہوتا ہے تو مار تھپڑ! میں کھانے کے لئے تیار ہوں، تیرا دل ٹھنڈا ہونا چاہیے۔ یہ ایثار کی تعلیم ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جامع تعلیم دی۔ وہ یہ کہ نہ تو یہ فرمایا: کہ تم پر بدلہ لینا واجب ہے اور نہ یہ فرمایا: کہ تم پر معاف کرنا واجب ہے، بلکہ دونوں چیزیں جمع کیں اور ساتھ میں اعلیٰ مقام بھی پیش کر دیا اور فرمایا کہ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهُ عَلَى اللهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ④ برائی کا بدلہ برائی ہے، تمہیں حق ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم بھی برائی کرو۔ کوئی تمہیں

---

① کنز العمال ج: ۳ص: ۳۵۹ رقم: ۶۹۲۹. حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: قال ابن الرفعة فی المطلب: لیس فیه الا انقطاع الی انه یقوی بالآیة، وفیما قال نظر لان فی اسنادہ الحسین بن زید بن علی وقد ضعفه ابن المدینی وغیرہ دیکھئے: التلخیص الحبیر، کتاب الاقرار ج: ۳ ص: ۴۷۹. ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیة: ۴۵. ③ مذکورہ آیت کا بقیہ تتمہ ہے: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ...... الخ یعنی جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس (کے گناہوں) کے لیے کفارہ ہوگا اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔ قرآن پاک میں ایک اور جگہ ایسے ہی حکیمہ الفاظ امت محمدیہ کے لیے بھی نازل ہوئے ہیں: اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا۔ تو شریعت موسوی میں بھی مظلوم پر بدلہ لینا فرض نہیں تھا بلکہ اس کے لیے باعثِ کفارہ تھا جیسے حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنا کہنے پر اکتفاء فرمایا کہ اے میرے ماں جائے بھائی! میرے سر اور داڑھی کے بال پکڑ کر نہ کھینچ! اور مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے۔ ہاں اگر مظلوم حاکم کے پاس جائے تو حاکم کو بدلہ دلوانا فرض تھا، دیت ان کے ہاں مشروع نہ تھی یہ فقط امت محمدیہ کا خاصہ ہے۔ ④ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیة: ۴۰.

تھپڑ مارے تم بھی تھپڑ مارو جو مُکّہ مارے تم بھی مُکّہ مار دو، برائی کا بدلہ برائی ہے، بدلہ لینے کا حق تمہیں حاصل ہے لیکن آگے فرمایا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ ① اور اگر تم معاف کر دو تو اللہ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے تو دونوں حق دیدیئے: انتقام لینے کا حق بھی اور معاف کر دینے کا حق بھی۔

اس واسطے کہ اسلام دنیا کی ہر قوم کے لئے پیغام ہے اس میں نرم مزاج قومیں بھی شامل ہیں اور سخت مزاج بھی۔ اگر یہ تعلیم دی جاتی کہ انتقام لینا تمہارے اوپر واجب ہے تو بیچاری نرم خُو قومیں جیسے مشرقی بنگال کے رہنے والے ان میں سے کوئی بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس خُونخوار مذہب کو کون قبول کرے! کہ اگر کوئی تھپڑ مارے تو تمہارے اوپر بھی فرض ہے کہ تم بھی تھپڑ مارو! کوئی لاٹھی مارے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو! یہ تو بڑا سخت مذہب ہے اور اگر یہ تعلیم دی جاتی کہ معاف کرنا واجب ہے تو شاید جو پٹھان ہے وہ ایک بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس بزدلانہ مذہب کو کون قبول کرے کہ بھئی اگر کوئی مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو، کیوں بھئی کس لئے! ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ تو دونوں طرح کی قوموں کو جان کر اسلام نے دونوں قوموں کو یہ حق دیئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے لے لینا یہ بھی حق ہے اور اگر معاف کر دے تو اجر و عزیمت کی بات ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلُق عظیم...... اور اگر معاف کر دینے کے بعد اس کے ساتھ خیر خواہی بھی کرے تو یہ خُلُق عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق ہے۔ جس کو ایک موقع پر قرآن کریم نے فرمایا کہ: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ② اے پیغمبر! یہ تو ہم نے کوٹ کوٹ کر رحمت تمہارے قلب کے اندر بھری ہے، اس سے تمہارے قلب میں نرمی اور لینت ہے، رأفت اور ترس کھاتا ہے۔ اگر آپ سخت گیر ہوتے تو یہ جو پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں سب بھاگ جاتے اور کوئی پاس نہ پھٹکتا۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں نرمی اور رحمت و رأفت بھر دی تو اس کا تقاضا کیا ہونا چاہیے پہلا مقام آپ کا یہ ہے کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی برائی کرے تو آپ ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ③ معاف کر دیں، بدلہ بالکل نہ لیں، یہ ہے آپ کی شان۔ آگے فرمایا کہ فقط یہی نہیں، اس سے بڑھ کر آپ کا مقام ہے کہ کوئی برائی کرے تو نہ صرف معاف کر دیں بلکہ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ④ اس کے لئے دعائے مغفرت بھی کریں، وہ باغی ہو گیا آپ اس کے لئے دعا مانگیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسعتِ ظرف ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حوصلہ ہونا چاہیے تو پہلا درجہ یہ کہ معاف کر دیں، دوسرا درجہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے۔ اور تیسرا درجہ ایک اور آگے بتلایا گیا کہ یہ بھی آپ کی شان کے اندر ہے اور آپ کا مقام اس سے بھی زیادہ بلند ہے، وہ کیا ہے؟ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ⑤ ان برا بھلا کہنے والوں سے بُلا کر مشورہ بھی کریں تا کہ وہ یہ سمجھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اپنا سمجھا۔ تو وہ تو کر رہے ہیں برائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۴۰۔ ② ③ ④ ⑤ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

اپنا بنا رہے ہیں، وہ تو دے رہے ہیں گالیاں، آپ ان کو دعائیں دے رہے ہیں، یہ خُلقِ عظیم ہے۔

تو جو خلقِ عظیم کا مالک ہوگا خلقِ حسن بھی اس کے نیچے آ گیا، خلقِ کریم بھی اس کے نیچے آ گیا، اس لئے کہ جب اعلیٰ مقام حاصل ہے تو درمیان کا اور ادنیٰ مقام بھی حاصل ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اخلاق کا بھی وہ نمونہ دیا گیا ہے کہ سارے اخلاقی نمونے اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔

مقامِ نبوت کے آثار..... تو علم کا تو وہ مقام کہ سارے علومِ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے۔ اخلاق کا وہ مقام کہ سارے پیغمبروں کے اعلیٰ اخلاق جمع کر دیئے گئے اور یہی دو چیزیں بنیادِ نبوت تھیں؛ کمالِ علم اور کمالِ اخلاق تو جب یہ دونوں چیزیں اعلیٰ طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں تو آپ کی نبوت سب سے زیادہ اونچی نبوت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَایَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَانَبِیٌّ مُرْسَلٌ" ① ایک وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے وہ قرب حاصل ہوتا ہے، وہ نزدیکی مجھے میسر آتی ہے کہ وہاں تک نہ کوئی مقرب فرشتہ پہنچا اور نہ کوئی نبی مُرسل پہنچا، جہاں تک اللہ کے ہاں میری رسائی ہے۔ تو بہرحال اس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت واضح ہوا۔

اس مقامِ نبوت کے آثار کیا ہیں؟ ان آثار کو ان دو حدیثوں میں بیان کیا گیا جن کو میں نے خطبہ کے شروع میں تلاوت کیا تھا، دو غرضیں آپ نے اپنی بعثت کی بیان کیں، دو مقصد بیان فرمائے۔ وہ کیا ہیں؟ ایک یہ کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا اور دوسرے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں دنیا میں تاکہ تعلیم دے کر دنیا میں علم پھیلاؤں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تکریم کر کے سب کو بااخلاق بنا دوں، تو جو دو رکن مقامِ نبوت کے ہیں علم اور اخلاق، انہی دو کے پھیلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے یہی بعثت کی غرض و غایت ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے تو صحابہ کے دو گروہ تھے ایک ایک طرف اور ایک ایک طرف۔ ایک گروہ تو مسئلے بیان کرنے میں لگا ہوا تھا، علمی مسائل میں مصروف تھا کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام! الغرض علمی باتیں ہو رہی تھیں اور ایک جماعت عبادت اور زہد و تقویٰ میں مشغول تھی، کوئی تلاوت میں مشغول تھا، کوئی درود پڑھنے میں مشغول تھا، عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کِلَا کُمَا عَلَی الْخَیْرِ تم دونوں جماعتیں خیر پر ہو، یہ عُبّاد اور

---

① حضرات صوفیاء اس حدیث کو اکثر ذکر کرتے ہیں یہ حدیث رسالہ قشیری میں مذکور ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ لی وقت لا یسعنی فیه غیر ربی علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں ویشبہ ان یکون معنی ما للترمذی فی الشمائل ولا بن راھویة فی سنده عن علی فی حدیث طویل. دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف المیم ج: ۱ ص: ۱۹۰.

زُہّاد کی جماعت بھی خیر پر ہے اور یہ علماء وفضلاء کی جماعت بھی خیر پر ہے، مگر فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا بھائی! میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جو مسئلے مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی۔ تو نبوت کی سب سے بڑی غرض وغایت تعلیم ہے، جس سے علم دنیا کے اندر پھیلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلم بن کر آئے اور دنیا کے اندر آپ نے علم پھیلایا اور لوگوں کو عالم بنایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا...... ظاہر ہے کہ علم اللہ کی صفت ہے، بندہ کی صفت نہیں۔ اس علم کو پھیلانا گویا بندہ کو خدا سے وابستہ کرنا ہے چونکہ آپ تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے، تو سب سے بڑی نبوت آپ کی، اور سب سے بڑی تعلیم بھی آپ کی، اسی واسطے آپ کو معجزہ بھی ''علمی'' دیا گیا یعنی ہزاروں معجزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی ملے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، جو علمی معجزہ ہے۔ اس علمی معجزہ نے سب کو تھکا دیا اور عاجز کر دیا کہ کوئی اس کی نظیر نہ لا سکا۔ قرآن نے چیلنج بھی کئے اور فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① اگر سارے جن اور انسان مل جائیں اور ایک دوسرے کی مدد پر کھڑے ہو جائیں کہ اس قرآن کی نظیر لے آئیں تو وہ نہیں لا سکتے، یہ ناممکن ہے۔ تنزُّل کر کے کہا کہ سارے قرآن کی نظیر نہیں تو کم سے کم دس سورتیں ہی بنا لائیں ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ② کفار نے یہ الزام دیا تھا کہ یہ تو افتراء کردہ کلام ہے، یہ تو تہمتیں باندھ رکھی ہیں تو فرمایا گیا کہ یہ تہمت ہے تو اسی قسم کی تہمتیں تم بھی باندھ لاؤ، دس ہی صورتیں بنا لاؤ۔

پھر اور زیادہ تنزُّل کیا کہ: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ③ دس سورتیں تو تم نہ لا سکے، ایک ہی سورت بنا لاؤ جو قرآن جیسی ہو کہ اس کا اسلوب بیان بھی وہی ہو، فصاحت وبلاغت بھی اعجازی ہو، اس میں علوم بھی اتنے ہی بھرے ہوئے ہوں، اس میں لطائف وحِکَم بھی بھرپور ہوں، تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ۔ اور اس سورت میں بھی یہ قید نہیں لگائی کہ سورۂ بقرہ جیسی سورت ہو جو ایک ہی سورت اڑھائی پارے کی ہے بلکہ: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ جیسی چھوٹی سی سورت لے آؤ جو ایک سطر سے بھی کم میں آ جاتی ہے۔

پھر اور تنزل کیا کہ: ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ سورت تو سورت ہے ایک آیت اور ایک بات ہی قرآن جیسی بنا لاؤ مگر نہیں لا سکے تو لوگوں نے لڑائیاں لڑیں، گالیاں دیں، برا بھلا کہا لیکن یہ صاف صورت کیوں نہ اختیار کی کہ اس کی نظیر بنا کے پیش کر دیتے، سارے جھگڑے ختم ہو جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو سب سے بڑا معجزۂ علمی قرآن ہے اور معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ دنیا تھک جائے مگر مثل نہ لا سکے...... اس کو معجزہ کہتے ہیں۔

علمی معجزہ دیئے جانے کی حکمت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ علمی ہے، اگرچہ عملی

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۳.

③ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۳۴.

معجزے بھی ہزاروں دیئے گئے۔ لیکن پچھلے انبیاء کو صرف عملی معجزے دیئے گئے؛ عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی دیا گیا، موسیٰ علیہ السلام کو عصاء موسیٰ اور ید بیضاء دیا گیا، ابراہیم علیہ السلام کو نارِ خلیل کا معجزہ دیا گیا، یوسف علیہ السلام کو قمیصِ یوسف کا معجزہ دیا گیا کہ ان کا کرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی لوٹ آئی، آنکھیں واپس آ گئیں، داؤد علیہ السلام کو "اِلَانَةُ الْحَدِيْد" کا معجزہ دیا گیا کہ لوہے کو ہاتھ میں لیتے تو موم کی طرح سے پگھل جاتا تھا مختلف انبیاء کو مختلف عملی معجزات دیئے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے عملی معجزات سینکڑوں دیئے گئے تھے مگر سب سے بڑا معجزہ علمی دیا گیا تھا وہ قرآن کریم ہے اور اس کا اثر کیا ہے؟

یہ قاعدہ کی بات ہے جب دنیا سے کوئی عامل رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے، عمل باقی نہیں رہتا، جب عامل گیا تو عمل بھی گیا۔ لیکن اگر عالم دنیا سے رخصت ہو جائے تو علم رخصت نہیں ہوتا وہ باقی رہتا ہے...... ابد تک باقی رہتا ہے۔ تو معجزہ درحقیقت نبوت کی دلیل ہے تو انبیاءِ سابقین کے معجزات عملی تھے جب وہ دنیا سے تشریف لے گئے ان کے معجزات بھی چلے گئے تو کسی کی نبوت کی دلیل آج تک دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علمی معجزہ دیا گیا اور علم عالم کے جانے سے ختم نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے مگر دلیل نبوت آج تک موجود ہے، اس لئے نبوت بھی موجود ہے۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے تحت آ جاؤ اور ان کی شریعت پر عمل کرو اس لئے کہ جب وہ نبوت موجود نہیں اور یوں موجود نہیں کہ دلیل نبوت موجود نہیں اس لئے ہم نبوتِ موسوی کیلئے چیلنج نہیں کر سکتے، ان کی شریعت پر عمل کے لئے بھی نہیں کہہ سکتے لیکن نبوتِ محمدی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ نبوت موجود ہے...... تو ان کی شریعت پر عمل کرو، اس لئے کہ اس کی دلیل موجود ہے اور وہ قرآن ہے جو کہ علمی معجزہ ہے، آج بھی اس کا چیلنج اسی طرح موجود ہے جیسے پہلے تھا۔

حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عجیب تعبیر...... تو سب سے بڑی چیز آپ کو علمی معجزہ دیا گیا آپ کی ذات بابرکات میں علم رچایا گیا۔ حدیث میں ہے کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِي ① سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا تو یہاں یہ نور مراد نہیں جو چاند سورج کا حسّی نور ہوتا ہے، یہ تو اس نور کے مقابلے میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور ہے بہت کم درجے کی چیز ہے۔ وہ نور تو حقیقتِ محمدی ہے جو علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے، اس کے اندر اصل علم ہے۔ گویا علم رگ و پے میں رچایا گیا اور استعدادِ علمی رچائی گئی ہے، تو حقیقتِ محمدیہ درحقیقت علم ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بھی علم بھرا گیا، معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا، امت بھی آپ کی علمی امت بنائی گئی۔

کثرتِ تصنیف امتِ محمدیہ کی خصوصیت اور اندلس و بغداد کے کتب خانوں کا حال...... یہی وجہ

---

① علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں: وقد اشتهر بين القصاص حديث "اول ماخلق الله نوری" وهو حديث لم يثبت بهذا المعنىٰ وان ورد غيره موافقا له في المعنىٰ.. دیکھئے: الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة ج: ۱ ص: ۴۲.

ہے کہ قرآن کی برکت ہے کہ امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خصوصیت ہے، دنیا کی کسی امت میں وہ تصانیف نہیں ملیں گی جو اس امت میں ملیں گی، کتب خانے بھر دیئے، ہزار دو ہزار لاکھ دو لاکھ نہیں کروڑوں کتابیں آج تک موجود ہیں اور مدت سے چلی آ رہی ہیں، مصر کے کتب خانے، اندلس کے کتب خانے......

جب وہاں اندلس میں انقلاب آیا اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور عیسائیوں نے غلبہ پالیا تو تعصب میں آ کر عیسائیوں نے یہ چاہا کہ ان کا لٹریچر، ان کا ادب اور ان کا سب علمی ذخیرہ فنا کر دیا جائے تا کہ ان کا وجود باقی نہ رہے تو ایک مستقل عملہ اندلس کی حکومت نے مقرر کیا تا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ ایک عورت نے اندلس کی تاریخ لکھی ہے اس میں وہ لکھتی ہے کہ اندلس کے کتب خانوں کو ضائع کرنے کے لئے ایک مستقل عملہ اندلسی حکومت نے مقرر کیا تا کہ مسلمانوں کا ادب اور علم باقی نہ رہے اور اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے، مستقل انچارج آفیسر رکھا...... تو پچاس برس میں جا کر سب کتب خانے ضائع ہو سکے ہیں۔ تو ایک ایک ملک کے اتنے کتب خانے تھے۔ یہ مسلمانوں کی تصنیف و تالیف نہیں تھی تو اور کیا تھا؟

بغداد کے اوپر تاتاریوں کا جب سیلاب آیا ہے اور خلافت تباہ ہوگئی اور پارہ پارہ ہوگئی تو بغداد جو دجلہ کے کنارے پر ہے اور دجلہ بہت بڑا دریا ہے، جس کا پل مسلمانوں نے توڑ دیا تھا۔ تاتاریوں نے جب بغداد کو فتح کر لیا تو صرف ایک کتب خانہ مسلمانوں کا لوٹ کر اس کی کتابیں دجلہ میں بھر کر سڑک بنائی گئی...... وہ بہت چوڑی سڑک بنائی گئی وہ اتنی چوڑی سڑک تھی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر گذر سکتی تھیں۔

یہ صرف ایک کتب خانے کی کتابیں تھیں جس سے دجلہ کا پل بنایا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان کی سیاہی بہہ کر جو پانی میں گھلی ہے تو ایک مہینے تک علماء کو لکھنے کے لئے دوسری روشنائی کی ضرورت نہیں تھی، دجلہ کا پانی روشنائی کا کام دیتا تھا تو جس قوم کے ایک ملک کے ایک شہر کے صرف ایک کتب خانے کا یہ حال ہو تو اندازہ کیا جائے کہ بغداد میں کتنے کتب خانے ہوں گے! اندلس میں کتنے ہوں گے! حجاز میں کتنے ہوں گے! مصر میں کتنے ہوں گے!۔ خود آپ کے پاکستان میں کتنے کتب خانے ہیں! بہت سے کتب خانے وہ ہیں سندھ وغیرہ میں جن کو آج تک کیڑا چاٹ رہا ہے، ان کتابوں کو کوئی پڑھنے والا اور لکھنے والا نہیں ہے...... ہزاروں کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں، ذخیرے کے ذخیرے ہیں، یہ سب علماءِ اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب کی سب کتابیں قرآن حکیم کی شرح ہیں۔ ہر کتاب کے شروع میں کوئی نہ کوئی آیت ہے جس سے مضمون کو شروع کیا گیا ہے۔ تو قرآن کریم اتنا عظیم علمی معجزہ ہے کہ لاکھوں کتب خانے بن گئے، لاکھوں افراد عالم بن گئے کوئی حد کتابوں اور کتب خانوں کی باقی نہ رہی۔

قرآن معجزہ نما بھی ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا تو جس ذاتِ اقدس کا علم اتنا بڑا...... تو اس کی نبوت کتنی بڑی ہوگی! اس کی تعلیم کتنی بڑی ہوگی! تو فرمایا کہ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں معلم بنا کر بھیجا گیا

ہوں تو تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے ذریعے دی۔ اس قرآن نے دنیا بھر کے اندر علم پھیلایا جس سے بڑے بڑے علماء تیار ہو گئے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں بلکہ معجزہ نما بھی ہے۔ معجزے بناتا بھی ہے اس لئے کہ قرآن پر چل کر ہی تو خواجہ معین الدین اجمیریؒ خواجہ اجمیری بنے اور اکابرِ اولیاء اللہ اسی پر چل کر اولیاء اللہ بنے تو قرآن درحقیقت نہ صرف خود معجزہ ہے بلکہ معجزہ نما بھی ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا ہی رہے گا۔ تو اتنے علوم آپ کی ذات بابرکات میں رکھ دیئے گئے جو تا قیامت ختم ہونے کو نہیں آئیں گے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے علوم ہیں جو علماء، صوفیاء، محدثین اور فقہاء کے ذریعے ظاہر ہو رہے ہیں۔

حضور کا ایک ایک صحابی پورا پورا جہان تھا...... علم کا تو یہ عالم تھا اور تربیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تھی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور بعض روایات میں اس سے زیادہ ایک لاکھ ۴۴ ہزار کا عدد آیا ہے تو ایک لاکھ چوالیس ہزار نمونے بنا کے رکھ دیئے۔ کسی مربی اور معلم کی یہی خوبی سمجھی گئی ہے کہ اپنے شاگرد کو اپنے جیسا بنا دے تو ایک ایک کو ایسا بنایا کہ ایک ایک امت اور جہان کے برابر بن گیا، ایک ایک صحابی پوری امت بن گیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھو تو پوری اُمت، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو پورا جہان، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو اکیلے ہی پورا عالَم اور علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو ایک ہی فرد پورا جہاں۔

حدیث میں ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ نے پوری اُمّت ایک پلڑے میں رکھی اور مجھے ایک پلڑے میں تو میرا پلڑا جھک گیا، میرا ایمان اور علم و عمل ساری اُمّت سے وزن دار ثابت ہوا۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایک پلڑے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور دوسرے پلڑے میں ساری اُمّت کو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا، علم و عمل اور اخلاق کے لحاظ سے وہ پوری اُمّت سے وزن دار ثابت ہوئے۔ پھر اس پلڑے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور ساری اُمت دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا۔

تو صدیق، فاروق رضی اللہ عنہم اور دوسرے ایسے نمونے بنائے کہ ایک فرد جہانوں کے برابر ثابت ہوا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیضِ تعلیم اور فیضِ تربیت تھا۔ تو صدیق اکبر و فاروقِ اعظم و عثمان غنی، علیُ المرتضٰی، خالد سیف اللہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود وغیرہم رضی اللہ عنہم ...... یہ تو وہ چند ہیں جن کے نام زبان پر آگئے ہیں ورنہ ایک ایک صحابی کو دیکھا جائے تو اُمّت کے سارے اقطاب اور بڑے بڑے غوث جمع ہو جائیں لیکن پھر بھی صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ تو جو اخلاص، معرفت اور للّٰہیت ایک صحابی کے قلب میں جمع تھی اس کا نمونہ غیر صحابی کے قلب میں موجود نہیں ہو سکتا، صحابہ نے نہ صرف اپنی زندگی کو تج دیا تھا بلکہ زندگی کی غرض و غایت ہی دین بن گیا تھا۔

عشقِ رسول میں ایک صحابی کا اپنی آنکھیں اور کان گنوانا...... حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے: ایک صحابی ہیں جو عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں کوئی علماء اور فقہاء میں ان کا شمار نہیں ہے کھیتی باڑی کرتے تھے ہل چلا رہے تھے کہ کسی شخص نے جا کر خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ بس ہل چھوڑ کے دعاء کے لئے

ہاتھ اُٹھائے کہا کہ اے اللہ! یہ میری آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کا دیدار کریں، یہ میرے کان اس لئے تھے کہ تیرے نبی کا کلام سنیں...... جب آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا میں نہیں تو میری آنکھیں ختم کردے اور میرے کان بھی ختم کردے، اَب نہ بینا رہنا چاہتا ہوں اور نہ شُنوا۔ تھے مستجاب الدعوات ......اسی وقت نابینا ہوگئے اور اسی وقت بہرے بھی ہوگئے اور پھر مرتے دم تک نہ کسی کی صورت دیکھی اور نہ کسی کی آواز سنی۔ تو گویا انہوں نے اپنی بینائی اور شنوائی کا، آنکھ اور کان کا مقصد اللہ کے رسول کا کلام سُننا اور ان کا جمال مبارک دیکھنا بنالیا تھا اور یہی ان کی غرض وغایت تھی۔

تو جس قوم کا یہ حال ہو کہ ادنیٰ ادنیٰ فرد......جس کا علماء میں بھی شمار نہ ہو، وہ اس درجہ معرفت، للّٰہیت اور اخلاص کامل پر ہو کہ سارے بدن کی قوتوں کی انتہائی غرض نبی ہی ہو تو اس سے بڑھ کر اور کون نمونے تیار کرسکتا ہے! تو ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے بنادیئے۔ یہ تعلیم اور تکمیل اخلاق کا اثر تھا جس صحابی کو دیکھو علم وعمل کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا ہے، ایثار اور زہد وقناعت کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے۔ قلوب کی یہ رفتار اُمّت کے اور کسی طبقے میں نہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھی۔

صحابہ کرام قرآن کی رُو سے ہمیشہ کیلئے مقدس ہیں......اسی لئے قرآن کریم نے من حیث الطبقہ اگر کسی طبقے کی تقدیس بیان کی ہے تو وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ پورے کے پورے طبقے کو مقدس قرار دیا ہے:
﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ① یہ تو سابقین اولین مہاجرین و انصار تھے اور جو بعد میں ملتے گئے مہاجرین وانصار کے ساتھ، ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ طبقے کے طبقے کے ساتھ اللہ تعالیٰ رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اُس طبقے کے ساتھ کبھی رضامندی ظاہر نہیں فرماسکتے جس طبقے کے اندر کھوٹ موجود ہو یا ان میں کوئی خرابی موجود ہو اور اعلان کر رہے ہیں قرآن کے اندر اور قرآن قیامت تک رہنے والی چیز ہے تو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کا وعدہ بھی قیامت تک رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے اُترنے کے بعد کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں آسکتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی فرق پڑسکے، وہ برگزیدہ ہی رہیں گے اور تاقیامت پسندیدہ ہی رہیں گے......ورنہ قرآن کی آیت غلط ثابت ہوگی تو من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے اور بزرگی بیان کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہیں فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ o فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ ② یہ بزرگ لوگ ہیں (یعنی) خدا کے فضل اور احسان سے۔ تو اللہ تعالیٰ جن کو بزرگ کہے انکی بزرگی میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟

کوئی یوں کہے: صاحب! پہلے تو ایسے ہی تھے مگر بعد میں معاذ اللہ ان میں کچھ نفاق پیدا ہوگیا تھا تو قرآن کریم

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۷-۸۔

نے اس کی بھی تکذیب وتردید کردی فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴾ ① یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پہلے ہی جانچ لیا تھا امتحان لے لیا تھا یہ پرکھے پرکھائے لوگ ہیں۔ تو جن کو خدا پرکھ لے ان میں کھوٹ نہیں آسکتا ورنہ پرکھ غلط ثابت ہوگی تو بہر حال طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وعمل کا نمونہ ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ ② میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کسی کی اقتداء کروگے ہدایت پاؤ گے۔ کہیں فرمایا: اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ مِّنْ بَعْدِیْ غَرَضًا ③ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو ہدف نہ بناؤ، ان پر ملامت نہ کرو، ان پر اپنی جانب سے تنقید مت کرو اوران کے بارے میں خدا سے ڈرو! تقویٰ اختیار کرو۔ تو بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وعمل کا نمونہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، اتباع سُنّت کے اندر غرق تھے کہ ان کے عمل کو دیکھ کر نبی کی سنتوں کا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشرت کا پتہ چل جاتا تھا۔

تو دو غرضیں بیان فرمائی گئیں اور میری تقریر کا حاصل بھی یہ نکلا کہ ایک تو مقام نبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کس مقام کی تھی اور علم وعمل کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا، علم واخلاق کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا اور ایک یہ کہ نبوت کے مقاصد اور غرض وغایت کیا تھی، تو ان دو حدیثوں سے وہ غرض وغایت ظاہر ہوئی کہ وہ تعلیم علم اور تربیتِ اخلاق تھی۔

اُمتِ محمدیہ کبھی ہلاک نہیں ہوسکتی...... اور پھر تیسری چیز یہ کہ اس تعلیم وتربیت کے آثار کیا تھے جو نمایاں ہوئے؟ وہ اس طرح کہ علم وعمل کے لاکھوں نمونے پیدا ہوگئے اور وہ نمونے صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ آخِرُہٗ ④ میری اُمت کی مثال اس بارش جیسی ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بارش کا پہلا حصہ زمین کے لئے فائدہ مند ہوگا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ مطلب یہ ہے کہ خیریت اول سے لے کر اخیر تک امت میں گھومتی ہوئی موجود ہے: اول بھی خیر، بیچ بھی خیر، اخیر بھی خیر۔ مگر مراتب کا فرق رہے گا، فرقِ مراتب الگ چیز ہے مگر نفسِ خیریت اور نفسِ ہدایت وہ پوری اُمت میں مشترک ہے، اخیر میں بھی اعلیٰ نمونہ ملیں گے، وسط میں بھی اعلیٰ نمونے ملیں گے اور ابتداء

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳. ② مسند عبد بن حمید، احادیث ابن عمرؓ ج: ۲ ص: ۴۰۲. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیھقی واسندہ الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء بایھم اقتدیتم اھتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "التلخیص الحبیر" میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الحبیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸.

③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی، ص: ۲۰۴ رقم: ۳۴۶۲.

④ المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ سیف ج: ۸ ص: ۳۳۸ رقم: ۳۸۰۲.

میں بھی ملیں گے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کَیْفَ تُھْلَکُ اُمَّۃٌ اَنَا اَوَّلُھَا وَالْمَھْدِيُّ وَسَطُھَا وَالْمَسِیْحُ آخِرُھَا ① وہ اُمت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کی ابتداء میں میں ہوں اور انتہاء میں مسیح علیہ السلام اور بیچ میں حضرت مہدی علیہ السلام ہوں۔ یہ اُمت ضائع ہونیوالی نہیں ہے۔

کبھی فرمایا: "لَاتَزَالُ طَآئِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَاذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللہِ" ② میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ باقی رہے گی (چاہے چھوٹی ہو) جو منصور من اللہ ہوگی حق پر قائم رہے گی، وہی کچھ کرتی رہے گی جو کچھ میں نے کیا، وہی کچھ کہتی رہے گی جو کچھ میں نے کہا ہے، وہی اس کا نعرہ ہوگا جو میرا نعرہ ہے۔ انہیں کوئی رسوا کرنیوالا رسوا نہیں کرسکے گا ذلیل کرنیوالا ذلیل نہیں کرسکے گا۔

کبھی فرمایا: اس اُمت میں خلف الرشید سے پیدا ہوتے رہیں گے، اخلاف پیدا ہوتے رہیں گے وہ کیا کریں گے؟ تحریف کرنے والوں کی تحریفات کو مٹادیں گے، مبطل اور باطل پسندوں کی دروغ باطنیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی جاہلانہ تاویلات کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور حق کو حق اور باطل کو باطل نمایاں کریں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں اطلاع دی کہ خیریت منحصر نہیں ہے کہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ختم ہوگئی...... ہمیشہ اہل خیر آتے رہیں گے ہمیشہ اخلاف رشید پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ اُمت آفتابوں ماہتابوں سے بھری ہوئی ہے تو آثارِ نبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتے ہیں کہ نبی کے زمانے میں بھی نمونے پیدا ہوئے اور ابد الآباد اور قیامت تک کی اطلاع دیدی کہ پیدا ہوتے رہیں گے: اِنَّ اللہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِاۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا ③ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر مجدد بھیجتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے اور لوگوں نے جو اس میں خلط ملط کردیا ہوگا اس کو نکھار کر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ تو صدی کے سرے پر الگ وعدے کئے، صدی کے اندر رہ کر اخلاف الرشید پیدا ہونے کے الگ وعدے کئے گئے، پوری اُمت کے اندر عالم وقت کے الگ وعدے کئے گئے تو یہ امت مجموعی حیثیت سے، طبقاتی حیثیت سے اور زمانے کی حیثیت سے خیر سے بھری ہوئی ہے۔ تو یہ آثارِ نبوت ہیں کہ ہر دور کو خیر سے لبریز کردیا، ہر زمانے کو خیر سے بھر دیا تو یہ وہی کرسکتا ہے جس کا مقامِ نبوت سب سے زیادہ بلند ہو جس کے علم اور اخلاق سب سے زیادہ اونچے اور بڑھ کر ہوں اور جس کے پیدا کردہ نمونے ایسے ہوں کہ کسی پیغمبر کو وہ صحابہ نہ ملے ہوں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملے ہوں، کسی پیغمبر کو وہ جاں نثار نہ ملے ہوں جو آپ کو عطا کئے گئے ہوں۔

حاصلِ تقریر...... بہرحال یہ توجہ سے میرے بعض بزرگوں نے فرمایا تھا ورنہ دراصل میرے ذہن میں تو دوسرا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ١١ ص: ٣٤٢.

② السنن لابن ماجه، كتاب السنة، باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ص: ٢٤٧٧ رقم: ٦.

③ السنن لابی داود، كتاب الملاحم، باب مايذكر فی قرن المائة، ص: ١٥٥٣ رقم: ٤٢٩١.

مضمون تھا جو عرض کرنا تھا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں زیادہ تر طلباء کو خطاب کروں گا طلباء کے فرائض پر۔ اس کے ذیل میں دوسرے لوگ بھی فائدہ اُٹھالیں گے، اس واسطے کہ ساری اُمت تو طلباء نہیں ہے، سارے طالبانِ علم نہیں ہیں، ایک خاص طبقہ طلباء کا ہے تو ارادہ تو میرا یہ تھا کہ طلباء کے فرائض اور طلباء کی خصوصیات اور ان کے اخلاق ذکر کئے جائیں...... لیکن جلسہ میں آتے وقت بعض عزیزوں نے فرمایا کہ اگر مقامِ نبوت اور مقاصدِ نبوت کے بارے میں کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے تو شاید زیادہ بہتر ہوگا اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے۔

تو میں نے دو حدیثیں تلاوت کیں ان دو حدیثوں میں مقاصدِ نبوت اور بعثت کی غرض و غایت بھی واضح ہوگئی اور چونکہ یہ غرض و غایت انتہائی اونچی تھی اس لئے مقامِ نبوت پر بھی روشنی پڑ گئی اور پھر جب آثارِ نبوت سامنے آئے تو اس سے نبوت کی عظمت اور بڑائی ......اور واضح ہوئی۔ اس لئے میں نے تین باتیں عرض کیں: مقامِ نبوت، مقاصدِ نبوت اور آثارِ نبوت اور اس کے بارے میں یہ چند جملے عرض کیے جو اس وقت ذہن میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اس امت کو اپنے پیغمبر کا متبع بنائے اس لئے کہ اتباع ہی میں علم اور اخلاق نصیب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ امت اپنے پیغمبر سے کٹ جائے، اگر اس سلسلہ سے جو علم و اخلاق کا چلا آرہا ہے یہ اُلٹ کر کٹ جائے تو یہ اُمت علم سے بھی محروم ہو جائے گی اور اخلاق سے بھی۔ علم نبی کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملے گا، اخلاقِ فاضلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملیں گے۔ تو ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کو سنبھال لیں، دامن پکڑ لیں، وہ کہیں ہو...... مگر آپ گرد و غبار سمجھ کر اس کو جھٹکیں نہیں، دامن کو اگر گرد لگ جائے تو لگی رہنی چاہیے کہ یہ میرے ہی مقام اور مکان کی گرد ہے، میرے ساتھ وابستہ رہے گی۔ تو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائیں گے دامن جائے گا، یہ گرد و غبار بھی وہیں جائیگا تو دامن سے وابستہ ہو جائیے، یہی سب سے بڑی بات ہے۔

اصل بنیادی چیز وابستگی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریل گاڑی میں سب سے اونچا فرسٹ کلاس کا ڈبہ سمجھا گیا ہے جس میں بڑے بڑے لوگ تموّل کے اعتبار سے یا اپنے کمال کے اعتبار سے سفر کرتے ہیں۔ اسی فرسٹ کلاس میں ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ ہوتا ہے جسے سرونٹ کلاس کہتے ہیں، سرونٹ کلاس میں نہ ڈبے ہوتے ہیں نہ برقی پنکھے ہوتے ہیں، نہ کوئی سامانِ راحت ہوتا ہے، وہ تھرڈ کلاس ہے مگر لگا ہوا اور جڑا ہوا فرسٹ کلاس سے ہے، اس میں ملازمین بیٹھتے ہیں اس کی وابستگی کا اثر یہی ہے کہ جہاں جا کے فرسٹ کلاس رُکے گا وہیں جا کے ملازمین کا سرونٹ کلاس رُکے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آقا کے ملازم کے ڈبے کو روک دو، سرونٹ کلاس روک دو بلکہ جہاں آقا اُتریں گے ملازم بھی وہیں اُترے گا اور جس کوٹھی میں آقا کا قیام ہوگا اس میں ملازمین بھی حصہ لیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ جگہ جوتیوں میں ملے...... مگر ملے گی اسی کوٹھی کے اندر، ملازمین باہر نہیں نکالے جائیں گے۔ تو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عالَم کے فرسٹ کلاس میں سوار ہیں اور ہم سارے سرونٹ ہیں تو جہاں آقا کی سواری جنت

کے مقام میں جائے گی وہیں یہ بندے اور غلام بھی ساتھ جائیں گے ...... بشرطیکہ وابستگی رہے تو وابستگی قائم رکھنا یہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ علم بھی آقا سے وابستگی سے آئے گا اور اخلاق بھی۔ اسی سے کٹ گئے تو نہ علم باقی رہے گا نہ اخلاق تو اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم تعلیم نبوت سے مستفیض ہوں، اخلاقِ نبوت سے مستفید ہوں اور حق تعالیٰ شانہ دنیا و آخرت میں ہماری اس خصوصیت کو قائم رکھے اور دنیا کو ہمارے سے استفادہ کا موقع دے اور ہمیں کتاب و سنت اور علماء ربانی سے استفادہ کا موقع عطاء فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَآ اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِىْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَآ اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

کتابِ خداوندی اور شخصیتِ مقدسہ

ہدایت کیلئے دونوں ضروری ہیں

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ...... ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ ①

احوالِ واقعی...... آپ حضرات کی دعوت پر میں دارالعلوم (دیوبند انڈیا) سے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اس ملک (پاکستان) میں حاضر ہوا اور آپ حضرات سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، سعادت بھی میسر آئی اور اس کا موقع ملا کہ ہم اپنی بساط کے مطابق آپکو فائدہ پہنچائیں اور آپ سے فائدہ حاصل کریں۔ گویا ہماری یہ مجلس ایک دینی مجلس ہے جس کا مقصد افادہ اور استفادہ، فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے، نیز دینی منافع کو ترقی دینا ہے تاکہ ہم لوگ صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور کج راستوں سے بچ کر پھر اسی راستے پر چلیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔

دین کی تاریخ کا اصولِ مُسلّم کہ کتاب کے ساتھ معلم بھی آئے...... دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور دنیا سے زیادہ دین کی تاریخ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہدایت کے دو طریقے مقرر فرمائے ہیں۔ دونوں جمع ہوتے ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ہوتی ہے، دونوں نہ ہوں تو کلیۃً گمراہی رہتی ہے اور دونوں میں سے ایک نہ ہو تو راستہ ٹیڑھا رہتا ہے۔ جب دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی ہے۔ ایک قانونِ خداوندی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ مبارکہ پر آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ نے کتابیں اتاریں۔ تو ایک چیز تو قانونِ الٰہی ہے جو منزل من اللہ ہے،

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

دوسری چیز وہ شخصیتیں ہیں جنکے ذریعہ سے اس قانون کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس قانون کے احکام معلوم ہوتے ہیں، احکام کی علتوں کا اور بنیادوں کا پتہ چلتا ہے، مسائل کے دلائل کا علم ہوتا ہے اور اس کے لئے شخصیتیں اتاری گئیں۔

تو ہدایت کے یہی دو طریقے ابتداء سے لے کر آج تک رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ نے تیس صحیفے نازل فرمائے لیکن صحیفوں کے ساتھ آدم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی بھیجا تا کہ وہ جا کر ان صحیفوں کے مطالب کو سمجھائیں، ان کے احکام پر لوگوں کو مطلع کریں۔ اگر صحفِ ابراہیم علیہ السلام آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بھیجے گئے تا کہ ان صحیفوں کا مطلب سمجھائیں، ان کے مطالب اور معانی دنیا کے آگے پیش کریں اور حق تعالیٰ کی جو مرادات ہیں کہ فلاں آیت کا یہ مطلب ہے، فلاں آیت کی یہ مراد ہے، اس مراد پر لوگوں کو مطلع فرمادیں۔ اگر تورات آئی تو موسیٰ علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔

انجیل آئی تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس بھی دنیا میں بھیجی گئی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کے حقائق سمجھائیں اور مراداتِ ربانی بتلائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار فریضے مقرر فرمائے گئے، جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی وہ ذات بابرکات ہے کہ جس نے امیوں میں رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

تلامذۂ خدا اور اساتذۂ انسانیت ...... رسول ایسے جو خود بھی اُمّی، کسی مکتب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھے ہوتے ...... اس لئے کہ وہ دنیا کو علم دینے کے لئے آتے ہیں، دنیا سے علم لینے کیلئے نہیں آتے۔ حق تعالیٰ براہ راست انکو علم دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام براہ راست حق تعالیٰ شانہ کے تلمیذ اور شاگرد ہوتے ہیں تو جو اللہ سے فیضان حاصل کریں وہ دنیا سے علوم کا فیضان حاصل نہیں کر سکتے تو انبیاء علیہم السلام علم لینے کیلئے نہیں دینے کیلئے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انبیاء کی تعلیم کا ذکر ہے تو حق تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم نے ان کو تعلیم دی ہے، آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی، تمام چیزوں کے نام سکھلائے۔ اسی طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خصوصیت سے تعبیر

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔

خواب کا علم دیا گیا فرمایا ﴿وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ نے آپکو تاویل احادیث کی تعلیم دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِنْ بَأْسِكُمْ﴾ ② ہم نے ہی تو زرہ سازی کا علم آپ کو دیا ہم نے ہی تو آپ کو سکھلایا تاکہ تم کو لڑائی (کے ضرر) سے بچائے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ ہم نے خزانۂ غیب سے آپ کو علم عطا کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ④ اللہ نے آپکو تعلیم دی ان چیزوں کا علم دیا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ کا بہت بڑا فضل اور انعام ہوا جو اپنے خزانۂ غیب سے علم عطاء کیا اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ ⑤ اے پیغمبر! ہم نے آپکی طرف اپنی روح کی وحی کی ہے، علم کو روحِ خداوندی کہا گیا ہے، اسی روح سے اقوام زندہ ہوتی ہیں، کوئی قوم جہالت سے زندگی حاصل نہیں کرسکتی، جس قوم نے زندگی پائی ہے دنیا کی زندگی دنیوی علوم سے اور آخرت کی زندگی اخروی علوم سے ہی پائی ہے۔ زندگی بہرحال علم کے تابع ہے، جہالت سے نہ دنیا چل سکتی ہے نہ آخرت چل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے علم کو روح بتلایا کہ اسی سے اقوام کی زندگی ہے۔

اور فرمایا ﴿مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ﴾ ⑥ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جانتے ہی نہ تھے کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے! آپ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ایمان کے معنیٰ کیا ہیں! ہم نے اپنی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں ایک نور ڈالا، علم کی روشنی ڈالی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب کچھ عیاں ہوگیا۔ تو ہر جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اپنے کو ان کا استاذ ظاہر کیا اور انبیاءؑ کو شاگرد ظاہر کیا ہے۔ تو جو حضرات بلاواسطہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ دنیا کے شاگرد کیسے بن سکیں گے! وہ تو دنیا کے استاذ بنیں گے۔

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کا پانچ برس کی عمر میں استاذی کا واقعہ..... حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر پانچ سال کی تھی ان کی والدہ ماجدہ نے پڑھنے کیلئے مکتب میں بھیجا۔ استاذ کے سامنے بیٹھے تو استاذ نے کہا کہ: کہو الف! فرمایا: الف کے کیا معنی ہیں؟ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ: تُو پھر مہملات (بے معنی چیزوں) کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو استاذ بنا ہے تو جو چیز بتلائی ہے اس کے معنی بھی بتلا اور جس چیز کے معنی نہیں اس کی تعلیم کیسی! وہ تو جاہلانہ تعلیم ہوگی۔ اب وہ استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ عجیب قسم کا شاگرد آیا ہے کہ اس نے میرے اوپر سوالات قائم کردیئے ہیں! تو استاذ نے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ الف کے کچھ معنی ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں! معنی ہیں۔

---

① پارہ: ۱۲ سورۃ یوسف، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۰. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵.
④ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳. ⑤ پارہ: ۲۵ سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲. ⑥ پارہ: ۲۵ سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

استاذ نے پوچھا تجھے معلوم ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں معلوم ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا معنیٰ ہیں؟ فرمایا کہ اپنی استاذی کی جگہ چھوڑ! یہاں شاگردوں کی لائن میں بیٹھ تب بتلاؤں گا۔ استاذ جگہ چھوڑ کے آیا اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا پھر آپ نے الف کے معنیٰ بتلائے اور توحیدِ خداوندی، عظمتِ خداوندی اس طرح ثابت کی کہ استاذ حیران تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے استاذ براہِ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اس لئے وہ عالَم کے استاذ ہیں اور وہ کسی کے شاگرد بننے کے لئے نہیں آتے۔

قانونِ ہدایت ...... تو ہدایت کیلئے اللہ نے ایک قانون رکھا اور قانون کے ساتھ ایک شخصیت رکھی تا کہ اس قانون کے مطالب اور مراداتِ خداوندی لوگوں کو سمجھائیں۔ قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اسی اصول پر نازل کی گئیں۔ قرآن قانونِ حق بن کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات معلم بن کر آئی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی فرمایا: **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا** حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دو جماعتیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک جماعت نوافل میں، تسبیح میں، تہلیل میں اور تکبیر میں یعنی ذکر و عبادت میں مصروف تھی اور ایک جماعت علمی مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی کہ یہ چیز جائز ہے، یہ ناجائز، یہ حلال، یہ حرام وغیرہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: **کِلَا کُمَا عَلَى الْخَيْرِ** دونوں جماعتیں خیر پر ہیں، جو عبادت اور زہد میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے، جو علمی مسائل میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے مگر فرمایا کہ: **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا** میں تو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جہاں مسائل کا تذکرہ ہو رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری حیثیت معلم کی ہے تا کہ دنیا کو علم سے آشنا کروں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلاؤں تا کہ جہالت ختم ہو تو ایک طرف ذاتِ اقدس آئی اور ایک طرف قرآن کریم آیا۔

قرآن کریم واحد اللہ کا کلام ہے ...... اسکے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے اتارے گئے یعنی اور کتابوں کو ہم مجازاً ''کلام اللہ'' کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں کلام اللہ صرف قرآن کریم ہے اس لئے کہ کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے، اس کا تکلم کرے ...... تو تورات کا تکلم نہیں ہوا بلکہ تورات کو الواح پر لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا گیا تو اسے کتابِ خداوندی تو کہیں گے کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، مجازاً کلام اللہ کہہ سکتے ہیں، حقیقی معنوں میں نہیں۔ انجیل کو حق تعالیٰ نے لکھ کر بھی نہیں دیا، تکلم بھی نہیں فرمایا بلکہ حضرت مسیحؑ کے قلبِ مبارک پر اُتارا، اسے مضمونِ خداوندی تو کہیں گے، کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ کلام وہی ہے جس کا تکلم ہو۔

قرآن کریم وہ ہے جس کا اوّل سے لے کر آخر تک حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا ہے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا تو اللہ تعالیٰ سے تکلم واقع ہوا۔ تو کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے اور لکھ کر دیدے تو وہ مجازاً کلام ہے۔ اسی طرح دل میں کوئی چیز ڈال دے تو وہ بھی مجازاً کلام کہلائے

گا، اِس کو مضمون کہیں گے اور اُس کو کتاب کہیں گے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ قرآنِ کریم کا تکلم فرماتے تو اسکی عظمت سے ملائکہ پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی...... جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوش میں رہتے تھے، مگر کچھ مدہوش سے اور بے خود سے وہ بھی ہو جاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو ملائکہ ان سے پوچھتے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ ① اب تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو وہ فرماتے: ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾ ② حق فرمایا اور وہ بلند و بالا ہے عظمت والی ذات ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ہر ہر آیت کا تکلم کیا ہے۔

اس واسطے کہ ''کلام اللہ'' اسے ہی کہتے ہیں کہ الفاظ بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں اور معانی بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں۔ ہم نہ الفاظ میں مُوجد ہیں (اور نہ ہی معانی و مطالب میں اور) ہم تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مُوجد نہیں ہیں، آپ الفاظِ قرآن کے ناقل ہیں، اسی طرح سے معانی کے اندر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ناقل ہیں اور ہم سب بھی ناقل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جو معانی ڈال دیئے انہیں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے آگے پیش فرمایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ مدعی نہیں بلکہ امانت کے ساتھ ناقل ہیں۔ تو امانتِ کاملہ کے ساتھ الفاظِ الٰہی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے اور معانیٔ خداوندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے۔

کتابِ قانون کے الفاظ و معانی کی حفاظت...... چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ جب وحی نازل ہوئی تو ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رٹنے لگتے اور بار بار اس کو پڑھتے تا کہ بھول نہ جائیں تو حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ ③ زبان کو حرکت نہ دیں، جلدی نہ کریں، یہ جو خطرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھول جائیں گے اس کے لیے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ④ ہم گارنٹی دیتے ہیں ہمارے ذمہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں اس کو جمع بھی کر دیں گے اور آپ سے پڑھوا بھی دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا فکر نہ کریں...... جمع کرنا، محفوظ کرنا، پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔

حق تعالیٰ نے وہ ذمہ پورا فرمایا۔ یہ الفاظ کا ذکر ہے اس لئے کہ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ﴾ فرمایا ہے تو قرأت لفظوں کی ہوتی ہے، معنی کی نہیں ہوتی، معنی کی تفہیم کی جاتی ہے قرأت نہیں کی جاتی۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ ⑤ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے تو یہاں تک الفاظ کی حفاظت کی گارنٹی دی، معلوم ہوا کہ الفاظ خداوندی محفوظ ہیں ان میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔
④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آگے معانی کا قصہ تھا تو معانی کے بارے میں بھی فرمایا ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا تو بیان لفظوں کا نہیں ہوا کرتا معانی کا ہوا کرتا ہے، کھول کھول کر معانی بیان کئے جاتے ہیں ، پڑھوانے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں۔ تو الفاظ کی گارنٹی بھی دی گئی معانی کی گارنٹی بھی دی گئی۔ ان میں کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔

کتاب کے ساتھ استاذ کی ضرورت کی وجہ......تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی کے بارے میں بھی امین ہیں، بلا کم وکاست آپ نے وہ معانی بیان فرما دیئے۔ الفاظ کو اس لئے نازل کیا گیا کہ حقائق الفاظ ہی میں چھپے ہوتے ہیں۔ لفظ کا ذرا رد و بدل ہو جائے...... معنی کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ الفاظ تو بعد کی چیز ہیں ایک لفظ ہو لب ولہجہ بدل جائے تو معانی بدل جاتے ہیں اور کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان میں ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" یہ معمولی سا جملہ ہے ہر شخص بولتا ہے، اس کے کئی معنی آتے ہیں اور ہر معنیٰ کا تعلق لب ولہجہ اور طرزِ ادا سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی کیا بات ہے؟ سب سمجھیں گے کہ میں نے سوال کیا ہے کہ بھئی کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ کیا قصہ ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں کہ (واہ!) کیا بات ہے...... اب آپ کیا سمجھے؟ قطعاً یہ نہیں سمجھے کہ میں نے سوال کیا ہے، بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں نے بڑائی بیان کی ہے، تفخیم شان بیان کی ہے کہ فلاں چیز تو بہت بڑی ہے، کیا بات ہے اور اگر لہجہ بدل کے (حقارت آمیز انداز میں) یوں کہوں کہ کیا! بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ بڑائی نہیں سمجھے ہونگے! بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں حقارت بیان کرر ہا ہوں، یہ تحقیر کیلئے ہے اور اگر لب ولہجہ بدل کے (تعجب خیز لہجے میں) یوں کہوں کہ کیا بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ نہ سوال سمجھے، نہ تفخیم شان سمجھے اور نہ تحقیر شان! بلکہ آپ تعجب اور حیرت سمجھے۔ ایک ہی جملہ ہے اور کئی معنیٰ پر دلالت کی۔ بس لب ولہجہ کے بدلنے سے معانی بدل گئے۔

اب فرض کیجئے اگر میں یہ جملہ خط میں لکھ کر آپ کو بھیج دوں تو لفظ تو خط میں آ جائیں گے مگر لب ولہجہ اور طرزِ ادا تو کاغذ میں نہیں آئے گا یا تو متکلم خود آکے لب ولہجہ سے سمجھائے یا اپنا کوئی قاصد بھیجے کہ وہ ادا کر کے بتلائے کہ یہ مراد ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز نہ ہوئی فقط کاغذ سامنے ہوا تو آپ کے نفس پر جو کیفیت غالب ہوئی وہ معنیٰ آپ سمجھ لیں گے، اور وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی آپ کی مراد ہوگی۔ لفظ آپ متکلم کے لیں گے معنی اس میں اپنے ڈالیں گے۔ یہ تلبیس ہو جائے گی، التباس ہو جائے گا کہ لفظ اللہ کے لے لیے اور معانی اپنے ڈال دیئے۔ تو جس طرح سے ہر زبان میں عرف اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، قرآن کا بھی تو ایک عرف ہے اس میں بھی لب ولہجے اور طرزِ ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، ذرا لہجہ بدل دو معانی کچھ کے کچھ ہو گئے۔ ذرا لفظوں کی مراد میں فرق سمجھ میں آ گیا معانی بدل گئے۔

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۹ ۱.

مرادِ باری تعالیٰ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نہ سمجھ پائے ...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ابتدائے اسلام میں حکم یہ تھا کہ روزہ افطار کر کے پھر رات بھر کھانے کی اجازت نہیں تھی گویا سحری نہیں کھاتے تھے بلکہ رات اور دن کا بھی روزہ تھا، بس ایک دفعہ کھانا پینا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگوں پر بھاری گزرا، تحمل نہیں ہوسکا، برداشت سے باہر ہوگیا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمائی اور فرمایا: کہ اللہ نے تمہارے ضعف کو دیکھ لیا ہے اب نیا حکم ہے: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تم تحمل نہیں کر سکتے لہٰذا رات بھر کھاؤ پیو آرام کرو...... یہاں تک کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان لیا جائے اور ممتاز ہو جائے...... اس وقت روزے کی نیت کرو۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دو ڈورے لئے ایک کالا اور ایک سفید اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے۔ اب اس کو دیکھتے رہتے تھے جب تک اندھیرا رہتا کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق گزرے ہوئے تیس منٹ گزر چکے ہوتے، صبح صادق کے بعد کچھ نہ کچھ تاریکی رہتی ہے، کچھ اندھیرا ہوتا تھا، کالے اور سفید ڈورے میں تمیز نہیں ہوتی تھی، لہٰذا تکیہ اٹھایا دیکھ لیا، ابھی دونوں میں تمیز نہیں...... بس پھر کھا رہے ہیں حالانکہ صبح صادق ہو چکی ہوتی۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو فرمایا کہ اے عدی! تم کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ تو میں نے دو ڈورے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں دیکھتا رہتا ہوں (اور کھاتا رہتا ہوں)۔ فرمایا کہ: اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ رات دن دونوں اس کے اندر سما گئے! بندہ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبحِ صادق کی سفیدی اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے، یہ روئی کا ڈورا مراد نہیں ہے۔ ② تو لغت کے لحاظ سے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ غلط نہیں سمجھے تھے لغۃً تو خیط روئی کے دھاگے کو کہتے ہیں، لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے اور عمل بھی صحیح کیا مگر حق تعالیٰ کی وہ مراد نہیں تھی، اس سے مراد رات اور دن ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مراد بتلائی تب ان کے روزے صحیح سمجھے گئے۔

قرآن کا اپنا عرف ...... اس سے اندازہ ہوا کہ قرآن کریم کو محض لغت اور عرف کے بل بوتے پر نہیں سمجھا جاتا قرآن کریم لغتِ عرب میں نازل ہوا ہے، لیکن بہت سے الفاظ میں قرآن کریم نے اپنے معانی ڈالے ہیں، لغوی معنی مراد نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جو عرفِ شریعت میں ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے اس کے معنی رحمت اور دعاء کے تھے بس گھر میں بیٹھے آدمی پانچ وقت دعاء کرلے مسجد میں حاضری کی کیا ضرورت ہے! بس نمازی ہوگیا لیکن اس

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصوم، باب بیان الدخول فی الصوم...... ص: ۸۵۲ رقم: ۲۵۳۳.

طرح نماز نہیں ہوگی۔ لغۃً تو صحیح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعاء مانگنے کے ہیں مگر مرادِ متکلم وہ نہیں تھی بلکہ مراد افعالِ خاصہ ہیں کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ اٹھاؤ، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو تو اس مجموعے کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یا مثلاً حج کا لفظ ہے، حج کے معنیٰ لغت میں قصد کرنے کے ہیں تو گھر میں بیٹھ کے قصد کر لیا اور حاجی ہو گئے! کیا ضرورت ہے کہ ڈیڑھ دو اور چار ہزار روپے خرچ کر کے حجاز پہنچے! لغت کے لحاظ سے تو ''حج'' ہو گیا اور حاجی بن گئے۔ مگر لغوی معنی مراد نہیں، مرادی معنی دوسرے ہیں۔ تو قرآن میں لفظ لغتِ عرب کا ہے معنی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے ڈالے ہیں کہ چند مخصوص افعال کا نام حج ہے، صرف قصد کرنے کا نام حج نہیں ہے۔ ہم لغت کو رد نہیں کرتے مگر اصطلاح یہی ہے گویا عرفی اصطلاح ہے اور اس کو منقول اصطلاحی کہتے ہیں کہ لفظ تو لغتِ عرب کا ہے مگر کسی اپنے معنی کی طرف منقول کر لیا ہے۔ اگر استاذ بتلانے والا نہ آئے تو آدمی وہی سمجھے گا جو لغت کے معنی ہیں..... جب تک معلم آ کر تعلیم نہ دے مرادِ ربانی سامنے نہیں آئے گی۔

ضرورتِ مُعلّم ...... یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا گیا کہ قرآن کے معنی سمجھائیں محض لغوی معنی مراد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت نہیں تھی حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم بیت اللہ کی چھت پر رکھ جاتے اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخہ شفاء ہے اپنا علاج خود کر لیا کرو مگر دنیا میں یہ اصول نہیں ہے کہ طب کی کتابیں دیکھ کر آدمی علاج کرے، جب تک طبیب اور معالج نہ ہو کتاب اصول بتلا دے گی، موازین بتلا دے گی، مقداریں بتلا دے گی نفسیات کو تو نہیں پہچانے گی، موسم کو نہیں پہچانے گی یہ تو طبیب ہی نبض پر ہاتھ رکھ کر پہچانے گا کہ مرض ٹھنڈا ہے یا گرم ہے، مرض ٹھنڈا ہوا تو گرم دوائیں دے گا مرض گرم ہوگا تو ٹھنڈی دوائیں دے گا۔ تو بغیر طبیب کے معالجہ ناممکن ہے یہ بدنی معالجہ ہے وہ روحانی معالجہ ہے، وہاں بدنی اطباء کی ضرورت ہے یہاں روحانی اطباء کی ضرورت ہے۔ بغیر طبیب کے نہ بدن ابھارہ سکتا ہے اور نہ بغیر طبیب کے آدمی کی روح اچھی رہ سکتی ہے دونوں جگہ معالج کی ضرورت ہے تو قرآن نسخہ شفاء ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام حکماء بنا کر بھیجے گئے ہیں وہ اطباءِ روح ہیں جو روح کے نشیب و فراز جان کر نسخہ تجویز فرماتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔

صحیح عنوان اور الفاظ کی ضرورت، عرفی شاعر کا واقعہ ...... بہر حال الفاظ کی ضرورت اس لئے تھی کہ الفاظ ہی کے اندر معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ لفظ اور لہجہ بدل جائے تو معانی ختم ہو جاتے ہیں، عنوان میں معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ عنوان کا لفظ ذرا بدل دیں معانی بدل جائیں گے۔

آپ نے نام سُنا ہوگا عرفی انوری ایران کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس نے بادشاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تو بادشاہ نے خوش ہو کر ایک نہایت اعلیٰ عربی گھوڑا انعام میں اسکو دیا، زین، لگام وغیرہ سونے چاندی سے مرصع اور گھوڑا بھی بڑی اعلیٰ نسل کا تھا۔ انوری گھوڑا لیکر گھر آیا، بے چارہ غریب آدمی تھا گھوڑے کو یہاں گھاس بھی میسر نہ آئی، شاہی اصطبل میں ہوگا تو معلوم نہیں دودھ جلیبیاں کھاتا ہوگا، دانے کہاں کھاتا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ رات ہی رات گھوڑے

بیچارے کا انتقال ہوگیا۔ اب انوری کو فکر ہوئی کہ بادشاہ کو اطلاع تو ہو جائے گی۔ اگر کل اطلاع ہوئی (اور آج میں نے از خود نہ بتلایا) تو بادشاہ بلا کے کہے گا کہ اس نے شاہی عطیہ کی قدر نہیں کی، لہٰذا اس کی گردن اڑا دی جائے تو میں بھی گیا گھوڑا تو گیا ہی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں خود ہی جا کے کیوں نہ اطلاع کردوں تو گھوڑے کے مرنے کی اطلاع دی مگر ایسے اچھے عنوان سے کہ ایک گھوڑا اور انعام میں لیکر آیا۔ کس خوبصورتی سے اطلاع دی اور کہا کہ:

شاہ اسپے بانوری بخشید   بادِ صرصر بہ گرد اونہ رسید

بادشاہ نے انوری کو ایک گھوڑا انعام میں دیا وہ گھوڑا ایسا تھا کہ ہوائیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں اتنا تیز دوڑتا تھا کہ آندھی پیچھے رہ جاتی تھی اور گھوڑا آگے نکل جاتا تھا اتنا تیز رفتار تھا، آگے رفتار کی تیزی کو بیان کیا ہے:

ایں چنیں تیز بود در رفتار   درشباشب بعاقبت می رسید

اتنا تیز رفتار تھا کہ رات کے رات ہی دنیا کا عالم طے کرکے آخرت میں جا پہنچا، اس کی تیز رفتاری کی کوئی انتہا ہے!۔ بادشاہ کو ہنسی آگئی اور کہا کہ اس کو ایک گھوڑا اور دیدو اور اگر یوں کہتا کہ حضور جو مجھے گھوڑا دیا تھا وہ مرگیا تو حکم یہ ہوتا کہ اسے بھی ماردو کمبخت نے شاہی عطیہ کی ناقدری کی ہے۔ تو عنوان کا فرق ہے کسی اچھے اسلوب سے خبر دی تو انعام پایا، برے اسلوب سے خبر دیتا تو اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔

اگر کوئی اپنے باپ کا تعارف یہ کہہ کر کرائے کہ یہ قبلہ میرے والدِ بزرگوار ہیں، باپ خوش ہوگا کہ بیٹا سعادت مند ہے، باپ کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے اور اگر یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہے تو باپ اگر کچھ ناخوش نہیں ہوگا تو خوش بھی نہیں ہوگا، یوں سمجھے گا کہ بھدّا ہے، بے وقوف ہے، اس کو تمیز نہیں ہے، باپ کی عظمت کو کچھ جانتا ہی نہیں اور اگر یوں کہہ کر تعارف کرائے کہ یہ میری ماں کا خصم ہے تو باپ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرے گا۔ حالانکہ بات غلط تو نہیں کہی، ماں کا خصم تھا تب تو صاحبزادے پیدا ہوئے، خصم نہ بنتا تو صاحبزادے کہاں سے پیدا ہوتے؟ تو بات صحیح کہی مگر عنوان بھدّا تھا اور غلط تھا اس واسطے زجر و توبیخ اور سزا کا مستحق ہوا۔

اسلوبِ بیان..... تو عنوان کے اندر مضامین چھپے ہوتے ہیں، الفاظ کا تو اسلوبِ بیان ہوتا ہی ہے اور شاعر تو واقعی اسلوبِ بیان ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ اشعار کو نظم کرتے ہیں تو اعلیٰ مضمون کو اچھی تمثیل و تشبیہ میں ذکر کرتے ہیں۔ لوگ واہ! واہ! کرتے ہیں، داد دیتے ہیں۔ ایک ہی مضمون ایک شاعر بیان کرتا ہے اور اسی مضمون کو دوسرے درجے کا شاعر بیان کرے تو وہ زیادہ انعام لے جائے گا اور یہ کم لے گا۔ حالانکہ بات دونوں نے ایک ہی کہی تو شاعر تو طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کا کھاتے ہیں۔ مجھے اس پر یاد آیا، ہماری اردو زبان کا محاورہ ہے "آنکھ سے آنکھ لڑ جانا" یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے آنکھ لڑ گئی یعنی محبت قائم ہوگئی تو استاذ ذوق نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے، کہتا ہے کہ:

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا   کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

یہ آنکھیں تو لڑنے میں مصروف ہیں مجھے اپنے دل کا خوف ہے۔ آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی! مجھے ڈر ہے دل کا! کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا۔ آنکھیں تو لڑیں گی اور یہ مارا جائے گا گرفتار ہو جائے گا۔ اس واسطے مجھے دل کا فکر ہے تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے مکندرام اس کا نام ہے، اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی وہ کہتا ہے کہ:

دل کی نہیں تقصیر مکند! آنکھیں ہیں ظالم ۔۔۔ یہ جاکے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

دل کا بالکل کوئی قصور نہیں ہے یہ تو آنکھیں ظالم ہیں، یہ سارا قصور ان آنکھوں کا ہے کہ یہ جاکے لڑیں اور دل گرفتار ہوا تو محاورہ ایک تھا، ایک شاعر نے ایک انداز سے ادا کیا، ایک نے ایک انداز سے، ذرا سا عنوان بدلا مضمون کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کو اپنے ہی الفاظ میں نازل کیا ہے کیوں کہ اگر بندے اپنے اپنے الفاظ میں ادا کریں گے تو تغیر وتبدل لازمی ہے اور جب الفاظ میں تغیر ہوگا معانی کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے حالانکہ معانی میں بھی اُمت امین ہے، لفظوں میں بھی امین ہے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کر سکتی۔

معانیٔ قرآن...... بہرحال حق تعالیٰ نے الفاظ میں بھی حفاظت کی گارنٹی دی کہ ہم اس کو محفوظ رکھیں گے اور معانی میں بھی اس کی گارنٹی دی اور معانی...... ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ① وہ بیان ہیں کہ اللہ کی مرادات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ادا فرمایا، وہ بھی وحی ہے، جس کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ تو حدیث قرآن کا بیان ہے، قرآن کی اولین تفسیر حدیث مبارک ہے، اگر حدیث پر اطلاع نہ ہو آدمی کبھی مفسر نہیں بن سکتا۔ حدیث نبوی اوّلین تفسیر ہے جو قرآن کا بیان ہے، فرمایا گیا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾۔ ② اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تا کہ آپ کھول کھول کر اس کی مرادات اور معانی بیان کریں۔ تو ذکر کو نازل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبین قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر جو معانی اترتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ بیان کرتے تھے، تو بیانِ مراد درحقیقت حدیث رسول سے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے قرآن کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے کیلئے بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کریں تو ایک وصیت کی، فرمایا: کہ خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا، سنت سے دلیل پیش کرنا (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واعمال اور احوال سے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تعجب ہوا عرض کیا امیر المؤمنین! قرآن تو وہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول نے مجھے دعا دی ہے، فرمایا: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ③

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج: ۱۲ ص: ۱۰۰۔

اے اللہ! ابن عباسؓ کو کتاب اللہ کی تعلیم دے اور اس کی حکمت ان کے قلب میں ڈال دے، تو میں تو حکمتِ قرآن کا حامل ہوں اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ اس سے استدلال نہ کروں، اس کی کیا مصلحت ہے؟ فرمایا قرآن کے جملے ذی وجوہ ہیں، اصولی جملے ہیں، آپ اپنے طور سے آیت کے ایک معنی بیان کریں گے، فریق مخالف اسی آیت کا دوسرا معنیٰ بیان کردے گا۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق واضح نہیں ہوگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور فعل سے جب آپ دلیل پکڑیں گے اس میں بولنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

قرآن کے معانی میں خود رائی ...... تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کر کے دکھلایا اور جو ارشاد فرمایا وہ بیانِ قرآن ہے اور بیانِ قرآن ہی حدیث ہے۔ انکارِ حدیث کر کے کبھی بھی آدمی قرآن کی مراد نہیں سمجھ سکتا۔ منکرینِ حدیث اسی لئے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن سے اپنی من مانی مرادیں نکالتے رہیں، حدیث بریک لگاتی ہے کہ یہ مراد نہیں ہوسکتی یہ مراد ہے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں...... جو چاہیں مطلب لے لیں، جو چاہیں مراد لے لیں۔ حدیث ان کا راستہ روکتی ہے اس لئے وہ انکار کر گزرتے ہیں۔ ان کا انکارِ حدیث خود غرضی پر مبنی ہے...... جب تک حدیث موجود ہے قرآن میں اپنی من مانی کاروائیاں نہیں کر سکتے۔ حدیث کا انکار کر کے جو چاہے کر لیں پھر وہ دین نہیں رہے گا...... وہ تو آراء کا مجموعہ ہو جائے گا، وہ قیاسات اور آراء ہوں گی اور رائے قرآن میں معتبر نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ① جو قرآن میں رائے زنی کر کے معانی نکالے اُسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ سے ہم اپنے اپنے مطالب نکالیں، میں کہتا ہوں ان کو تو اپنے ایجاد کردہ مطالب نکالنے کا کیا حق ہوگا! خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہ نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کبھی نہیں کیا کہ جب قرآن کی کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ بھائی! اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہوسکتے ہیں، ایک یہ بھی اور ایک یہ بھی اور زمانے کے مناسب یہ معنی ہیں، لہٰذا یہ معنیٰ لے لو۔ ایسا نہیں کیا، الفاظ آگئے تو اس کے بعد آپ منتظر رہتے کہ اللہ اس کی مراد بیان فرمادیں وہ امت کے سامنے بیان کردوں۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسی آیت کا معنی پوچھا تو فرمایا: حق تعالیٰ نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھایا جب وحی آگئی بیان ہوگیا تب فرمایا اللہ نے یہ فرمایا ہے اور اس کی یہ مراد ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کو رائے زنی کا حق نہیں تو زید، عمرو اور بکر کو قرآن میں رائے زنی کا کیا حق ہوگا! اور وہ کیا رائے دیں گے اور اس کا اعتبار اور وقار کیا ہوگا! وہ تو دیوار پر ماردینے کے قابل ہوگی۔ تو اصل چیز قرآن کے الفاظ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور مرادات ہیں۔ ان مرادات کو سمجھانے کیلئے انبیاءؑ آئے، اسی کا نام تعلیم ہے۔ تو دو چیزیں ہوئیں: ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ اور ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ ② کتاب کی تعلیم میں الفاظ بھی بیان کردیئے اور ان کی مرادات بھی

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من قال فی القرآن... ص: ۱۹۴۸۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

بیان فرمادیں۔ تو تلاوت بھی ہوگئی اور تعلیم بھی ہوگئی یہاں تک کہ لوگ سمجھ گئے کہ مراد یہ ہے۔

تعلیمِ حکمت ...... یہ ٹھیک ہے کہ مراداتِ خداوندی سمجھ گئے، مگر انسان کے ساتھ نفس بھی لگا ہوا ہے اور عقلی احتمالات بھی لگے ہوئے ہیں، کل کو یہ احتمال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یہ معنیٰ بھی اس آیت کے اندر داخل ہوں اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ معنی بیان کئے ہیں مگر آیت کے عموم میں یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں تو یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے، تو ممکن تھا کہ احتمالات میں الجھ کر اصل مرادات بھی کھودیں۔ اس لئے ایک تیسری چیز اور فرمائی کہ پیغمبر تلاوتِ آیات، تعلیمِ مرادات کے بعد حکمت کی بھی تعلیم دیں (اور حکمت کی دو قسمیں ہیں) حکمتِ نظری تو یہ ہے کہ مراد سمجھا دو اور حکمتِ عملی یہ ہے کہ عمل کا نمونہ کر کے دکھلایا جائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط حکم ہی نہیں دیا مراد بھی سمجھائی اور عمل بھی کر کے دکھلایا کہ عمل کا نمونہ یہ ہوتا ہے۔ جب نمونہ سامنے آیا تو سارے احتمالات ختم ہوگئے تو یہ بات متعین ہوگئی کہ یہی معنیٰ ہیں اور یہی مراد ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر کے دکھلایا ہے۔

اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ " صلوا کیف ما اتفق "لوگو! نماز پڑھ لیا کرو جس طرح تمہارا جی چاہے۔ بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ "اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔ ① حج کا حکم دیا تو خود حج کر کے دکھلایا کہ یوں حج کرو اسی طرح سے تمام چیزیں ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو...... اس کے نمونے دکھلائے، دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو...... اس کے عملاً نمونے دکھلائے، شادی میں کیا کرو...... اس کے عملی نمونے دکھلائے، غمی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آئی اس کا بھی نمونہ پیش فرمایا، گھریلو زندگی کا نمونہ پیش فرمایا، اجتماعی زندگی کا نمونہ پیش فرمایا...... تو کوئی عملی اُسوہ ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش نہ کر دیا ہو۔

تو قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اعمال کی جامع ہے۔ جو قرآن کہتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کر کے دکھلاتے ہیں وہی قرآن کہتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اتارے ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات عمل کا، اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

اس لئے اگر فقط قرآن سامنے ہوتا تو دس احتمالات نکلتے لیکن جب عمل کا نمونہ سامنے آگیا اور سندِ صحیح کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا اب کسی کو دوسرا احتمال پیدا کرنے کی مجال نہ رہی۔ آیت کا مفہوم علمی اور عملی طور پر متعین ہوگیا۔ تین باتیں ہوئیں آیات کی تلاوت یہ تو قانون کے الفاظ محفوظ کر دیئے کیونکہ الفاظ پر ہی معانی کا مدار ہوتا ہے، قانون ساز مجلسیں دنیا میں بیٹھتی ہیں تو ایک ایک لفظ پر ایک ایک ہفتہ لڑائی ہوتی ہے کہ یہ لفظ رکھا جائے تاکہ یہ مفہوم ادا ہو کیونکہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة. ج:۳ ص:۷ رقم:۵۹۵.

ذرا لفظ بدل گیا تو مفہوم بدل جائے گا تو ایک ایک لفظ پر قانون ساز مجلسیں بحثیں کرتی ہیں، ہفتہ ہفتہ لگ جاتا ہے ، برسہا برس میں قانون کی کتاب تیار ہوتی ہے، بہت سے دماغ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں جو چیز نکھر کر سامنے آتی ہے پھر وہ لفظوں میں بند کی جاتی ہے تاکہ ان لفظوں کے اندر وہی معنی آئیں جو مراد ہیں۔ قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے وہ ہماری کسی مجلس کا بنایا ہوا تو ہے نہیں کہ ریزولیشن پاس کرلیا کہ اس کو آیت سمجھ لیا کرو کہ یہ آیت ہے، وہ بندوں کی تجاویز نہیں ہیں، وہ اللہ کا کلام ہے تو لفظ بھی اترے اور وہی لفظ اترے جن میں اللہ کی مرادات چھپی ہوئی ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ بھی تلاوت کئے اور دوسری چیز معانی الگ سمجھائے، عمل کر کے بھی دکھلایا لیکن ایک بات اور باقی تھی کہ آیت کے لفظ بھی آگئے معانی بھی آگئے، مراد بھی سامنے آگئی لیکن اگر دل میں کجی اور ٹیڑھا پن باقی ہے تو ہر چیز آدمی غلط سمجھے گا۔ جب دل میں زیغ اور الٹا پن ہے تو کتنا ہی صحیح معنی بیان کرو اوندھا ہی سمجھے گا، اس لئے کہ اس کی سمجھ ہی اُوندھی ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن میں نصرانی زیغ لیکر اُترے تو ہر لفظ سے نصرانیت کا طریق معلوم ہوگا کہ سارے قرآن میں نصرانیت ہی بھری ہوئی ہے، ہر لفظ سے وہی نکلتی ہوئی نظر آئیگی اگر یہودی ذہنیت لیکر آئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر آیت میں سے یہودیت نکل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے عموم سے وہ وہی فائدہ اٹھائے گا جو اس کے دل کے اندر ہے اور دل ٹیڑھا ہے تو تیسری چیز ہے تربیت۔

تزکیۂ قلوب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تربیت...... اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں الفاظ پیش کئے جائیں معانی پیش کئے جائیں عمل کا نمونہ دکھایا جائے، وہاں دلوں کو بھی مانجھا جائے تاکہ ٹیڑھ بالکل نکل جائے اور قلب کے اندر استقامت پیدا ہو۔ اس کیلئے مجاہدے کی، ریاضت کی، کثرتِ ذکر کی اور کثرتِ نوافل کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ قلب کا تعلق اللہ سے صحیح قائم ہو اور جو چیز اُتر کر آئے وہ صحیح طور پر آدمی کے دل میں آئے، دل اُلٹا نہ ہو کہ اوندھی چیز سمجھ میں آئے...... اسی کو ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ① میں بیان فرمایا گیا کہ نفوس کا تزکیہ کرو اور نفوس کو مانجھو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نفوس کو مانجھا بھی اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کیا۔ مکہ کی زندگی درحقیقت تزکیہ کی زندگی تھی مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرہ برس گزرے ہیں۔ اس میں یہ حکم تھا کہ اگر تم پر کوئی سختی بھی کرے تو جواب مت دو، کوئی مارے تو چپ رہو، کوئی گالیاں دے تو جواب مت دو، بس اتنا کام ہے کہ کلمۂ حق کہتے رہو...... باقی مقابلہ، مناظرہ اور مجادلہ مت کرو۔ قرآن میں فرمایا گیا: ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ ② درگذر کرو، مقابلہ مت کرو دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوتوال بنا کے نہیں بھیجا گیا داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اگر حق کے راستہ میں سختی آئے تو اُسے آپ جھیلیں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ④ آپ صبر کریں جس طرح اولوالعزم انبیاء نے

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۸۵.

③ پارہ: ۳۰ سورۃ الغاشیۃ: الآیۃ: ۲۲. ④ پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵.

صبر کیا ہے۔ مار کا جواب مار سے، لاٹھی کا جواب لاٹھی سے اور گالی کا جواب گالی سے نہ دیں، صبر وتحمل اختیار کریں۔

تو پہلا مجاہدہ تو یہی تھا کہ اڑی کڑی جھیلو! سختیاں سہو! اور اُف تک نہ کرو۔ اولاً اس سے قلوب منجھے، پھر انہی حضرات کو ریاضتیں کرائیں، رات کو نوافل میں مصروف، دن کو تسبیح وتہلیل میں مصروف اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کی نگرانی فرماتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی رات کی زندگی کیسی ہے! دن کی زندگی کیسی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو گھومتے تھے کہ کسی گھر کے اندر سے کوئی بُری آواز تو نہیں آ رہی! ان کی گھریلو زندگی صحیح ہے یا غلط ہے!۔

حضور کا شیخین کو اعتدال کا حکم...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو ترقُّب کے طور پر (گویا نگرانی کے طور پر) اُٹھے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر سے گزر ہُوا تو وہ قرآن کریم اتنا آہستہ پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سننا بھی مشکل تھا گویا بہت ہی آہستہ آہستہ۔ آگے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکان آیا تو وہ اتنے زور سے پڑھ رہے تھے کہ سارا محلہ گونج رہا تھا گویا بہت زور سے۔ صبح کو دونوں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! ''لَا اَدْعُوْ اَصَمَّ وَلَا غَائِبَ'' میں اُسے پکار رہا تھا جو غائب بھی نہیں ہے اور بہرہ بھی نہیں ہے۔ میں تو پروردگار کو سُنا رہا تھا جو ہر وقت حاضر وناظر ہے مجھے چلّانے کی کیا ضرورت ہے! ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ① میں آہستہ ہی تو پڑھ رہا تھا اور اللہ تو دل کی کھٹک کو بھی سنتا ہے، مجھے چلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا چلّا کے کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے اپنی شان کے مطابق جواب دیا کہ: اُطْرِدُ الشَّيْطَانَ وَاُوْقِظُ الْوَسْنَانَ سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ چونکہ وہ أَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللهِ عُمَرُ ہیں تو وہی شدت ان کے عمل میں بھی ہے۔ یہ اَرْحَمُ اُمَّتِيْ بِاُمَّتِيْ اَبُوْ بَكْرٍ ہیں ان کے ہاں رحمت، دھیما پن اور نرمی چھپی ہوتی ہے تو انہوں نے اپنی شان کا جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو کچھ بلند کر دو اور اے عمر! تم ذرا پست کرو تا کہ اعتدال قائم ہو جائے، افراط تفریط سے عمل بچ جائے۔ ② یہ جائز ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا زور سے پڑھنا بھی جائز ہے اور آہستہ بھی۔ یہ دلوں کی کَلیں درست کرنے کا مسئلہ تھا کہ دل کی رفتار اعتدال پر آ جائے نہ افراط ہو نہ تفریط، نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ اس لئے کہ اسلام کا اصول ہی یہ ہے کہ اخلاق میں اعتدال، اعمال میں اعتدال، عقائد میں اعتدال...... الغرض ہر چیز میں اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔

ہر عمل میں اعتدال...... اعمال کے بارے میں فرمایا: لَا تُشَدِّدُوْا فَيُشَدِّدَ اللهُ عَلَيْكُمْ ③ اعمال میں شدت مت اختیار کرو کہ اللہ بھی تم پر شدت کرنے لگے۔ اور پھر کسی شدت کا مطالبہ ہو اور نباہ نہ سکو اور گناہگار بنو تو تشدد

---

① پارہ:۸، سورۃ الاعراف: الآیۃ ۵۵۔ ② مسند احمد، ومن مسند علی ابن ابی طالب ج:۲ ص: ۳۲۹، رقم: ۸۲۳.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، ج:۱۳ ص: ۷۵۷ رقم: ۴۲۵۸، ولفظه: فیشدد علیکم.

مت کرو، اطمینان اور درمیانہ چال کے ساتھ عمل کرو۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا مسجد میں عبادت کیا کرتی تھیں تو ایک رسی چھت میں لٹکا دی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے فرمایا یہ کیسی ہے؟ عرض کیا گیا: اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں جب نیند آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا پکڑ لیتی ہیں تا کہ نیند میں جھونکے نہ کھائیں۔ اور عبادت میں مصروف رہیں فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب نیند آئے پڑ کے سو رہو: لَاتَـفْـرِيْـطَ فِي النَّوْمِ نیند میں کمی مت کرو جتنی عادتِ طبعی ہے اسے پورا کرو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال میں اعتدال رکھو اتنا دوڑ کے مت چلو کہ آگے جا کر ٹھوکر لگے اور گر جاؤ اور پھر چلنے کے قابل نہ رہو۔ دوسری جگہ فرمایا: ''سَـدِّدُوْا وَقَـارِبُـوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَيْئٌ مِنَ الدُّلْجَةِ'' ① نرمی سے چلتے رہو۔ درمیانی چال چلتے رہو کچھ دن میں اللہ کی عبادت کرو، کچھ رات میں اللہ کا نام لے لیا کرو مگر اتنا جس کو نباہ سکو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصول بیان فرمایا: ''خَيْرُ الْاَعْمَالِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ وَاِنْ قَلَّ'' ② بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی ہو چاہے وہ تھوڑا ہو۔ بہت سا عمل کیا اور تھک کر مہینہ بھر بیٹھ گیا تو وہ غلط ہے اور تھوڑا کیا اور اتنا سست کیا کہ اصل مقصد بھی ادا نہ ہوا...... دونوں چیزیں افراط ہیں یا تفریط ہیں۔ اسی لئے حکم ہے درمیانی چال چلو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر نیند آئی ہے تو اسکی کیا ضرورت ہے کہ رسی تھام کر عبادت کرو، رہبانیت اختیار کرو بلکہ اعتدال کے ساتھ چلو، نیند آئے تو پڑ کے سو رہو، جب آنکھ کھلے پھر اللہ کا ذکر کرو، یادِ خداوندی کرو۔ تو بہر حال اسلام میں اعتدال ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگرانی فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ذرا آواز پست کر لو، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ذرا اونچی کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔ یہ جائز و نا جائز کا مسئلہ نہیں تھا جو شرع کا موضوع ہے یہ دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی۔

دردِ دل کا علاج...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل کی تربیت اور تزکیہ بھی فرماتے تھے۔ دلوں میں کھٹک پیدا ہوتی تو فوراً علاج فرماتے تھے، اس کا جائز و نا جائز سے تعلق نہیں تھا، قلب کی کیفیات سے تعلق تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ہم میں ایمان باقی نہیں ہے اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں تو ایمان اور عمل دونوں کا خانہ درہم برہم ہو گیا ہے تو عمل مقبول نہیں ہوگا (اس لئے عمل کرنے کا کیا فائدہ! گویا عمل میں تعطل پیدا ہوا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کیا ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ایمان باقی نہیں رہ سکتا؟ فرمایا: کیا وسوسہ ہے؟ عرض کیا دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ؟ زمین کس نے بنائی؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنائی۔ سوال ہوتا ہے کہ آسمان کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنایا۔ چاند اور سورج کس نے بنائے؟ کہ اللہ نے بنائے۔ ان سارے جوابات سے دل میں ایک

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ص: ۵۴۳ رقم: ۶۴۶۳.

② الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ص: ۵۴۳ رقم: ۶۴۶۲.

اصول پیدا ہوتا ہے کہ ہر موجود کیلئے مُوجد کی ضرورت ہے، ہر بنی ہوئی چیز کیلئے کوئی بنانے والا ہونا چاہیے۔ بغیر بنانے والے کے شئی نہیں بنے گی تو ہمارے دل میں یہ خطرہ آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے پھر اس کو کس نے بنایا؟ (نعوذ باللہ منہ) اور جب یہ دل میں وسوسہ آ گیا تو کہاں ایمان باقی رہا!۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علاج فرمایا اور ایک منٹ میں علاج ہو گیا فرمایا کہ: یہ جو وسوسہ آتا ہے اسے اچھا سمجھتے ہو یا بُرا؟ عرض کیا کہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے، یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ یہی تو کھلا ایمان ہے۔ ① وہ ایمان ہی تو بتلا رہا ہے کہ یہ وسوسہ بُرا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دل وسوسوں کو قبول کرتے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ایمان نہیں رہا...... حالانکہ ایمان تھا تو اس وسوسہ کو بُرا جانا، ایمان نہ ہوتا تو کبھی بھی بُرا نہ جانتے۔ یہی ایمان کی علامت ہے جیسے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ ② نیکی کر کے دل میں خوشی ہو اور بدی کر کے طبیعت میں انقباض پیدا ہو تو تم مؤمن ہو۔ اگر نیکی کر کے خوشی نہ ہو اور بدی کر کے کدورت نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نہیں ہے، عادت پڑی ہوئی ایک رسم ہے، وہ عملِ صالح نہیں ہے۔ تو اصل چیز یہی ہے کہ قلب درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا: وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ ③ انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا (گاجر اور صنوبری شکل کا) ہے اگر وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے اور وہ دل ہے اور وہ غلط ہے تو نیت بھی غلط، عمل بھی غلط، ارادہ بھی غلط، جذبات بھی غلط...... ہر چیز اول سے لے کر آخر تک غلط ہوتی چلی جائے گی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا موضوع دل اور فلاسفہ کا موضوع دماغ تھا...... اس واسطے انبیاء علیہم السلام نے قلبِ انسانی کو اپنا موضوع ٹھہرایا ہے کہ قلب کو درست کر لو تاکہ سارا انسان درست ہو جائے جیسا کہ فلسفیوں نے اپنا موضوع دماغ ٹھہرایا ہے کہ عقل درست کر دو تو دنیا کی زندگی بن جائے گی۔ آدمی چاہے برباد ہو جائے وہ عقل سے کام لیتے ہوئے محض اسی کو درست کرتے ہیں تو عقل سے آدمی کچھ آرائش اور کچھ زینت کر لے گا لیکن عقل سے قلوب سنور جائیں یہ ممکن نہیں قلوب تو ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے سنبھلیں گے، قلوب کو سنوار نا عقل کا کام نہیں ہے۔

فلسفیوں نے عقل کو موضوع ٹھہرایا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دل کو موضوع ٹھہرایا۔ وہ دل درست کرتے ہیں تاکہ سارا انسان درست ہو جائے اور فلاسفہ دماغ درست کرتے ہیں۔ اس سے دماغ درست ہو جاتا ہے قلب

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الوسوسة فی الایمان، ص: ۳۵۲۵.

② مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلیؓ ج:۴۵ ص: ۱۴۰ رقم: ۲۱۱۴۵.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه، ص: ۲، رقم: ۵۲.

چاہے برباد ہو، قلب کے اخلاق چاہے تباہ ہو جائیں، اعمال برباد ہو جائیں، اس سے انہیں غرض نہیں بس عقل کی سوچی ہوئی زینتیں اور آرائشیں باقی رہ جائیں، لیکن ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا نہ دنیا بنتی ہے نہ آخرت بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے ہر اگلے نے پچھلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی ہے اور کہا کہ میرے اوپر اس وقت تک ایمان نہیں بنے گا جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے، حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام انبیاء پر جب تک ایمان نہ ہو..... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تو مجھ پر بھی ایمان نہیں۔ چنانچہ اعلان فرمایا کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ② کہہ دو اور علی الاعلان پکار کر کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اللہ نے جو ہم پر نازل کیا اس پر اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر اور جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لائے۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ③ ہم ان میں تفریق نہیں کرتے یکساں طور پر سب کو اللہ کا حقانی فرستادہ جانتے ہیں۔ تو ہر نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی اور پھر ہر آنے والے نے اپنے بعد آنے والے کی پیشین گوئی کی کہ اس کی بات ماننا ورنہ مجھے بھی نہیں مانا۔ تو یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ اگلے پچھلوں کی تصدیق کر رہے ہیں اور پچھلے اگلوں کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور اس کے بالکل برعکس فلاسفہ میں سے جو اگلا آتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا نظریہ درست ہے پچھلے سارے احمق تھے، انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ ایک نے کہا کہ زمین حرکت کرتی ہے، سورج حرکت نہیں کرتا، پچھلے لوگوں نے کہا تھا کہ زمین ساکن ہے، وہ غلط کہتے تھے وہ احمق تھے، تو انکی تحمیق کی اور اپنا نظریہ ثابت کیا۔ کسی نے کہا کہ عالم قدیم ہے اور جس نے کہا کہ حادث ہے وہ احمق تھا۔ کسی نے کہا کہ حادث ہے اور قدیم کہنے والا احمق تھا۔ تو ہر ایک دوسرے کی تحمیق اور تجہیل کرتا ہے اس کے معنیٰ ہیں کہ سارے احمق ہیں اور سارے جاہل ہوں گے۔

جب ہر ایک دوسرے کو احمق بتلا رہا ہے تو دانش مند کون باقی رہا؟ اُس کے نزدیک یہ احمق، اِس کے نزدیک وہ احمق۔ تو فلسفہ کیا ہوا یہ تو حماقتوں کا مجموعہ ہو گیا گویا ہر ایک دوسرے کو جھٹلا رہا ہے تو ایک مسلمان کا مدار تصدیق پر ہے تکذیب پر نہیں ہے اور تصدیق ہی ایمان کا نام ہے گویا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، نہ ماننے کو تو کفر کہتے ہیں اور ماننے کا تعلق قلب سے ہے، اسی واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام نے قلوب کا سلسلہ اختیار کیا کہ قلب کو درست کیا جائے۔

اُمّت کے فرائض...... بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چار فریضے عائد کئے گئے: تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب، تعلیم اسوہ اور تزکیہ نفوس۔ یہ پوری اُمت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۶۔ ② ایضاً

ہے۔ یہی چاروں فریضے ان پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ اس کا فریضہ ہے کہ پہلے تلاوتِ آیات کرے، قرآن کی آیات کے الفاظ پڑھ کر سنائے، ایسے مدارس ہوں جن میں قرآن کے الفاظ سکھلائے جائیں، خواہ ناظرہ پڑھائیں یا حفظ پڑھائیں مگر قرآن کے الفاظ محفوظ رہیں کیونکہ انہی الفاظ میں معانی ہیں۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ امت میں معلمین بھی ہوں تا کہ وہ تعلیم دیں۔ اس واسطے کہ دین کے بارے میں رائے معتبر نہیں۔ قرآن ہو یا حدیث...... وہ نقل کی جائے گی اور سلف کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کے معنی متعین کئے جائیں گے۔ اگر سلف کا دامن چھوٹ گیا اور رائے زنی آ گئی تو ہوائے نفس پیدا ہوگی۔ نفس میں آزادی پیدا ہوگی تو آدمی دین کا متبع نہیں رہے گا نفس کا متبع بن جائے گا۔ اس واسطے ہوائے نفس سے روکنے کیلئے اس کی ضرورت ہے کہ تعلیم مراد بیان کی جائے کہ اللہ کی یہ مراد ہے اور یہ بغیر تعلیم کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ معلم کہتے ہی اس کو ہیں جو مرادات اور مطالبِ خداوندی کو بیان کر دے۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ عمل کا نمونہ بھی کر کے بتلائے۔ ہم آج جو نماز پڑھتے ہیں محض اس لئے صحیح نماز پڑھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو دیکھتے ہیں اگر پڑھنے والوں کا نمونہ سامنے نہ ہوتا کبھی نماز صحیح نہ پڑھتے فقہ کی آپ ساری کتابیں دیکھ لیں رکوع سجدے کے معنیٰ معلوم کر لیں اس وقت تک نماز پڑھنی نہیں آئے گی جب تک نمازیوں کی ہیئت سامنے نہیں ہوگی، اس ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اگر آپ محض کاغذوں سے نماز اخذ کریں گے تو دس ہزار قسم کی نماز ہو جائے گی کیونکہ عقلیں مختلف ہیں، اپنی اپنی عقل سے جو جس کی سمجھ میں آ گیا اسی پر عمل کرے گا۔ تو نماز کے ہزاروں ڈھنگ بن جائیں گے۔ ایک دین کے لاکھوں دین بن جائیں گے۔ اس لئے ان بیانات کا پابند ہونا پڑے گا جن سے اسوہ اور عمل نبوی متعین ہو، اسی کی پیروی کرنا پڑے گی۔ اسی طرح مرادات میں پیروی کرنی پڑے گی۔ رائے کا دخل نہیں ہوگا۔ اگر قرآن کے محض الفاظ کو سامنے رکھ لیں اور کوئی معلم و مربی نہ ہو تو ضروری نہیں کہ ہم مرادِ ربانی سمجھ جائیں بلکہ آپ کے نفس میں جو کیفیت غالب ہوگی وہی معنیٰ آپ سمجھیں گے تو لازمی ہے کہ آپ متعین طریق پر وہی سمجھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سمجھایا ہے...... وہ وہ ہے جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو سلف اور آئمہ کو سمجھایا...... آپ بھی وہی سمجھیں گے تو ٹھیک، ورنہ اس کے بغیر آپ مراداتِ ربانی تک نہیں پہنچ سکتے۔

کتاب اور شخصیت دونوں ضروری ہیں...... تو کتاب کی بھی ضرورت ہے، لیکن نہ محض کتاب کافی ہے نہ محض شخصیت کافی۔ اگر شخصیت تنہا ہو اور کتاب اللہ سامنے نہ ہو تو شخصیتوں پر ذاتی احوال بھی تو گزرتے ہیں، ان ذاتی احوال میں کچھ ان سے دائرۂ قانون سے باہر افعال بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے سارے افعال کو ہم شریعت تسلیم کر لیں تو شریعت اور غیر شریعت مخلوط ہو کر رہ جائے گی، اصلی دین باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح غلط اقوال اور احوال ہیں مثلاً ایک شخص صاحبِ حال ہے، اس حال میں اس نے ایک وجد یہ کلمہ کہا اپنے نزدیک وہ سچا

ہے، حال بھی درست ہے مگر وہ قانون نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو تلقین کریں۔ قانون وہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

اگر منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اَنَـا الْـحَقُّ کہا تو یہ کوئی قانون نہیں کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا جائے کہ لوگو! تم بھی "اَنَا الْحَقُّ" کہا کرو حالانکہ ہم یہ کہیں گے کہ منصور کا دعویٰ حق ہے کیونکہ وہ فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے اور فنا کے مقام پر پہنچ کر اپنا نفس اوجھل ہوتا ہے اپنے نفس میں بھی نگاہ کرتے ہیں تو جلوۂ خداوندی ہی نظر آتا ہے ایسے میں کوئی اَنَا الْحَقُّ کہے تو اس کے سامنے اس کا نفس ہی نہیں۔ اَنَا تو وہاں ہے ہی نہیں وہاں تو انت ہی انت ہے آپ ہی ہیں جہاں کہیں ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیرِ تو نیست   یا توئی ، یا خوئے تو یا بوئے تو

میں دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہوں تیرے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی یا تیری ذات ہے یا "خوئے تو" تیری صفات ہیں یا بوئے تو تیرے افعال ہیں، ان سے دنیا آباد ہے۔ تو اس مقام پر جو پہنچ جائے اس کا نفس بھی ختم ہو جاتا ہے دنیا بھی ختم ہو جاتی ہے اور جلوہ حق ہی بس سامنے رہ جائے گا۔ وہ باہر دیکھے گا تو کہے گا: اَنْتَ الْحَقُّ اپنے اندر دیکھے گا تو اَنَا الْحَقُّ کہے گا تو وہاں (منصور کے ہاں) "اَنَا" اپنے لئے نہیں ہے، نہ "اَنْتَ" دوسروں کیلئے ہے۔ وہ تو حق کا اظہار کرتا ہے تو منصور کی زندگی کو ہم بھی سچی سمجھتے ہیں، لیکن وہ قانون نہیں ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر آپ تلقین کریں۔ قانون تو صرف شریعت ہے جس کی تلقین کی جائے گی۔ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے اور شریعت قانونِ عام کا نام ہے۔ ہر کس و ناکس کیلئے جو پیغام ہے وہ شریعت ہے۔ شخصی احوال میں جب آپ اس حال میں پہنچ جائیں گے تو ہم آپ کو سچا جانیں گے، آپ کی عظمت کریں گے اس حال کو بھی سچا جانیں گے مگر اسے قانون بنا کے پیش نہیں کریں گے، ہر شخص کا حال الگ الگ ہے، ایک کا حال دوسرے کیلئے حجت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال قانونِ عام شریعت ہے، اسٹیج پر اسی کو پیش کیا جائے گا۔ زید، عمرو، بکر اپنے حال کو پیش نہیں کر سکتے ..... صرف قولِ پیغمبر پیش ہوگا اور افعالِ پیغمبر پیش ہوں گے، وہی شریعت ہیں، کسی اور کا قول و فعل شریعت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی میرا حال ہے اور صحیح ہے تو اللہ کے ہاں مقبول ہوں، حال غلط ہے اللہ کے ہاں نامقبول۔ بہر حال وہ پھر بھی شخصی بات ہوتی ہے قانونی بات نہیں ہوتی۔ اس واسطے قانون کی ضرورت پڑی اور قانون کے ساتھ شخصیت کی بھی۔ تو محض شخصیت ہو تو شخصیتوں کا مذاق ہو جائے، خاندان پرستی اور شخصیت پرستی شروع ہو جائے گی اور شخصیت سے جو سرزد ہو جائے وہ شریعت بن جائے گا، شریعت غیر شریعت مخلوط ہو جائے گی۔ اس لئے شخصیتوں کے حال کیلئے "کتاب اللہ" کسوٹی ہے اس پر پرکھ لو، اگر اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے مطابق نہیں ہے تو سکوت اختیار کرو۔

تو شخصیت اور کتاب دونوں کی ضرورت ہے پیغمبر کی بھی ضرورت ہے اور قانونِ الٰہی کی بھی ضرورت ہے۔ نہ

محض قانون کافی، نہ محض ذات کافی ہے۔ پیغمبر کی ذات تو معصوم ہے لیکن بعد میں جو ذوات آئیں گی وہ تو معصوم نہیں ہیں، غلط فہمی بھی لگی ہوتی ہے، غلط احوال بھی لگے ہوتے ہیں...... جب یہ ساری چیزیں شریعت بن جائیں گی تو شریعت اور غیر شریعت خلط ملط ہو جائے گی، دین کے اوپر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لئے شخصیتوں کو کتاب کے معیار پر پرکھیں گے اور کتاب کے معانی شخصیتوں سے سمجھیں گے اسی طرح سے دین چلے گا۔ اور صحیح ہدایت پر لوگ پہنچیں گے۔

کیا صحابہ کرام اور اولیاء اللہ معیارِ حق ہیں...... تو میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر قیامت تک ہدایت کے یہی دو طریقے مقرر کئے ہیں ایک قانون خداوندی اور ایک شخصیت جو کہ مقبول شخصیت ہو اور وہ انبیاء کی شخصیتیں ہیں جو کہ معصوم ہیں۔ اولیائے کرام کی عظمت واجب ہے، گو وہ معصوم نہیں مگر خاص مقربین اور اولیاء اللہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں، من جانب اللہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے، ان کو من جانب اللہ برائی سے روکا جاتا ہے، اگر نفس لے بھی چلے تو اللہ تعالیٰ اس طرف انہیں جانے نہیں دیتے، حفاظت خداوندی شامل حال ہوتی ہے...... مگر اس کے باوجود امکان ہے کہ ان کا عمل غلط ہو جائے اور جب امکان آ گیا تو قطعیت نہ رہی اور دین قطعی حکم کا نام ہے، ظنی اور امکانی چیز کا نہیں۔ اس لئے انبیاءؑ کی حد تک تو بات صحیح ہے کہ ان کا جو قول و فعل ہے وہ شریعت ہے لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ بات نہیں ہے کہ ان کا ہر قول و فعل شریعت بنا دیا جائے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریعت کا معیار تو نہیں ہیں کہ وہ شریعت بنا دیں، وہ شریعت بنائیں گے تو نہیں، البتہ شریعت کے متبع ہیں تو شریعت کے حق میں تو معیار نہیں کہ وہ شریعت بننے لگیں۔ لیکن فرقوں کے حق میں اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں معیار قرار دیا ہے، فرقوں کا حق و باطل صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ پرکھا جائے گا، حدیث میں فرمایا گیا: ''اِفْتَرَقَتْ بَنُوْ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً'' بنی اسرائیل بہتر فرقوں پر بٹ گئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹے گی، کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃً سب کے سب عقائد کی وجہ سے اہل جہنم بنیں گے، صرف ایک ہی فرقہ حق پر رہے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: مَنْ ھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ وہ کون ہوں گے؟ فرمایا: مَا اَنَا عَلَیْہِ الْیَوْمَ وَاَصْحَابِیْ (1) جس طریقہ پر آج میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم قائم ہیں وہی فرقوں کے حق و باطل پہچاننے کا معیار ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے ساتھ شامل کیا یعنی جس سے فرقوں کے حق میں معلوم ہو کہ کون سا فرقہ باطل ہے یا حق ہے؟ اس کیلئے نبی کریم کی ذات بھی معیار ہے اور آپ کی ذاتِ عالی کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی معیار ہیں۔

---

(1) السنن للترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ ج: ۹ ص: ۲۳۵ رقم: ۲۵۶۵.

اس لئے پہلی چیز ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی فرقے کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو یقیناً وہ باطل ہے لہٰذا پہلی بات تو یہ ہوئی اس لئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ'' ① جو میرے ساتھ محبت کرے گا اس محبت کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت آئے گی جو میرے ساتھ بغض رکھے گا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی اُسے بغض پیدا ہوگا اور عام لفظوں میں فرمایا کہ ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِيْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ'' ② نسبت کی وجہ سے عربوں کی محبتِ ایمان کی علامت ہے اور ان کا بغض نفاق کی علامت ہے۔ بہرحال فرقوں کے حق میں پہلی بات یہ دیکھیں گے کہ ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے تو کہیں گے یہی باطل ہونے کی علامت ہے تو محبت لازمی ہے، اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو وہ فرقہ حق نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق محض تاریخی نہیں ہے کہ انہوں نے سنداً دین کی روایتیں ہم تک پہنچا دیں اور ہم نے قبول کرلیں۔ گویا وہ محض چٹھی رساں نہیں ہیں کہ انہوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے وہ پوری امانت اور دیانت سے پہنچا دیا اور اس سے زیادہ کوئی کام نہیں کیا، ایسا نہیں! یہ تو تاریخی واسطہ ہوا، صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق عشقی اور محبتی ہے، حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم عاشق ہیں اور عاشق کا کام یہ ہے کہ اپنے محبوب کے اندر محو ہو، وہ محبوب کے اوپر تنقید نہیں کرے گا کہ یہ کام غلط کیا! یہ حسن و جمال غلط ہے! یہ چیز اس کی صحیح نہیں ہے!...... وہ عاشق ہی کیا ہوا جو ایسا ہو! صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عشقی تعلق ہے، محض تاریخی تعلق نہیں ہے۔

اس واسطے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرقوں کے حق و باطل کے پہچاننے میں معیار بنیں گے پھر دیکھا جائے گا کہ ان کے عقائد صحابہ رضی اللہ عنہم کے عقائد کی مانند ہیں کہ نہیں! مطابق ہیں تو حق پر ہیں، اگر نہیں ہیں تو باطل پر ہیں۔ اس حد تک صحابہ رضی اللہ عنہم معیار ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے شریعت تو نہیں بنتی کہ وہ بنا دیں کہ یہ شریعت ہے البتہ فرقوں کے حق میں صحابہ رضی اللہ عنہم کسوٹی ہیں۔ اس پر نقد اور تبصرہ کرکے ہم پہچان لیں گے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے۔ تو جو صحابہ سے عداوت رکھے گا وہ بھی باطل، جو بغض رکھے گا وہ بھی باطل، جو گالم گلوچ کرے گا وہ بھی باطل ہے، تو ایسے تمام فرقے باطل پرست ہوں گے اور جو عشق و محبت کرے اور عظمت کرے...... وہی فرقہ حق پر ہوگا۔

صحابہ کا کمالِ تقویٰ...... اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ ③ تمام صحابہ

---

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی ﷺ ج: ۱۴ ص: ۱۶۰.

② الحدیث اخرجه البیهقی فی الشعب ولفظه: حب العرب ایمان وبغضهم نفاق، ج: ۴ ص: ۱۴۲.

③ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، ج: ۱ ص: ۲۴۷.

رضی اللہ عنہم متقن اور عادل ہیں۔ قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، کہیں فرمایا: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، کہیں فرمایا: ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ ② اللہ نے پہلے ہی جانچ لیا تھا انکے دلوں کو کہ یہ تقویٰ شعار ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالِ تقویٰ کی شہادت قرآن نے دی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کسی صحابی سے کوئی غلطی ہو جائے ...... حتیٰ کہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہم سے معصیت بھی ہوسکتی ہے مگر یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ ایک متقی آدمی بھی گناہ کرسکتا ہے، وہ گناہ تقویٰ کے خلاف ہے جس کی جڑیں دل میں جمی ہوئی ہوں، دل میں تقویٰ جما ہوا ہو...... باہر سے یا گردو پیش کے حالات میں مبتلا ہو کر گناہ کر گزرے اور اندر سے دل میں نفرت کی اور توبہ کی، دل سے نادم ہوا تو یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت قرآن نے دی ہے، اگر کوئی عملی غلطی ہو جائے تو ان کے تقویٰ میں ذرہ برابر فرق نہیں پائیں گے ،قرآن کریم میں خود فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ③ وہ لوگ متقی ہیں اگر شیطان کا کوئی گروہ انہیں چھوجاتا ہے اور کسی گناہ پر مائل کرتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کہاں آگیا، لاحول پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان چھو تو سکتا ہے اور اپنا اثر بھی ڈال سکتا ہے مگر پھر بھی کہا گیا کہ یہ لوگ متقی ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت اللہ نے قرآن میں دی ہے، عمل میں کوئی غلطی ہو تو اس کا امکان ہے لیکن کوئی بُرا عمل بدنیتی سے کریں یہ نہیں ہے، تقویٰ موجود ہے لہٰذا خطاء اجتہادی ہوگی۔

صحابہ کی باہمی جنگیں باعثِ اجر و ثواب ہیں...... حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو جنگ ہوئی ہم کہتے ہیں خطاءِ اجتہادی تھی اور اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيْبُ مجتہد خطاء بھی کرسکتا ہے صواب بھی کرسکتا ہے۔ خطاء کرے تو ایک اجر ملے گا اور صواب کرے گا تو دوہرا اجر ملے گا۔ تو معصیت پہ تھوڑا ہی اجر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ خطاءِ اجتہادی معصیت نہیں ہے ورنہ اجر نہ دیا جاتا۔ تو مجتہد ہر صورت میں اجر کا مستحق ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ سے مسائل میں خطاءِ اجتہادی واقع ہوئی ہے۔ جنگیں بھی ہوئی ہیں، مناظرے بھی ہوئے، مباحثے بھی ہوئے...... مگر تقویٰ باطن دونوں جگہ قائم ہے۔ خطاءِ فکری اور خطاءِ اجتہادی ہوگی۔ اور خطاءِ اجتہادی پر بھی اجر ملتا ہے تو ان کی خطاء کو معصیت کہنا یہ ضال اور گمراہ ہونے کی علامت ہے۔

بہر حال بات دور چلی گئی میں تو صرف یہ عرض کررہا تھا۔ کہ یہ امت بحیثیتِ مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔ پیغمبر کے جو چار کام تھے وہی کام امت کو کرنا چاہئیں؛ تعلیم کتاب (بمعنی تلاوتِ آیات)، تزکیہ نفوس، تعلیم

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸. ② پارہ ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱.

عمل، تعلیم اسوہ۔ اور تلاوت آیات یہ ساری امت کا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرے اور کرائے، ناظرہ ہو یا حفظ مگر الفاظِ قرآن سامنے رہیں۔ اور معانی و مضامین اس حد تک ضروری ہیں جس سے ہم دین سمجھ کر دیندار بن سکیں۔ سب کا عالم بننا ضروری نہیں ہے وہ فرض کفایہ ہے ہزار دو ہزار میں ایک بھی عالم بن جائے وہ کافی ہے۔ ہاں ساری امت عالم سے خالی ہو جائے ایک بھی عالم نہ ہو پھر سارے گنہگار ہوں گے تو سب کا عالم بننا ضروری نہیں مگر سب کا دیندار بننا ضروری ہے اور دیندار بننے کیلئے اتنی معلومات لازمی ہیں جس سے ہم روزمرہ کے عمل کو درست کر سکیں۔ ہم نماز کیسے پڑھیں! زکوٰۃ کس طرح ادا کریں! روزہ کس طرح رکھیں! حج کے کیا فرائض ہیں! کیا واجبات ہیں! کیا سنتیں ہیں...... اتنی معلومات لازمی ہیں، بچوں کیلئے بھی تعلیم کا اتنا اہتمام ضروری ہے، خواہ وہ مدرسہ کی صورت میں ہو یا سوسائٹی کی صورت میں ہو یا خود تلقین کی صورت میں ہو۔

تعلیم و تربیت کے درجات...... تو اعلیٰ ترین صورت تو تعلیم ہے کہ معلم اپنی صحبت اور معیت میں رکھ کر اُسے سمجھائے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگے تا کہ وہ تقویٰ شعار بنیں، اعلیٰ طریق یہی ہے اور یہی طریق انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ صحابی کو صحابی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ صحبت یافتہ ہے اور اسی لئے استاذ شاگرد کی اصطلاح سلف صالحین میں یہی تھی؛ اصحاب ابی حنیفہؒ، اصحاب محمدؒ، اصحاب شافعیؒ...... یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ صحبت یافتہ بھی ہیں انہوں نے محض کتاب نہیں پڑھی بلکہ معیت سے قلب کا رنگ قلب تک بھی پہنچا ہے۔

کتاب الٰہی قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ ① تو اعلیٰ طریق تعلیم و تدریس ہے، اس سے ادنیٰ درجہ لٹریچر ہے، بشرطیکہ اسکا سمجھانے والا بھی کوئی ہو، لٹریچر میں آزادمت ہو کہ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے، اس کو بھی سمجھانا پڑے گا اگر وہ اردو یا انگریزی میں ہوگا آپ کے ہاں انگریزی میں نہیں ہے مگر اردو میں بہت سے ایسے رسالے چھپ گئے ہیں جن میں عقائد کے، اخلاق کے، ایمان کے ابواب کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس زبان میں تراجم ہیں ان کا مطالعہ ہو اور ان کی تفہیم بھی ہو۔ اس سے بھی نیچا درجہ گو وہ بھی ضروری ہے ماں باپ کی تلقین ہے۔ اس لئے کہ بچے کو جو ابتداً تلقین کریں گے وہ پتھر کی لکیر بنے گی، بڑھاپے تک اس عمل کی عادت باقی رہے گی، تو ماں باپ کی تلقین اصل ہے۔ ماں کی گود تو بچہ کیلئے پہلا مدرسہ ہے، اگر ماں ہی کی گود علم سے خالی ہے تو بچے تک کیا چیز پہنچے گی؟ باپ خود بھی مسائل سے خالی ہے تو بچے تک کیا علم پہنچے گا؟

نئی نسل کی تربیت کا راز...... اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ فکر آپ کی بجا ہے کہ ہماری نسلیں خراب نہ ہوں، ان میں ایمان باقی رہے...... یہاں (پاکستان میں) ہر جگہ میں نے یہ فکر دیکھا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی، امریکہ میں جگہ جگہ شہروں میں جہاں جانا ہوا یہ فکر ہر ایک کے دل میں ہے کہ میری نسل کسی طرح دین پر باقی رہے، کوئی ایسی تدبیر ہو...... تو میں نے کہا یہ بہت بڑا انعام خداوندی ہے کہ دلوں کے اندر یہ فکر ہے اور اس فکر کا ہونا بڑی نعمت

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۸۔

ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ فقط اولاد کا فکر نہ ہونا چاہیے اپنی بھی تو فکر ہو جو حرکتیں تمہاری ہوں گی اس کی بچے نقل اتاریں گے۔ بچے میں بالطبع نقالی کی عادت ہے آپ نمازیں پڑھیں گے وہ بھی رکوع سجدے کرنے لگے گا، آپ بولیں گے وہ بھی اسی طرح بولنے کی مشق کرے گا، گالی والی دیں گے تو وہ آپ کو بھی گالی دینے لگے گا۔ دیہات میں ہم کبھی جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ بھئی بچہ کیسا ہے؟ تو دیہاتی کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے! اب گالی والی دینے لگا ہے!۔ تو ان کے ہاں دیہات میں گویا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بچہ گالی دینے لگے۔ اس لئے کہ ماں باپ کو گالی دینے کی عادت ہے تو اولاد میں بھی وہی عادت آئے گی۔ تو یہ فکر بالکل صحیح ہے کہ اولاد درست رہے، مگر یہ فکر جب مکمل ہوگی کہ اپنی بھی تو فکر کریں، ہم بھی تو درست رہیں۔ ہماری درستی سے اولاد درست ہوگی، ہم خراب ہیں تو اولاد بھی خراب رہے گی: ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ '' لوگ اپنے بادشاہوں کا طریق اپناتے ہیں تو گھر کے ملوک و بادشاہ تو یہی ماں باپ ہی ہیں، جو ان کی پرورش ہوگی وہ اولاد کی پرورش ہوگی: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے قاعدہ کے بموجب جتنی رعایا ہے وہ تو بادشاہ کے طریق پہ چلتی ہے حکومت میں جو چیز پسندیدہ ہے عوام بھی اسے پسند کریں گے، تو گھر کی حکومت ماں اور باپ کے ہاتھ میں ہے جو انہیں پسند ہوگا بچے بھی وہی پسند کریں گے۔ تو یہ فکر صحیح ہے کہ بچے دین پر قائم رہیں، اس کیلئے لازمی ہے کہ کچھ تلاوت ہو اور کچھ تعلیم مقاصد بھی ہو، کچھ عملی نمونے بھی ہوں اور کچھ دلوں کا مانجھنا بھی ہو، رات دن کی تلقین بھی ہو روک ٹوک بھی ہونی چاہیے تو تب کہیں کچھ بات بنتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ لَا تَرْفَعْ عَصَا اپنی اولاد سے کبھی لاٹھی مت اٹھاؤ، مطلب یہ کہ وہ تمہاری نگرانی میں رہیں چاہے وہ بڈھے بھی ہو جائیں تب بھی تلقین جاری رکھو۔ ﴿وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ①

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کیے۔ آیت جو میں نے پڑھی تھی اس آیت میں بہت سے علوم اور مضامین ہیں مگر نہ تو میں سارے مضامین ایک مجلس میں بیان کرسکتا ہوں اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ سارے مضامین مجھے معلوم بھی ہوں یہ بڑے علماء کا کام ہے، مگر جتنے مضامین ہیں میں وہ بھی نہیں ادا کرسکتا۔ اس لئے میں نے اجمالی طور پر آیت کی ایک سرسری تفسیر کردی اور راستہ بتادیا کہ اس راستہ پر آپ کو چلنا ہوگا۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطاء فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور دنیا دونوں کو درست فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستہ پر قائم رکھے۔

''وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

معجزۂ علمی

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس جلسہ کا موضوع جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے عملاً بھی ظاہر ہوگیا یہ ہے کہ دارالعلوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلباءِ کرام کو سند دی جائے اور انعام تقسیم کیا جائے تا کہ دارالعلوم کی کارگزاری سامنے آجائے اور اس دارالعلوم کے معاون جو تعاون کر رہے ہیں اس تعاون کا نیک ثمرہ آپ کے سامنے آجائے۔ دوسرے لفظوں میں جلسہ کا موضوع قرآن کریم نکلتا ہے کہ قرآن عظیم کے سلسلہ میں اس کی برکات وثمرات سامنے بھی آئیں اور انہیں بیان بھی کیا جائے۔اس لئے میں اس سلسلہ میں چند گزارشات قرآن کریم کے بارے میں اور اس کی نسبت سے دارالعلوم اسلامیہ کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں، حق تعالیٰ مدد فرمائے! اس لئے کہ میں بہت زیادہ کمزور بھی ہوں، ضعیف بھی ہوں، کچھ علیل بھی ہوں اور علم کے لحاظ سے بے حد قلیل بھی ہوں...... مگر عِلّت اور قِلّت کے باوجود جتنا کچھ حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور جتنا کچھ آپ حضرات کی توجہات کی برکت شامل حال ہوگی تو ممکن ہے کہ چند کلمات گزارش کرسکوں۔

کلام کی عظمت کے چار معیار...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجیے کہ کسی بھی کلام کی عظمت یا وُقعت اس کے متکلم سے پیدا ہوتی ہے جس درجے کا متکلم ہوگا کلام کرنے والا ہوگا اسی درجہ...... کلام کی عظمت اور کلام کی وُقعت بھی آپ کے سامنے آئے گی۔عربی کی ایک مثل مشہور ہے "قَدْرُ الشَّھَادَۃِ بِقَدْرِ الشُّھُوْدِ" "شہادت کی عظمت شاہدوں سے قائم ہوتی ہے۔اگر شاہد عادل ہے، سچا اور صحیح ہے تو اس کی شہادت بھی سچی۔اور شاہد میں اگر کھوٹ ہے تو اس کی شہادت کا بھی وہی درجہ ہوگا۔تو کلام کی عظمت اور وُقعت بھی متکلم ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔جس درجے کا متکلم ہوتا

① پارہ ۱۴، سورۃ الحجر ،الآیۃ: ۹.

ہے اسی درجے کا اس کا کلام بھی سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اگر دو کلام کرنے والوں کا کلام مشترک ہو تو مگر ایک متکلم گھٹیا درجے کا آدمی ہے تو اس کے کلام کی وقعت بھی کچھ گھٹ جاتی ہے اور اسی کلام کو کوئی بڑا آدمی کہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ کلام کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے چند چیزیں طبعی طور پر ضروری ہیں جن سے کلام عظیم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز علم اور فضل ہے۔ اگر کلام کرنے والا عالم اور باخبر ہے تو اس کے کلام میں علم ہوگا اور اس کی خبر سے اس کے علم کی وسعت واضح ہو جائے گی تو پہلی چیز کلام کے لئے علم اور خبر ہے، یہ ضروری ہے۔ جاہل آدمی اگر کلام کرے تو اس کے کلام سے وہی جاہلانہ کلمات اور وہی جاہلانہ حرکات سرزد ہوں گی، لوگ پہچان جائیں گے کہ بولنے والا کوئی جاہل ہے جسے بولنے کا طریقہ نہیں آتا، بھدّا کلام کرتا ہے۔ تو کلام کی وقعت کے لئے سب سے پہلی چیز جو ضروری ہے وہ علم اور خبر ہے۔ دوسری چیز دانش اور فہم ہے کہ کلام کرنے والے میں عقل بھی ہو، فہم بھی ہو، دانش مندی بھی ہو۔ اگر بے وقوف آدمی کلام کرے اور کلام ہو وہی جس میں علم اور خبر ہے مگر اس کی بے وقوفی کی وجہ سے کلام بھدّا بن جاتا ہے، مؤثر نہیں رہتا...... تو قلوب پر بھی اثر نہیں کرتا۔ تیسری چیز منصب اور مقام ہے کہ کلام کرنے والا اگر صاحبِ حیثیت ہے، اس کی عرفی حیثیت اونچی ہے تو کلام بھی اونچا ہو جائے گا۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ کلام اگر نقل ہو کر پہنچے تو اس کی سند اور تاریخی حیثیت مضبوط ہو، اگر سند نہ ہو، راوی صحیح نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کلام کا پہنچنا مشکل ہو جائے گا، پہنچے گا تو ناتمام پہنچے گا۔ تو بہر حال طبعی طور پر چار چیزیں ضروری ہیں؛ علم وخبر، دانش وفہم، منصب ومقام اور صحتِ سند اور استناد۔ اسی لئے کم علموں کے کلام کی طرف لوگ کم توجہ کرتے ہیں مثلاً اگر کوئی بچہ بولے تو اس کے کلام میں تھرتھراہٹ بھی ہوگی، لفظ بھی ناتمام ہوں گے اور سننے والے ہنسیں گے مگر کہیں گے کہ بھئی بچہ ہے! بے چارہ بولنا نہیں جانتا۔ نہ اسے علم ہے، نہ اسے خبر ہے تو کلام بھی اسی درجہ کا بے وقعت ہو جائے گا۔ چاہے بچے کو آپ شاباشی دیدیں گے اور آپ اس کے توتلانے کو کہیں گے کہ ماشاء اللہ خوب بولتا ہے! وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہوگا، یہ نہیں کہ کلام کی کوئی عظمت آپ کے دل میں بیٹھ رہی ہے۔

اگر علم ہو مگر ناقص ہو تب بھی کلام ناقص ہو جاتا ہے عورتوں کا کلام عموماً بے ربط سا ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے اندر نقصانِ علم بھی ہے اور نقصانِ عقل بھی ہے اِلَّا مَاشَاءَ اللہُ، اگر کوئی عورت عالم بنے فاضل بنے تو اور بات ہے جیسے کہ اسلام میں بہت سی عورتیں عالم وفاضل ہوئی ہیں، محدث بھی گذری ہیں، ادیب بھی گذری ہیں مگر وہ ہزاروں میں ایک دو ہوتی ہیں، عام طور سے ان میں نقصانِ علم، نقصانِ دین اور نقصانِ عقل ہوتا ہے اسی لئے کلام میں بھی نقص آتا ہے۔

عورتوں کا کلام بے وقعت ہونے کی وجہ...... یہی وجہ ہے کہ خاوند بیوی میں جب لڑائی ہوتی ہے بیوی بھی مقابلہ پر بولتی ہے اور خاوند بھی بولتا ہے، مگر بیوی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے اور خاوند حجتیں پیش کرتا ہے، دلیلیں پیش کرتا ہے مگر اس کی وہی ایک رٹ ہوتی ہے، جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی

الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴾ ① جو بچپن سے زیورات کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے تو اس کے قلب کے اندر سونا چاندی زیادہ گھسا ہوتا ہے، علم اور خبر اس کے اندر زیادہ نہیں ہوتی۔ ذرا سی بچی ہے اس کے کان چھید دیئے اس کو بالیاں پہنا دی جاتی ہیں اور ذرا بڑی ہو تو ناک چھید دیئے تو اس میں ''سونے کی لونگ'' اور ''کیل'' ٹھونک دی جاتی ہے اور ذرا بڑی ہوئی تو گلے میں چاندی کا طوق ڈال دیا جاتا ہے اور ذرا بڑی ہوئی اور شادی ہوئی تو ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں، چھلّے ڈال دیے جاتے ہیں، گلے میں ہنسی ڈال دی جاتی ہے...... غرض سر سے پیر تک سونے اور چاندی میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے! اس لئے اس کی تمام تر ہمت اور تمام تر شوق اور رغبت سونے اور چاندی کی طرف ہوتا ہے۔ مردوں کو تو یہ روگ عورتوں ہی سے لگتا ہے۔ اگر مرد مجرد (غیر شادی شدہ) ہو وہ سونے چاندی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ بہر حال جب دل میں سونا چاندی گھس جائے تو اس میں علم کی گنجائش کم ہوتی ہے اور عقل کی گنجائش بھی کم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ...... جن کا ذکرِ خیر آپ سنتے رہتے ہونگے، ایک جملہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو روپے پیسے کے دلدادہ تھے تو فرمایا کہ: ''دست زر آلود ایں قدر بد بوی کند'' جس ہاتھ کو سونا چاندی لگتا ہے تو اس میں کچھ سیاہی بھی آجاتی ہے اور کچھ بو بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں یہ چاندی کا روپیہ چلتا تھا اور سونے کی گنیاں چلتی تھیں جب گننے بیٹھتے تھے تو دس بیس گننے کے بعد انگلیوں پر سیاہی آجاتی تھی اور اس میں پھر بو بھی پیدا ہو جاتی تھی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''دست زر آلود ایں قدر بد بوی کند قلب زر آلود چہ قدر بد بو خواہد کرد'' ہاتھ کو سونا لگ جاتا ہے تو اتنی بد بو ہو جاتی ہے اور جس دل میں یہ سونا لگ جائے تو کس قدر بد بو پیدا ہو جائے گی!۔ تو حقیقتاً عورتوں کے دلوں میں سونا اور چاندی گھس جاتا ہے اس لئے کہ شروع سے اخیر تک اسی کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں تو علم اور دانش کی طرف قدرتاً ان کی توجہ کم ہوتی ہے۔ وہ کلام کریں گی اس میں روپے پیسے کا ذکر زیادہ ہوگا۔ اس میں قرآن کا تو ذکر ہی نہیں ہوگا اس لئے کلام بھی ناتمام ہوگا مؤثر بھی نہیں رہے گا۔ تو کلام کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ علم بھی صحیح ہو اور...... کامل ہو تو سبحان اللہ! اس کی خبر اور نصیحت بھی صحیح ہو اور کامل ہو تو کلام میں بھی اسی درجہ کمال پیدا ہو جائے گا۔

کلام کے اندر حقیقتِ متکلم جلوہ گر ہوتی ہے...... حقیقت یہ ہے کہ کلام کے اندر خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے اگر متکلم کے اوصاف دیکھنے ہوں تو اس کا کلام سن لیا جائے، کوئی شاعر شعر خوانی کرے گا ہر شخص پہچان لے گا کہ شاعر آدمی ہے، اس کے کلام سے علم، ادب اور لغت یہ چیزیں سرزد ہوں گی، کوئی شیخ کلام کرے گا تو اس سے معرفت، علم اور عرفانِ الٰہی سرزد ہوگا اور سب پہچان لیں گے کہ کلام کرنے والا عارف ہے، اسی طرح اگر کوئی عالم کلام کرے گا تو کلام سے پہچان لیا جائے گا کہ اس کے قلب کے اندر علم ہے، اس کے لفظ لفظ سے علم ٹپکتا ہے تو کلام میں دراصل

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے، جسے متکلم کو دیکھنا ہو اس کے کلام کو دیکھ لے اس سے وہ نمایاں ہو جائے گا۔

زیب النساء شہزادی...... اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء بہت بڑی شاعرہ تھی، ذہین اور ذکی بھی تھی، جب شاہی دربار میں مشاعرے ہوتے اور شعراء اپنا کلام سناتے تو زیب النساء کا کلام بھی سنایا جاتا تھا اور وہ عموماً تمام شعراء کے کلام پر فائق ہو جاتا تھا، لوگ سر دھنتے تھے اور اس کی بڑی داد دیتے تھے۔ اورنگ زیب کا ایک درباری تھا، اس کی زبان سے نکلا کہ کاش! میں زیب النساء کو دیکھ لیتا! اس لئے کہ اچھا کلام سن کے قدرتاً جی چاہتا ہے کہ متکلم کو دیکھیں۔ اس کی زبان سے نکلا کہ کاش میں زیب النساء کو دیکھ لوں! مگر اول تو بادشاہی محل اور اوپر سے پردے کا رواج! کوئی آج کا دور تھوڑا ہی تھا کہ بے پردگی اور عریانی پھیلی ہوئی ہو، پردہ بھی تھا، عورتیں مخفی رہتی تھیں تو دیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ درباری عاقل خان کا یہ مقولہ زیب النساء کو پہنچ گیا۔ اس نے کہا میرے دیکھنے کی بڑی آسان صورت ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا کہ:

در سخن مخفی منم، چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہوتی ہے، اگر خوشبو کا ادراک کرنا ہے تو گلاب کی پتی کو دیکھ لو خوشبو خود بخود سامنے آجائے گی تو میں اپنے کلام میں چھپی ہوئی ہوں جسے مجھے دیکھنا ہو میرے کلام کو دیکھ لے میں اس میں جلوہ گر ہو جاؤں گی۔ تو حقیقتاً دیکھنے کی چیز صورت نہیں ہوتی، حقیقت ہوتی ہے، صورت تو ایک عارضی چیز ہے، وہ محض تعارف کا ذریعہ بنتی ہے اصل چیز انسان کے لئے حقیقت ہے۔

سیرت سازی کی ضرورت ...... تو دانش مند کا کام یہی ہوگا کہ صورت کے سنوارنے کی بجائے سیرت کو سنوارے، وہی انسان کی حقیقت ہے اور رہ گئی صورت! وہ تو چند روزہ بہار ہے، آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے، وہ رنگ و روغن ہی نہیں رہتا جو جوانی کے زمانے میں تھا، بڑھاپا ہی صورت کی رنگینی کو کھو دیتا ہے، بڑھاپا بھی نہ آئے کچھ غم لگ جائے، کچھ فکر لگ جائے یا کوئی بیماری لگ جائے اس سے بھی سارا رنگ روپ زائل ہو جاتا ہے، صورت باقی رہتی اور نہ رنگ رہتا ہے تو صورت حقیقت میں قابل التفات نہیں ہے اصل چیز سیرت ہے۔ ہمارے نوجوان بھائی خصوصی طور پر رات دن صورت کے سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں گو اس کو درست کریں، بنائیں، سنواریں لیکن حقیقت میں یہ اپنی کوتاہی ہے، جتنی محنت صورت کے سنوارنے پر کرتے ہیں اگر سیرت کے سنوارنے پر کریں تو کہاں سے کہاں پہنچیں! تو آپ صورت کو سنوارنے کی کیا فکر کرتے ہیں اور اس کو کیا سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس کا کام ہی یہ ہے کہ بگڑے، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے! روز گھنٹے دو گھنٹے صورت سنوارنے میں صرف کریں گے شام کو بگڑ جائے گی پھر اگلے روز بیٹھ کر کے گھنٹہ بھر صرف کریں پھر بگڑ جائے گی، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے وہ تو پیدا ہی بگڑنے کے لئے ہوئی ہے۔

ایک شیخ کا اپنے صورت پرست مرید کا علاج کرنا...... وہ کسی بزرگ کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ

میں لوگ اللہ اللہ اور ذکر اللہ کے لئے آیا کرتے تھے اور خانقاہ کا کام جاری تھا۔ ایک روز ایک صاحب داخل ہوئے، شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، مقصد یہ تھا کہ اپنے قلب کی اصلاح کریں تو شیخ کے ہاں کا طریقہ یہ تھا کہ عام مریدین کا کھانا ان کے گھر پکتا تھا ایک باندی متعین تھی، کھانا تیار ہونے کے بعد وہ حجرہ در حجرہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔

وہ باندی حسب معمول آئی اور اس نے آ کے کھانا بانٹنا شروع کیا، باندی جب نئے مُرید صاحب کے حجرے میں آئی تو باندی کچھ قبول صورت تھی، ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق پیدا ہو گیا۔ اب وہ جب آتی یہ اسے بیٹھ کے گھورتے، شیخ کو پتہ چل گیا کہ اس کی طبیعت باندی کی طرف مائل ہوئی ہے، رات دن اس کی فکر میں ہے وہ ذکر اللہ تو گیا اپنی جگہ! وہ صورت شکل میں اُلجھ کے رہ گئے ہیں۔ شیخ کو معلوم ہو گیا تھا مگر یہ حضرات اہل اللہ زبان سے زیادہ علاج نہیں کرتے، تدبیر سے علاج کرتے ہیں تو شیخ نے تدبیر کی کہ اُن کے دل سے اس صورت کی محبت نکل جائے۔ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک دست آور دوائی منگوائی، جمال گھوٹہ ہو گا یا املتاس وغیرہ وہ اس باندی کو کھلایا اور ایک جگہ متعین کر دی کہ قضائے حاجت کے لئے وہاں جا کے بیٹھے، ایک کنڈا رکھ دیا اور ایک قدمچہ رکھ دیا۔ صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آئے وہ رنگ روغن ختم ہو گیا اور ہڈیاں اوپر نکل آئیں، بھیانک سی صورت بن گئی۔

شیخ نے فرمایا: کہ کھانا لے کے اس مرید کے پاس جا اور جو معاملہ وہ کرے اس کی مجھے اطلاع دینا وہ حسبِ معمول کھانا لے کر آئی، یا تو وہ انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ باندی آئے تو ذرا گھوریں، آنکھوں کو سینکیں...... اب جو آئی، صورت اس کی بھیانی، بجائے خوبصورتی کے زردی منہ پر چھائی ہوئی، ہڈیاں نکلی ہوئیں، اسے بڑی نفرت پیدا ہوئی اور اس نے منہ پھیر لیا اور کہا کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے! وہ بے چاری چلی گئی اور شیخ سے جا کر اس نے سارا حال عرض کیا کہ آج تو یہ معاملہ رہا۔ فرمایا کہ: الحمدللہ علاج ہو گیا، شیخ آئے اس مرید کی انگلی پکڑی کہ ذرا میرے ساتھ تشریف لے چلئے، وہ جو حجرے میں قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں وہ دستوں کی نجاست پڑی ہوئی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ نے کہا: یہ آپ کا معشوق ہے، اسے لے جائیے بڑی حفاظت سے اس نجاست کو رکھ لیجیے، اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی آپکو تو اس سے محبت تھی، جب تک یہ اس کے پیٹ میں رہی آپ عاشق رہے، دلدادہ رہے، یہی تو نکل گئی اور کیا چیز نکلی! جو آپ کی محبت ختم ہو گئی تو آپ کو نجاست سے محبت ہے باندی سے محبت نہیں ہے، یہ ہے آپ کا محبوب، اسے اٹھا کر لے جائیے وہ شرمندہ ہوئے اور دل سے وہ ساری چیز نکل گئی۔

سیرت باقی اور صورت فانی ہے......تو حقیقت یہ ہے کہ صورت کی محبت تو نجاست کی محبت ہے۔ محبت اصل میں سیرت کی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم ہو، معرفت خداوندی ہو، تعلق مع اللہ قائم ہو جس سے سیرت بنتی ہے، وہ چیز محبت کے قابل ہے۔ یہ گوشت پوست کی محبت حقیقی محبت نہیں یہ تو نجاست کی محبت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ محبت کے قابل سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو تو جتنا آپ سنواریں گے وہ تو بگڑ کر ہی رہے گی، سیرت البتہ ایسی چیز

ہے کہ جب حق تعالیٰ دیدیتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی قائم ہے برزخ میں بھی قائم ہے آخرت میں جاکے بھی قائم رہے گی وہ بگڑنے والی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ سیرت کے اندر کمالاتِ خداوندی جلوہ گر ہوتے ہیں اور اللہ کا کمال زائل ہونے کے لئے نہیں ہے وہ تو ابدی ہے، برقرار رہے گا تو جس میں اللہ کا کمال آجائے تو وہ بھی پائیدار چیز ہے، صورت انسانی کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان تغیر کا پتلا ہے تو صورت بھی متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کلام کے اندر متکلم جلوہ گر ہوتا ہے تو...... متکلم کی صورت جلوہ گر نہیں ہوتی اس کی سیرت اور حقیقت جلوگر ہوتی ہے اس سے آدمی پہچان سکتا ہے کہ یہ متکلم کس درجے کا آدمی ہے۔

کلام کو چار چیزوں سے متصف ہونا چاہئے ...... تو سب سے پہلی چیز جو ہے وہ علم اور خبر ہے دوسری چیز دانش اور فہم کہ وہ ہو تو کلام میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور تیسری چیز منصب اور مقام ہے اگر متکلم باحیثیت ہے تو کلام بھی باحیثیت ہوگا اگر اس کی حیثیت گری ہوئی ہو تو کلام کی کوئی وقعت نہیں ہوگی، ایک کلام میں کروں یا آپ کریں کوئی وقعت نہیں اور وہی بات ایک صدر جمہور یہ کہہ دے تو دنیا میں اس کا اثر ہوتا ہے، سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے ملکوں کے منصوبے بن جاتے ہیں۔ وہی جملہ آپ نے کہا اور وہی جملہ ملک کے وزیراعظم نے کہا اس کے اثرات دوررس ہوتے ہیں، دنیا گیر ہوتے ہیں۔ یہ منصب اور مقام کا اثر ہے چونکہ منصب بڑا ہے اس لئے زبان سے نکلا ہوا کلام بھی بڑا ہوجاتا ہے اور منصب گھٹیا ہے یا بے منصب آدمی ہے تو کلام کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ کلام جب ہم تک پہنچے تو صحیح سند کے ساتھ پہنچے اشتباہ نہ رہے کہ معلوم نہیں متکلم نے کلام کیا ہے یا نہیں پورا کلام پہنچا ہے یا ادھورا پہنچا ہے، اس کی تاریخی حیثیت مضبوط ہونی چاہئے تو یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔

کلام اللہ کی عظمت شان ...... جب یہ بات مسلّم اور یہ اصول طے شدہ ہے کہ جس کا علم جتنا بڑا ہوگا کلام بھی اتنا بڑا ہوگا، جس کا منصب اور مقام بلند تر ہوگا کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا، جس میں عقل اور فہم رچا ہوا ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی اُونچا ہوگا...... اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اللہ رب العزت کی ذات ...... علم کے لحاظ سے دیکھی جائے تو علم اس کا لامحدود، کہیں اس کی حد نہیں ہے، آپ صرف سامنے کی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اس کے سامنے حاضر غائب سب حاضر ہیں، وہ جس طرح سے ایک بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح سے زمین کی تہہ میں اگر چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چل رہی ہے تو اس کی کھسکھساہٹ بھی سنتا ہے، وہ سمیع و بصیر ہے، آپ زبان سے کوئی بات سن لیں گے جان لیں گے وہ دلوں کے مخفی رازوں کو جانتا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① اسے دلوں کی کھٹک کا بھی علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا خطرات گذر رہے ہیں تو اس کا علم لامحدود، وہ ظاہر اور باطن پر حاوی، اس لئے اس کا کلام بھی ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور اتنا جامع کلام ہوگا کہ اس سے زیادہ جامعیت نہیں ہوسکتی، اس میں فصاحت بھی ہوگی بلاغت بھی اعجازی ہوگی، بداعت بھی اعجازی ہوگی، تو فصیح بھی اعلیٰ، بلیغ بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اس میں

① پارہ: ۱۱، سورۃ ھود، الآیۃ: ۵.

اعلیٰ ترین ہوگی، اس کی کوئی حد ونہایت نہ ہوگی۔

فصاحت ......فصاحت کی مثال تو ایسی ہے جیسے آپ کپڑا سلوائیں تو سب سے پہلے تو کپڑے کو دیکھا جائے گا کہ اس کا مادہ بھی صحیح ہے یا نہیں، اگر کپڑے کا مادہ صحیح ہے، سوت نہایت عمدہ ہے، ریشم نہایت عمدہ ہے تو کہیں گے کہ کپڑا نہایت اعلیٰ ہے۔ یہ کپڑے کی ذات ہے اس کو کہنا چاہیے کہ یہ فصاحت ہے کہ کلام کے اندر الفاظ نہایت بامحاورہ ہوں، کلام کے اندر لفظوں میں کوئی منافرت نہ ہو کہ کان اس کے سننے سے اکتا جائیں، کانوں پر بار گذرے، بلکہ ایسا ہو کہ کان میں کلام پہنچا اور دل میں اتر گیا اور حقیقت منکشف ہوگئی۔ تو کلام کے اندر لفظ بھی اعلیٰ ہوں کہ کوئی پیچیدگی بھی نہ ہو اور سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو...... اتنا سلیس ہو کہ فوراً قلب میں اتر جائے اور اتنا جامع ہو کہ سارے حقائق اس میں چھپے ہوئے ہوں، یہ تو فصاحت ہے۔

بلاغت ......ایک یہ کہ کپڑا بدن کے مطابق سلا ہوا ہے، کپڑا تو بہت اعلیٰ ہے مگر درزی بھدّا تھا، اس نے نہایت غلط سیا، جب آدمی پہن کر نکلتا ہے تو لوگ کپڑوں کو تو دیکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ وضع قطع نہایت بھدّی ہے تو اس سے کپڑے کی خوبیاں بھی غلط ہو جاتی ہیں تو کپڑے کا بدن کے مطابق ہونا یہ بمنزلہ بلاغت کے ہے۔

بداعت ......پھر اس کپڑے کے اوپر کوئی رنگ، کوئی نقش ونگار اور رنگینی اعلیٰ ترین ہو تو اسے کلام بدیع کہتے ہیں یعنی اس کی بداعت بھی اعلیٰ ہے تو کلام اپنی ذات سے بھی اعلیٰ، سننے والے اور مخاطبین کے مزاج کے بھی مطابق اور اس کے اندر مرصع ومسجع اور مقفّٰی ہونا یہ بھی داخل ہے تو فصیح بھی ہوا، بلیغ بھی ہوا اور بدیع بھی ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام ...... جب کہ اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ کمال کے منبع ہیں تو ان کے کلام کے اندر یہ ساری چیزیں انتہائی طور پر جمع ہونی چاہیے، ایسا اعجازی ہو کہ کوئی بشر ایسا کلام نہ کر سکے۔ اس لئے کہ بشر کا علم محدود ہے تو کلام کی بھی جامعیت کم ہوگی، اللہ کا علم لامحدود ہے تو کلام بھی اتنا جامع ہوگا کہ قیامت آجائے مگر اس کے نیچے سے علم ختم نہیں ہوسکتا۔ ہر چیز کا حکم اس میں موجود تو حق تعالیٰ کا کلام جامع ترین ہوگا، فصیح ترین ہوگا، بلیغ ترین ہوگا، بدیع ترین ہوگا اور اعجازی بھی ہوگا۔

معجزہ کی حقیقت ......تو قرآن کریم حقیقت میں معجزہ ہے۔ معجزے کے معنی یہی ہیں کہ تمام دنیا عاجز آجائے مگر اس جیسی چیز نہ لا سکے۔ حق تعالیٰ میں جتنی صفتیں ہیں وہ سب اعجازی ہیں کہ کوئی غیر خدا انہیں نہیں لاسکتا اور نہ بنا سکتا ہے۔ اللہ نے آسمان بنایا، زمین بنائی، چاند سورج بنائے وغیرہ وغیرہ۔ چاند سورج تو چاند سورج ہیں آپ اس کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے، یہ کسی ایسے حکیم کی بنائی ہوئی ہے کہ اس کی حکمت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ آسمان اور چاند سورج تو اپنی جگہ ہیں یہ زمین ہے جو رات دن آپ کے قدموں میں پامال ہے۔ اس کا ایک ذرہ آپ پیدا نہیں کر سکتے اس زمین سے کام تو لے سکتے ہیں کہ ذروں کو جوڑ کر آپ چیزیں بنالیں اور ایجادات کرلیں لیکن ایک ذرہ پیدا کرلیں...... یہ آپ کے بس میں نہیں ہے تو جو زمین آپ کی اصل ہے

ہر وقت آپکے سامنے ہے، ہر وقت اس پر آپ چلتے پھرتے ہیں، اس کا ایک ذرہ نہیں بنا سکتے، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے اور اس ذات کا بنایا ہوا ہے جس کا علم لامحدود ہے، قدرت لامحدود ہے، اقتدار لامحدود ہے۔ تو جتنی چیزیں اللہ کی صنعتیں ہیں وہ سب معجزات ہیں ساری دنیا ان کے بنانے سے عاجز ہے۔

تمام تر تخلیقات معجزاتِ خداوندی ہیں...... ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو کیا ماں بناتی ہے اس کو؟ ماں کو تو یہ خبر نہیں کہ ہو کیا رہا ہے! باپ بناتا ہے! تو باپ کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کارخانہ قدرت کا کام جاری ہے، بچہ بن رہا ہے اور صورت بنائی جا رہی ہے، یہ اسی کی صنعت ہے کہ پانی کے قطرے پر نقاشی کر دے۔ آپ پانی پر تصویر نہیں کھینچ سکتے لیکن اللہ کی یہ قدرت ہے کہ ایک قطرۂ ماء کے اوپر تصویر کھینچ دیں۔ اس نے صورت بنائی اور نقش بنائے، نہ ماں کچھ کر سکتی ہے نہ باپ۔ اس واسطے کہا جائے گا کہ خالق حق تعالیٰ ہیں، لیکن سببِ تخلیق یہ مرد اور عورت ہیں۔ تو باپ بھی خالق نہیں، ماں بھی خالق نہیں، خالق صرف ایک اللہ ہے لیکن اس نے اپنی تخلیق کو دنیا میں اسباب کے ذریعے نمایاں کیا۔

مرد و عورت کو سبب بنایا جس سے بچہ پیدا ہوا تو وہ خالق نہیں ہیں، سبب تخلیق ہیں۔ اسی واسطے ایک موقع پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾ ① یہ ان کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں، تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں، یک زمیندار ہے زمین میں منوں مٹی کے نیچے دانہ ڈال دیتا ہے، اس منوں مٹی کے اندر اس بیج کو پھاڑنا اور اس میں سے کونپل نکالنا یہ کس کا کام ہے، یہ کاشتکار کر سکتا ہے؟ کاشتکار کو کچھ پتہ نہیں وہ تو دانہ ڈال کر الگ ہو گیا اور دانہ بھی اس کا بنایا ہوا نہیں ہے، وہ بھی اللہ ہی کا بنایا ہوا ہے، اس کا کام اتنا ہے کہ زمین میں ڈال دے، اب زمین کے اندر قدرت کی جو مشینیں چل رہی ہیں کہ وہ دانہ پھٹتا ہے، اس میں سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے...... یہ صرف اسی اللہ کا کام ہے۔ تو کہا جائے گا کہ درخت کے خالق حق تعالیٰ ہیں کاشت کار نہیں ہے، اسے اپنی تخلیق کے ظاہر کرنے کا سبب بنایا ہے۔

منوں مٹی کے نیچے سے ایک کونپل اوپر کی طرف چلتی ہے وہ اتنی نرم و نازک ہے کہ آپ اس کو دو انگلیوں میں مسل دیں لیکن وہی بڑھتے بڑھتے اتنا عظیم تناور درخت ہو جاتا ہے کہ کسی پر گر پڑے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اس میں غور یہ کرنا ہے کہ درخت کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ نیچے کی طرف جائے، پتے کو آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے کو جائے گا، شاخ کو آپ چھوڑ دیں تو اوپر کی طرف نہیں جائے گی وہ نیچے کی طرف آئے گی۔ یہ اس کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ کونپل نکلی اور اوپر کی طرف جا رہی ہے، اس کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے مگر یہ اوپر کی طرف جا رہی ہے اور ایک عظیم درخت بن جاتا ہے۔ تو طبیعت کے خلاف مجبور کر دینا یہ بندے کے بس کی بات نہیں ہے خالق ہی کے بس میں ہے۔ تو یہ دلیل ہوگی کہ اس کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں کاشتکار اور انسان پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

① پارہ: ۲۷، سورة الواقعة، الآية: ۵۹.

اس کی طبیعت کے اوپر حق تعالیٰ حکمرانی کر رہے ہیں، چاہے نیچے کی طرف لے جائیں، چاہے اوپر کی طرف۔ بہر حال جاندار پیدا ہو یا درخت پیدا ہو یا پتھر پیدا ہو...... پیدا کرنا اسی کا کام ہے۔ بندہ سبب بن جاتا ہے اور سبب تخلیق خود خالق نہیں ہوتا، خالق وہی ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے جتنے عجائبات پیدا فرمائے ہیں ان کے خالق وہی ہیں۔ ان میں سے آپ صنعت سے اور ایجاد سے تصرفات کر کے چیزیں نکالتے رہیں اس کی قدرت آپ کو اللہ نے دی ہے، مگر یہ قدرت بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے، خود آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ اگر آپ نے عقل سے کچھ چیزیں ایجاد کر لیں تو سوال یہ ہے کہ عقل کہاں سے آئی! آپ نے خود تو اپنے اندر نہیں ڈال لی! وہ بھی اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے، پھر اس عقل کو وہاں تک پہنچا دینا کہ یوں چیز بن جائے! یوں ایجاد ہو جائے! یہ بھی آپ کا کام نہیں۔

تمام امور کا انجام اللہ کی ذات ہے...... آپ جب ایجاد کرتے ہیں تو جو ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے دل میں ارادہ کس نے ڈالا؟ پھر اللہ ہی کی طرف آپ کو رجوع کرنا پڑے گا تو ارادہ، قدرت اور اختیار اگر انسان دکھلاتا ہے تو وہ اللہ ہی کا بخشا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ① اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے افعال کو بھی وہی پیدا کرتا ہے تمہارے اندر قدرت نہیں ہے کہ اپنے افعال کو خود پیدا کر لو اور خالق افعال کہلاؤ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے بندے کو اپنی خبر نہیں اسے اپنے افعال کی کیا خبر ہوگی؟ تو ہر چیز کی انتہاء حق تعالیٰ شانہ پر ہوتی ہے۔

اگر آپ یوں کہیں کہ فلاں مکان میں آگ لگ گئی! کہیں گے کہ کیوں لگ گئی؟ آپ کہیں گے کہ چراغ جل رہا تھا اور چوہے نے بتی کھینچ لی اور وہ بتی سامان کے اوپر آ کر گر پڑی وہ بھی جل گیا۔ وہ سوال کریگا کہ بتی نیچے کیوں آئی کہ چوہے نے سامان پر ڈال دی! چوہے نے کیوں ڈالی...... اسکے دل میں ایک خیال آیا، کیوں آیا خیال؟ آگے کہیں گے کہ بھائی قدرتی بات ہے، اللہ نے خیال ڈال دیا تو انتہاء...... اللہ پر جا کر ہوگئی اور سب وسائل ختم ہو گئے

آپ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا اچھا عالم ہے کیوں عالم ہے؟ اس کے استاذ قابل تھے انہوں نے پڑھایا لکھایا، بھائی استاذوں کے پڑھانے لکھانے سے یہ کیسے عالم بن گیا! انہوں نے محنت کی، تربیت کی، برسہا برس لگائے عالم بن گیا، اس نے محنت کیوں کی؟ اس کے دل میں یہی جذبہ آیا، کیوں یہ جذبہ آیا؟ بھائی اللہ نے پیدا کر دیا۔ پھر انتہاء جا کے اللہ پر ہوگئی۔ کہیں سے چلو، اخیر میں جا کے حق تعالیٰ شانہ پر انتہاء ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ میں ظاہر کر دیا کہ ﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ ② ہر چیز کی انتہاء تیرے پروردگار پر ہوگی ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ③ ہر جاندار چیز اللہ کی طرف رجوع کرے گی۔

---

① پارہ: ۲۳ سورۃ الصّٰفّٰت، الآیۃ: ۹۶۔

② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۴۲۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۸۔

سارے امور کو سمیٹو جا کے حق تعالیٰ کے اوپر انتہاء ہو جائے گی۔ آپ اور ہم موجود ہیں، کیوں موجود ہیں؟ اس لئے کہ دو موجودات (ماں باپ) ملے تو پیدا ہو گئے، بھائی! کیوں ملے؟ ان کے دل میں جذبہ آیا، کیوں جذبہ آیا؟ کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا، پھر آخیر اللہ ہی کی طرف انتہاء ہو گئی تو کہیں سے آپ چلیں جا کر انتہاء حق تعالیٰ کے اوپر ہو گی۔ تو جتنے بھی کمالات دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں، جتنی بھی ایجادات ہیں خواہ انسان کرے یا کوئی کرے، انتہاء جا کے اللہ کے اوپر ہو گی کہ وہیں سے یہ خیر چلی اور دنیا کے اندر پھیل گئی تو تمام چیزوں کے مرجع الامور اللہ ہی کی ذات بابرکات ہیں۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ خواہ تخلیق ہو، خواہ تصدیق ہو، خواہ ہدایت ہو اور خواہ کوئی استاذ کسی کو پڑھائے انجام کار یہی نکلے گا کہ اللہ نے ہدایت دے دی۔

ہدایت بھی اس کی طرف سے آئے گی، تخلیق بھی اس کی طرف سے آئے گی، اس لئے کہ کمالات کا منشاء تو وہی ہے۔ تو کلامِ خداوندی جامع ہے، اس لئے کہ وہ معجزہ ہے۔ دنیا سپر ڈال دے گی لیکن اس کی ثانی نہیں لاسکے گی، جیسا کہ دنیا عاجز ہو کر سپر ڈال دے گی مگر زمین کا ذرہ نہیں بنا سکتی، دنیا عاجز آجائے گی آفتاب کی ایک کرن نہیں بنا سکتی، ستارے کا ایک جز نہیں بنا سکتی، آسمان کا ایک جز نہیں بنا سکتی...... اس لئے کہ یہ سب معجزہ ہے اور اللہ کا فعل ہے تو یہ افعال کے معجزے ہیں اور اسی طرح قرآن کریم کلام کا معجزہ ہے۔ تو جیسے وہاں دنیا عاجز ہے...... یونہی کلام لانے سے بھی عاجز ہے کہ کوئی ایسا جامع کلام جو قیامت تک کی جزئیات پر حاوی ہو، وہی کر سکتا ہے جس کا علم قیامت تک حاوی ہو اور ہر چیز اس کے سامنے مستحضر اور حاضر ہو تو قرآن کریم صرف کلام نہیں بلکہ معجزہ بھی ہے یعنی دنیا اس کے سامنے عاجز ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں لاسکتا۔

کلامِ خداوندی صرف قرآن پاک ہے دوسری سماوی کتب نہیں ...... اور ظاہر بات ہے اگر غور کیا جائے تو کلام صرف قرآن مجید ہی ہے۔ یعنی اور کتابیں بھی آسمان سے آئیں، توراۃ بھی آئی، زبور بھی آئی، انجیل بھی آئی اور قرآن کریم بھی آیا لیکن کلامِ خداوندی اگر کہا جائے گا تو وہ صرف قرآن پاک کو کہا جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کہتے ہیں ''مَا یَتَکَلَّمُ بِہٖ'' کو کہ کلام کرنے والا جس کا تکلم کرے وہ کلام ہے، اگر آپ لکھ کر بھیج دیں اسے مجازی طور پر کلام کہیں گے، بولے نہیں لکھ کر دے دیا اسے متکلم کی کتاب تو کہا جائے گا کلام نہیں کہا جائے گا، کلام مجازاً کہیں گے تو توراۃ حق تعالیٰ نے نازل کی، اس کے ساتھ کلام نہیں فرمایا، تختیاں لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئیں...... تو توراۃ کو کتابِ خداوندی تو کہیں گے، کلام مجازاً کہیں گے حقیقی معنی میں کلام نہیں گے اس لئے کہ تکلم نہیں فرمایا۔

انجیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر بطور مضمون کے القاء فرمایا، تکلم نہیں فرمایا، اسے مضمون خداوندی کہیں گے، کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، کلام اگر کہا جائے گا تو مجازاً کہا جائے گا۔ تو کلام وہ ہے جس کے ساتھ بولنے والا بولے۔ قرآن کریم وہ ہے جس کے ساتھ حق تعالیٰ نے تکلم کیا ہے، اس کو بولے ہیں۔ قرآن کریم

میں خود فرمایا گیا کہ ﴿ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى ﴾ ① اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ہم تلاوت کرتے ہیں تم پر فرعون کے واقعہ کی خبر۔ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ﴾ ② یہ اللہ کی آیتیں ہیں جس کی ہم تلاوت کر رہے ہیں تمہارے سامنے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ کوئی آیت بھیجتے تھے کلام فرماتے تھے تو وہ کلام سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام سنتے تھے اور اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے یعنی اپنے آپے میں نہیں رہتے تھے، تمام آسمان والے فرشتے اس کی عظمت سے مغلوب اور مدہوش ہو جاتے تھے اور بعد میں پوچھتے تھے کہ ﴿ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ﴾ ③ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ اس وقت جبریل کہتے تھے کہ ﴿ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ ④ اللہ نے یہ فرمایا تو قرآن کریم کا حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا اس لئے صحیح معنی میں کلام اللہ وہی ہے جس کا تکلم کیا جائے اور وہ قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے...... اور ساتھ میں وہ کتاب بھی ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اسے لوح محفوظ میں لکھ بھی دیا ہے۔ تو کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے۔ لوحِ محفوظ میں تو بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہے، جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف "کوہِ قاف" کے برابر تھا۔ تو جیسا کلام کرنے والا اور جیسا کاتب ہوگا ویسی کتابت بھی ہوگی۔ اللہ کی ذات لامحدود تو قلم بھی اس کا اعلیٰ ہوگا۔ حروف بھی اس کے اتنے چوڑے ہوں گے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تو بڑے بڑے موٹے موٹے حرفوں میں لوح محفوظ پہ لکھا گیا۔ اور احادیث میں فرمایا گیا کہ باریک حرفوں میں بھی اس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا ہے تو وہ باریک حرفوں میں بھی لکھا ہوا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ کلام کو موٹے حرفوں میں چھاپیں تو بھی آپ حق تعالیٰ شانہٗ کا اتباع کر رہے ہیں کہ انہوں نے بھی بڑے اور موٹے حرفوں میں لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور اگر آپ نے چھوٹے حرفوں میں چھاپا تو حمائل بن گئی اور اس کی بھی نظیر ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر باریک باریک حرفوں سے اس طرح لکھا گیا کہ وہ حمائل ہی تھی۔ اور آپ لوگوں نے اس کو عکسی قرآن میں اور زیادہ باریک کر دیا اور وہ اتنی سی ڈبیا میں آ جاتا ہے کہ جیب میں رکھ لو، بہت ہی چھوٹی قسم کی حمائل۔ تو مسلمانوں نے کلام خداوندی کے جتنے نقشے ہو سکتے ہیں وہ سارے تیار کر دیئے...... موٹے حرفوں میں بھی اور باریک حرفوں میں بھی۔

ایک عجیب نمونۂ قرآن...... بڑودہ میں میں نے ایک قرآن شریف دیکھا ہے، وہاں کی جامع مسجد میں وہ محفوظ ہے، اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ساڑھے تین گز ہے اور چوڑائی دو گز ہے۔ ایک بڑی میز پر پندرہ سپارے رکھے ہوئے ہیں جو چھت تک پہنچ گئے ہیں اور دوسری میز پر پندرہ سپارے دوسرے رکھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کاتب

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۲.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳.

کو کیا سوجھی ہوگی! کونسا قلم لیا ہوگا! یعنی تقریباً چار چار انگشت چوڑے اس کے حروف ہیں تو چھت تک وہ قرآن شریف آ گیا۔ تو مسلمانوں نے قرآن کریم کے لکھنے میں کوئی نمونہ نہ چھوڑا، چوڑے حروف، باریک حروف، پتلے حروف، عکسی حروف ہر قسم کے نمونے مہیا کر دیئے۔ تو قرآن کریم کو حق تعالیٰ شانہ نے لکھا بھی ہے کلام بھی فرمایا۔

کلماتِ قرآن کی طرح مُرادِ ربانی بھی من جانب اللہ متعین ہے...... قرآن کے حروف کے اندر جو معانی اور مضامین ہیں وہ بھی حق تعالیٰ نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ظاہر آیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس آیت کے نیچے یہ معنی کھپ سکتے ہیں اور زمانے کے مطابق اس آیت سے یہ مضمون نکل سکتا ہے لہٰذا مرادُ اللہ یہی ہے! یہ نہیں ہوتا، کلمات قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اترے تو لغوی معنی تو آپ سمجھتے ہی تھے لیکن ''مرادِ ربانی'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتظار فرماتے رہتے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع فرمادیں کہ میرا مقصد اس آیت سے یہ ہے، پھر اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کلام میں ارشاد فرماتے تھے کہ یہ قرآن ہے اور یہ اس کی تفسیر ہے، اپنے ذہن سے غور نہیں فرماتے تھے کہ اس آیت کے نیچے کتنے مضامین کھپ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے، مراد بتلانا بھی اللہ کا کام ہے کہ اس کلمہ سے میرا یہ مطلب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم لغتِ عرب پر اترا، لغوی طور پر تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ظاہر الفاظ کا یہ مطلب ہے لیکن مرادِ ربانی کیا ہے! تو وہ بالکل الگ چیز ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ قرآن نے لغت سے لئے ہیں لیکن معنی اس میں اپنے ڈالے ہیں، مراد اس کی اپنی ہے، مثلاً لفظ ''صلوٰۃ'' ہے تو صلوٰۃ کے لغوی معنی دعاء کرنے کے ہیں، قرآن کریم نے صلوٰۃ کا لفظ لیا لیکن اس میں معنی اپنے ڈالے ہیں یعنی افعالِ خاصّہ کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ باندھو، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو یہ مرادِ ربانی ہے۔ لفظِ صلوٰۃ سے دعاء مانگنا مراد نہیں ہے جو کہ لغوی معنی ہیں۔ تو لغوی معنی اگرچہ اپنی جگہ ہیں لیکن عرفی معنی اپنی جگہ ہیں جو مرادی معنی ہے۔

یا مثلاً حج کا لفظ ہے، لغتِ عرب میں حج کے معنی قصد کرنے کے ہیں تو آدمی نے گھر بیٹھ کے قصد کر لیا، بس حاجی ہو گیا! کیا ضرورت پڑی کہ ایک کثیر مقدار روپیہ خرچ کر کے پاکستان سے عربستان جائے، ملک سے بے ملک ہوتا پھرے! گھر میں بیٹھ کر قصد کر کے حاجی بن جائے گا!۔ تو لغوی معنی مراد نہیں بلکہ مرادی معنی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں تو حج سے عبادتِ خاصّہ مراد ہے، صرف قصد کرنا مراد نہیں۔ تو لغت کو قرآن نے لیا ہے مگر عربی زبان میں اپنا مضمون اس کے اندر ڈالا ہے۔ اس کو منقولِ لغوی یا منقولِ اصطلاحی کہتے ہیں، اس طرح کی اصطلاحات ہیں۔ بہر حال قرآن کریم محض لغت پر نہیں اترا بلکہ اس کے ''معنیٔ مرادی'' وہ ہیں جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں۔ اگر محض لغوی معنی مراد ہوتے تو پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ حق تعالیٰ قرآن کریم کو بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دیتے اور اعلان حضرت جبریل کر دیتے کہ ''تم سب لوگ مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے، لے جاؤ اپنا اپنا علاج خود کر لیا کرو! جس طرح تمہیں سمجھ میں آجائے''

یوں نہیں کیا بلکہ قرآن اتارا اور پیغمبر کو بھیجا تا کہ وہ اس کی مراد بتلائیں، اس کے معانی اور مطالب سمجھائیں تو لغت اور چیز ہے، ادیب ہونا اور چیز ہے اور علم دوسری چیز ہے۔ محض ادب دانی کے بل بوتے پر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک قرآن دانوں کے پاس بیٹھ کر روایات واحادیث سے وہ معانی نہ سمجھ لئے جائیں جو سندِ متصل کے ساتھ ان تک پہنچے ہیں تب تک مرادِ ربانی معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔

لُغتِ عرب سے بدرجۂ کمال واقفیت کے باوجود مرادِ ربّانی از خود متعین نہیں کی جا سکتی...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، جب قرآن کریم کی یہ آیت روزہ کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① کہ رات کو کھاتے پیتے رہو جب تک کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے، یعنی رات کی تاریکی ختم ہو کر صبح صادق نمایاں نہ ہو جائے اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ جب صبح صادق نمایاں ہو کر پو پھٹے کھانا پینا بند کر دو اور روزے کی نیت کر لو۔ تو صبح صادق کو خیطِ ابیض سے تعبیر کیا اور خیطِ اسود سے رات کی تاریکی کو تعبیر کیا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جب یہ آیت آئی تو انہوں نے خیط کے لغوی معنی لیے جو ڈورے کے ہیں، لہٰذا انہوں نے دو ڈورے ایک کالا اور ایک سفید لے کر دونوں تکیے کے نیچے رکھ لیے اور پھر انہیں دیکھتے رہتے ...... جب تک اتنا چاندنا نہ ہو جاتا کہ الگ الگ ان کی پہچان ہو جائے کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق ہوئے تیس منٹ، آدھ گھنٹہ ہو چکا ہوتا، اس لئے کہ صبح صادق کے بعد بھی بہت دیر تک اندھیرا رہتا ہے، صورت بھی نہیں پہچانی جاتی، تو انہوں نے دونوں ڈورے رکھ لئے اور دیکھتے رہتے جب پوری طرح سے دونوں ممتاز ہو جاتے تب کھانا پینا بند کرتے اور روزے کی نیت کرتے حالانکہ صبح صادق کو گذرے تیس منٹ ہو چکے ہوتے۔

یہ خبر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: عدی! تم روزے کے لئے سحری کے بارے میں کیا کام کرتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ② کھاتے پیتے رہو جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے تو میں نے تکیے کے نیچے دو ڈورے رکھوا دیے ہیں اور دیکھتا ہوں جب اتنا چاندنا ہو جائے کہ دونوں ڈورے الگ نمایاں ہوں تو روزے کی نیت کر لیتا ہوں! حضور نے فرمایا: اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِيْضٌ! کہ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ خیطِ ابیض اور خیطِ اسود اس کے نیچے آ گئے۔ بندۂ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبح صادق ہے اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے تو تیرا تکیہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ دن اور رات دونوں اس کے نیچے سما گئے ③ تب انہیں معلوم ہوا کہ لغوی معنی مراد نہیں، اصطلاحی معنی مراد ہیں، شریعت کی مراد

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷. ② پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب بيان ان الدخول في الصلوم يحصل..... ص: ۸۵۲.

لغوی دھاگہ نہیں بلکہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ تو لغوی معنی اور ہیں۔ ایک لغت دان قرآن کو لغت کے بل بوتے پر حل کرے گا تو دونوں دھاگوں کو اٹھا کے رکھ لے گا چاہے روزہ ہو قبول کہ نہ ہو، لیکن جس نے علمِ قرآن حاصل کیا، مرادِ ربانی کو ان احادیث کے ذریعے، جو مستند علماء کے ذریعے منتقل ہوئی ہوں، سمجھا...... اسے معلوم ہو جائے گا کہ مراد یہ ہے وہ مراد نہیں ہے۔ ہر زبان میں کچھ لغت ہوتی ہے، کچھ عرف ہوتا ہے، لغوی معنی اور ہوتے ہیں اور عرفی معنی اور ہوتے ہیں۔ اگر آدمی اہلِ عرف میں نہ رہے تو نہ زبان کا لطف حاصل ہوگا نہ زبان کے محاورے معلوم ہوں گے بس ڈکشنری سے دیکھ کر پتہ چلا لیا کرے گا اس سے زبان نہیں آتی۔

اردو دانی میں مولانا غلام رسول کا ایک لطیفہ...... ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے ''کریلا اور نیم چڑھا'' تو ہمارے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ صوبہ سرحد (کے علاقہ) بفہ کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے جلیل القدر عالم اور دارالعلوم (دیوبند) میں تمام بڑے علماء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ یہ سارے بزرگ اُن کے شاگرد اور وہ سب کے استاذ تھے اور تھے صوبہ سرحد کے، لہٰذا اردو بولنا زیادہ نہیں آتی تھی، بس ایسے ہی بولتے تھے جیسے سرحدی لوگ بولا کرتے ہیں۔ ایک دعوت میں ان سب بزرگوں کا اجتماع ہوا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے ان کے بڑے بھائی حکیم مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب بھی تھے۔ تو مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس ہو گئے تمہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے، مگر تمہیں اردو بولنا نہ آئی! مولانا کو آیا غصہ، کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو میں لغو بے کار سمجھتا ہوں، اس لئے بولتا نہیں ہوں۔ خیر وہ سب ہنس پڑے تو حکیم محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں ''کریلا اور نیم چڑھا'' اب مولانا سوچ میں پڑ گئے! کہنے لگے کہ: عطف نے کام خراب کر دیا، یہ جو ''اور'' بیچ میں ہے، اگر یہ نہ ہو تو معنی ظاہر ہیں۔ کہا: کہ اچھا تم عطف نکال دو ''کریلا نیم چڑھا''۔ کہنے لگے: معنی ظاہر ہے: کریلا آدھا کچا آدھا پکا، یہ معنی ہیں۔ یعنی کریلا اردو کا لیا، نیم فارسی کا لیا، چڑھا ہندی کا لیا۔ تینوں کو ملا کے انہوں نے ایک مضمون بنا لیا کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارے ہنس پڑے تو مولانا کو بڑی حیرت ہوئی کہ ہنستے کیوں ہیں میں نے مضمون بیان کر دیا ہے۔ تب عرض کیا گیا کہ حضرت لغوی مطلب مراد نہیں، عرفی مطلب مراد ہے۔ عرف میں ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی برائی میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے کہ کریلا اپنی ذات سے کڑوا تھا ہی، نیم پر چڑھ گیا تو کڑواہٹ اور بڑھ گئی۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ چیز اپنی ذات سے بھی بری اور احوال بھی بُرے پیش آ گئے، تو برائی در برائی جمع ہو گئی، یہ مطلب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کریلے کو نیم پر ٹانگ دو آدھا کچا رہ جائے آدھا پکا رہ جائے۔ یہ آپ نے لغت کے بل بوتے پر مضمون گھڑ دیا یہ مراد نہیں ہے۔ تب مولانا کو واضح ہوا کہ واقعی میں پوری طرح اردو نہیں جانتا۔

یا جیسا کہ ہمارے ہاں لغت میں محاورہ ہے کہ" سونے پر سہاگہ" سونے پر سہاگہ کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ "سہاگے کو بیٹھ کر سونے پر چھڑک دو" بس سونے پر سہاگہ ہوگیا۔لیکن مراد یہ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کسی خیر کے اندر مبالغہ کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ" سونے پر سہاگہ" یعنی سونا تو اپنی ذات سے اعلیٰ ہی تھا، سہاگہ چھڑکنے سے اور زیادہ کندن بن گیا اور زیادہ چمک پیدا ہوگئی۔تو مبالغہ فی الخیر مقصود ہوتا ہے، یہ ہیں مرادی معنی۔لغوی معنی تو یہ ہیں کہ سونے کے اوپر سہاگہ چھڑک دیا جائے یہ مراد نہیں۔ ہر زبان میں ایسے محاورے ہوتے ہیں، فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ "شخص آب در سوار کرد" فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔لغوی معنی یہ ہیں کہ ٹوکری رکھ کے لوٹے سے اوپر پانی ڈال رہا ہے۔ مراد یہ نہیں ہے، مراد یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عبث کام ہوتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نہیں تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے، گھڑے میں ڈالتا تو کوئی بات ہوتی، یہ بے کار اور بے نتیجہ ہے،ٹوکری کے نیچے سے نکل جائے گا۔تو مرادی معنی اور ہیں اور لغوی معنی اور ہیں۔

ایک انگریز کا اردو میں مہارت کے دعویٰ کی قلعی کھلنا...... ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک یورپین کلکٹر تھا اور اردو اچھی جانتا تھا اردو میں ہی کچھ شاعری بھی کرتا تھا اس کے ذہن میں یہ تخیل پیدا ہوگیا کہ میں اردو پر پورا قادر ہوگیا ہوں اور ہندوستانی بھی ایسی اردو نہیں بول سکتے جیسی میں بولتا ہوں۔ان کے ہاں میر منشی اور پیش کار منشی نہال احمد صاحب تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، وہ یورپین ان کے آگے دعوے کیا کرتا تھا کہ "ویل تم اردو نہیں جانتا ہم جانتا ہے" یہ خون کے گھونٹ پی کے بیچارے چپکے ہو جاتے، پیش کار تھے کچھ کہیں تو ممکن ہے ملازمت سے برخواست کر دے۔ فرمانے لگے: میں خاموش رہتا، اگلے دن صاحب نے پھر کسی بات پر دعویٰ کیا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اُردو جانتا ہوں اور میز پر مکہ مار کے کہا کہ میں تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہوں۔

انہیں بڑا غصہ آیا، انگریز نے ایک مکہ مارا تھا انہوں نے میز پر دو مکے مارے اور کہا کہ صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو! تم کیا جانو اردو کیا چیز ہوتی ہے؟ سات سمندر پار سے آئے ہو، ہماری مادری زبان ہے ہم جانتے ہیں۔ صاحب کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا کہ کونسی چیز ایسی ہے جو میں نہیں جانتا؟ انہوں نے کہا کہ اچھا اس محاورے کے معنی بتلایئے کہ "اگر میں صاحب بہادر سے فلاں بات پوچھوں تو "بغلیں جھانکتے رہ جائیں"؟ صاحب تو واقعی بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یوں جھانک لیا! یوں جھانک لیا! بس ختم۔انہوں نے کہا کہ بس یہی آپ کی اردو دانی ہے! یہ مطلب نہیں۔

کہنے لگا: اور کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ اردو جانتے ہیں، خود سمجھئے اس کا کیا مطلب؟ صاحب بولے: کہ اچھا ہم تین دن میں ڈکشنری دیکھ کے آپ کو بتلائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ تین دن نہیں آپ کو سات دن کی مہلت ہے آپ دیکھ لیں۔ صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں، لغت کی

کتابیں دیکھنا شروع کیں، مگر وہ تو محاورہ تھا تو ساتویں دن آ کر کہا کہ: ویل پیش کار! ہمیں تو کسی ڈکشنری میں اس کے معنی نہیں ملے، کیا ہیں اس کے معنی؟ کہا کہ پہلے اقرار کیجیے کہ آپ جاہل مطلق ہیں! آپ اردو نہیں جانتے تب میں بتلاؤں گا۔ اب یہ کہنا پرسنالٹی (وقار) کے خلاف تھا کہ صاحب میں جاہل مطلق ہوں! خیر انہوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ اچھا ہم لاعلم ہیں، تم بتلاؤ! تب انہوں نے کہا کہ بغلیں جھانکنا تحیُّر کی طرف اشارہ ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ ہوتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ یہ معنی نہیں کہ ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا، یہ لغت ہے۔ محاورہ میں وہ معنی ہیں۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زبان میں بہت سے محاورات ہیں کہ ان کا مطلب لغت کچھ بتلاتی ہے عرف کچھ اور بتلاتا ہے تو جب تک آدمی اہل عرف میں نہ رہے اس زبان کے محاورات کو نہیں سمجھ سکتا نہ زبان کی لطافت کو سمجھ سکتا ہے۔

مرادِ ربانی کا تعین کس طرح ہوسکتا ہے ......تو قرآن کریم بھی بہر حال اللہ کا ایک خاص کلام ہے، خاص زبان ہے، اس کا بھی ایک عرف ہے، اسے لغت کے پیمانے سے ناپنا اور ڈکشنریاں دیکھ کر اس کے مضامین کو پھاڑنا......اس سے مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مراد جبھی سمجھ میں آئے گی جب متکلم خود ہی بتلائے کہ یہ میری مراد ہے۔ آپ اندازہ تو کیجیے کہ دو آدمی ہیں ایک ماں کے پیٹ میں انہوں نے پیر پھیلائے (ایک ماں سے پیدا ہوئے)، حقیقی بھائی ہیں، سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک وہ اظہار نہ کرے کہ میں یہ چاہتا ہوں۔ تو دو انسان جو ایک جنس کے ہیں ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہیں۔ ایک کا مافی الضمیر دوسرا نہیں سمجھتا جب تک دوسرا اظہار نہ کرے تو اللہ رب العزت جو نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمِ مطلق ہے۔ یہ بلا اللہ کے بتلائے کیسے اللہ کی مراوات کو سمجھ لے گا جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ فرمائیں کہ میری مراد یہ ہے۔

اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا، اس پر اپنا کلام اتارا، الفاظ بھی اتارے، معانی بھی اتارے تو آپ قرآن پاک کے الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ آپ موجد اور مخترع نہیں ہیں جیسا کہ الفاظ...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود نہیں بنائے، اللہ کے نازل کردہ ہیں اسی طرح ان الفاظ کے معانی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود اختراع نہیں فرمائے۔ بلکہ اللہ نے القاء کئے ہیں تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سمجھ میں مرادِ ربانی آئی تو مرادات کو بتلانے والی چیز حدیث ہے اور حدیث کو جب تک قرآن سے نہ ملایا جائے قرآن کے معانی اور مطالب نہیں سمجھے جاسکتے۔ جب تک اللہ کی بتلائی ہوئی مراد پیغمبر کی زبان سے ادا نہ ہو اور پیغمبر کے قول و فعل سے نمایاں نہ ہو مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلقہ فرائض ......تو حدیث درحقیقت قرآن کا بیان ہے، جب تک اسے نہ ملاؤ مرادات ربانی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کو بھیجا تو چار فرائض نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمائے۔

فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① ہم نے امیوں میں رسول بھیجا جوامی ہے اس کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیات کوتلاوت کرے، یہ تو آپ نے الفاظ پہنچادیئے، من وعن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانت کے ساتھ وہ الفاظ جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی کے ذریعے اتارے وہ پہنچادیئے تو ایک فریضہ تو ادا ہوگیا جو تلاوتِ آیات ہے گویا قانونِ خداوندی کی نص آپ نے پہنچادی۔

اب اس لفظ کے معنی کیا ہیں! تو دوسرا لفظ فرمایا گیا: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم بھی دے۔ تو تعلیم میں استاذ الفاظ نہیں رٹایا کرتا، الفاظ کے معانی بیان کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا کام یہ ہے کہ معانی اور مرادات سمجھائیں، یہ تعلیم میں آتا ہے۔

تیسری چیز فرمائی: ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ حکمت کی تعلیم دیں اور حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمتِ نظری اور ایک حکمتِ عملی۔ ایک فکری حکمت کہ حقائق بیان کئے جائیں ایک عملی حکمت کہ عمل کا نمونہ پیش کیا جائے تو تعلیم میں حکمت نظری تو آگئی، مرادات ربانی سمجھادی گئیں اب آگے عمل کا نمونہ رہ جاتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف معانی نہیں سمجھائے بلکہ عمل کر کے بھی دکھلایا تاکہ دوسری کسی چیز کی گنجائش نہ رہے اور متعین ہوجائے کہ اللہ کی مراد یہی ہے۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھلا دیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل کرتے ہیں وہ قرآن کے اندر ہوتا ہے۔ تو قرآن میں قال ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حال ہے، وہ جو کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہیں وہ قرآن کہتا ہے۔ تو قول وعمل میں پوری مطابقت ہے جو اللہ کا قول ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے۔

اگر ہم یوں کہہ دیں تفنن کے طور پر کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن نازل کئے تھے، ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن ہے جو ذات بابرکات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ تو قرآن درجۂ قال میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل درجۂ حال میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی کچھ کرتے ہیں جو قرآن میں ہوتا ہے تو عمل سے مراد متعین ہوجاتی ہے پھر جانبِ مخالف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن کی بجائے حدیث سے مناظرہ کرنے کی حضرت علیؓ کی ابن عباسؓ کو تاکید ...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلہ کے لئے بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا سنت سے دلیل پیش کرنا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ: امیر المؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن فہمی کی دعاء دی

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② ایضاً ③ ایضاً

ہے اور فرمایا ہے کہ: اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ① اے اللہ! ابن عباس کو اس کتاب کا علم بھی دے اور اس کی حکمت بھی اس کے قلب میں ڈال دے، تو جو میرا اصل مضمون ہے اسی سے آپ مجھے روک رہے ہیں کہ اس سے دلیل نہ پکڑوں اور عوام کے سامنے قرآن سے حجت نہ پیش کروں، سُنت سے پیش کروں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ ذُوالْوُجُوْہِ ② قرآن چونکہ دستورِ اساسی ہے اس کی ایک ایک آیت بڑی جامع اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، کئی کئی معنی لغت کے اندر سے آسکتے ہیں، تم اگر قرآن سے حجت پیش کرو گے تو فریق مخالف اس آیت سے ایک دوسرا مضمون لیکر پیش کردے گا کہ اس کا یہ مطلب ہے، تو عوام پر حق وباطل واضح نہیں ہوگا وہ کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ تو دونوں کا حق مشتبہ ہوگا حق وباطل کا فیصلہ نہیں ہوگا لیکن اگر سنت سے دلیل پیش کرو گے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے، اس میں جانبِ مخالف کی گنجائش نہیں ہے تو حق واضح ہوجائے گا کہ حق یہی ہے، اس لئے سنت سے دلیل پیش کرنا۔ تو قرآن کریم ذی وجوہ ہے ایک ایک آیت کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، لغت اس کا انکار نہیں کرتی لیکن مرادی معنی وہ ہیں جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارے ہیں کہ اس آیت سے ہمارا مطلب یہ ہے۔

جب وہ مراد سامنے آئے گی مطلب متعین ہوجائے گا اور وہ مراد بغیر حدیث کے پیش کئے نہیں آسکتی، بغیر سنت کے معلوم نہیں ہوسکتی۔ تو سنت قرآن کریم کا بیان ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ حدیث کا انکار کردیتے ہیں! کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں..... تو حدیث کا انکار کر کے وہ قرآن کو کیسے مانتے ہیں؟ قرآن کے لفظ ہی تو مطلوب نہیں معانی بھی تو مطلوب ہیں اور معانی حدیث بیان کرے گی۔ (لہٰذا انکارِ حدیث سے معانیٔ قرآن سمجھ نہیں آسکتے۔)

ایک منکرِ حدیث کے ساتھ کچھ لمحات سفر..... میں ایک دفعہ یہیں پاکستان میں کراچی سے لاہور آرہا تھا، ریل کا سفر تھا۔ اسی گاڑی میں ایک صاحب سوار ہوئے جو اَپ ڈیٹ (ماڈرن) قسم کے آدمی تھے، انہوں نے اس قدر نیازمندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کے لائیں اور کسی چیز کا اشارہ بھی کروں سمجھ جائیں اور وہ لا کر رکھ دیں، بہت بڑی خدمت کی، خیر کئی گھنٹے تک وہ بے چارے محبت سے خدمت کرتے رہے۔

میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیم یافتہ اور نوفکر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، بڑی دل میں قدر ہوئی، وہ تھے اصل میں منکرِ حدیث۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکارِ حدیث (کی بحث وتمحیص) کے اوپر لائیں۔ اس لئے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا آخیر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا اور احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کئے کہ وہ قابل اعتبار نہیں، ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

تو میں نے کہا: آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟ کہنے لگے قرآن کو۔ میں نے کہا قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج:۲۲ ص:۲۳۷ رقم: ۶۷۲۸. ② کنز العمال، ج:۱، ص:۵۵۱.

معلوم ہوا؟ کیا آپ پر وحی آ گئی تھی کہ یہ قرآن ہے، کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے اللہ کے رسول کے ارشاد سے۔ میں نے کہا: وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے، تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف، حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کونسی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟ تو وہ چپ ہو گئے۔

کہنے لگے کہ دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے، باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابل اعتبار نہیں، تو میں نے کہا: جنس کو تو آپ نے مان لیا، آپ مُصِر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں، میں نے کہا: جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں، محدثین نے خود ان کی صراحت کی ہے کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے، جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے وہ مورثِ یقین ہے، اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، حدیث متواتر کے انکار سے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ دوسرے درجہ کی حدیث حدیثِ مشہور ہے وہ اگر مورثِ یقین نہیں تو ظن غالب کی مورث تو ہے ہی، ظن غالب تو پیدا ہوگا۔ اور ظن غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہوگی۔ تیسرا درجہ خبرِ واحد کا ہے وہ اگر ظن غالب نہیں تو مطلق ظن تو پیدا کرتی ہے اور ظن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں جیسے بعض جگہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا لیکن حکم دیکھنے جیسا لگاتا ہے، وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے اور ذرا بھی جگہ خشک رہ جائے وضو نہیں ہوگا، لیکن کیا آپ ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑی دُھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے، بس ظن غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دھل گیا، اس ظن غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دھل گیا وضو ہو گیا تو بہت سے احکام کا مدار ظن پر بھی ہوتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے تو وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن پیدا کرے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی! تو میں نے کہا یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے تو جنسِ حدیث کو آپ نے مان لیا، اقسام حدیث وہ قابل اعتراض ہیں! تو خود محدثین ہی ان کی تقسیم کرتے ہیں، اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے: اب تو کچھ اعتراض نہیں، میں نے کہا: اب تو حدیث کا انکار نہیں کر دیں گے؟ کہنے لگے: نہیں اب نہیں کروں گا تو الحمدللہ لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔

قرآن کا قرآن ہونا حدیث کے اُوپر موقوف ہے...... بہر حال قرآن پاک کا ماننا حدیث کے ماننے پر موقوف ہے، حدیث کا انکار کرنا یہ خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ قرآن کے لفظ آپ مان لیں گے مگر معانی میں حدیث کو ماننا پڑے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ لفظوں میں بھی آپ کو ماننا پڑے گا اللہ کے رسول ہی کا تو ارشاد ہے کہ یہ آیت خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو لفظِ قرآن بھی حدیث سے ہی آپ نے مانے۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ارشاد فرمایا ہمیں کیا خبر تھی کہ قرآن کے یہ لفظ ہیں اور یہ معانی ہیں تو لفظوں کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، معانی کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، مراد ربانی کا سمجھنا بھی حدیث پر موقوف۔ تو منکرِ حدیث سب سے پہلے منکرِ قرآن ہے وہ قرآن

ہی کو نہیں مانتا اس لئے قرآن کے نہ ماننے پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ حدیث کا انکار کر دو۔ درحقیقت قرآن کا انکار مقصود ہے کہ یہ دنیا سے اٹھ جائے۔

حجیتِ فقہ ...... تو مقصد یہ تھا کہ قرآن اصل ہے اور اس کا بیان حدیث ہے۔ پھر اس بیان کی تشریحات اور معارف ہیں جو فقہ میں مدون ہو گئے ہیں۔ تو بنیادی طور پر حجت قرآن ہے، دوسرے درجہ پر حجت حدیث ہے جو قرآن کو قرآن ثابت کرتی ہے، بہت سے احکام بلا واسطہ قرآن سے نکل رہے ہیں بہت سے وہ ہیں جو اس کی کلیات سے نکلتے ہیں، مجتہدین ان کلیات میں چھپے ہوئے مضامین کو نکال کر اپنے اجتہاد و بیان سے باہر پیش کر دیتے ہیں تو بالواسطہ وہ چیز قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔ فقہ کے مسائل بھی درحقیقت قرآن ہی کے مسائل ہیں فرق اتنا ہے کہ ان مسائل کے نکالنے پر ہم اور آپ قادر نہیں ہیں جن کو اللہ نے اجتہاد کا ملکہ دیا ہے وہ قادر ہیں وہ نکال کے ہمارے آگے پیش کر دیتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا واقعہ ...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ حرم شریف میں بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، تو قلب میں علم کا ایک جوش پیدا ہوا، علم کا دریا امڈا، فرمایا کہ: آج جو مسئلہ پوچھو گے میں قرآن سے جواب دوں گا ایک شخص نے آ کے عرض کیا کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ حرم میں جیسے سانپ بچھو کو پناہ نہیں ہے ،تتیات بھڑ وغیرہ کو بھی قتل کر سکتے ہیں، تتیات کو بھی پناہ نہیں ہے وہ بھی قتل کئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو یہ کہتے ہیں کہ سانپ اور بچھو کو تو حرم میں مار سکتے ہیں لیکن بھڑ اور تتیات کو نہیں مار سکتے انہیں بھی حرم کے اندر امن دیا گیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ تتیات اور بھڑ حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں، تو ایک شخص نے سوال کیا کہ قرآن میں کہاں ہے کہ تتیات اور بھڑ کا قتل حرم میں جائز ہے؟

فرمایا تو نے قرآن نہیں پڑھا! قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ: ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو لا کے دیں اسے قبول کرو جس کو روک دیں اس سے رک جاؤ، کیا یہ آیت ہے؟ کہا: جی ہاں! آیت ہے۔ فرمایا: قرآن نے جو فرمایا: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ رسول لا کے دے اسے قبول کر لو اور جس سے رسول روک دیں اس سے رک جاؤ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد قرآن کی اس آیت سے حجت ثابت ہوا کہ جو رسول فرما دیں اس کو مان لیں تو قرآن کی رو سے حدیث حجت ہوئی اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اِقْتَدُوْا اِهْتَدَيْتُمْ مِنْ بَعْدِىْ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرو ② تو قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننا واجب ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا حکم ماننا واجب ٹھہرا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: يُقْتَلُ الزُّنْبُوْرُ فِى الْحَرَمِ تتیات بھڑ حرم کے اندر ماری جا سکتی ہیں تو بواسطۂ قرآن یہ حکم ثابت ہو گیا۔

---

① پارہ: ۲۸ سورۃ الحشر، الآیۃ: ۷۔ ② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر و عمرؓ ج: ۱۲ ص: ۱۲۱۔

تو بعض احکام قرآن سے بلاواسطہ نکلتے ہیں، بعض بواسطۂ حدیث نکلتے ہیں، بعض احکام بواسطۂ اجتہاد و بیان نکلتے ہیں۔ انجام کار یہ سب احکام قرآن ہی کے سمجھے جائیں گے واسطہ بلاواسطہ کا فرق ہوگا۔ تو فقہ وحدیث وغیرہ کا انکار کر کے آدمی فی الحقیقت قرآن کا بھی انکار کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کو وہ ہی مان سکتا ہے جو پہلے سنت کو مانے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل کو مانے۔

تو بہر حال بات اس پر چلی تھی میں دور چلا گیا کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے اور مکتوب بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے لکھا بھی ہے تکلم بھی فرمایا ہے۔ حقیقی معنوں میں کلام ہے تو...... وہ قرآن ہے۔ تورات کتاب اللہ ہے کلام اللہ اسے مجازاً کہیں گے اور انجیل وہ مضمونِ خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القاء کر دیا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اسے ادا کر دیا تو اس کی شان ایسی ہے جیسی حدیث۔ تو حدیث بھی تو وحی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر القاء کی گئی لیکن الفاظ آپ کے ہوتے ہیں اور مضمون حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، تو انجیل بمنزلۂ مضمون خداوندی کے ہے اور تورات بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے، تکلم ان کے ساتھ نہیں ہوا۔

کلام خداوندی انمٹ کیوں ہے؟...... قرآن وہ ہے کہ محض کتاب کے طور پر نہیں اُتارا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے کلام بھی کیا ہے تو صحیح معنی میں اگر کلام ہے تو وہ قرآن کریم ہے اور ظاہر یات ہے کہ کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹتا نہیں، وہ قائم رہ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ ہی کا کلام ہے...... آپ جو بولتے ہیں وہ بھی نہیں مٹے گا وہ جم کر محفوظ ہو گیا اور قیامت کے روز ایک ایک لفظ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس فضا میں کلام محفوظ ہوگا فضا میں کلام محفوظ ہوتا ہے۔ اسی پر ریڈیو کی ایجاد بنی ہے۔ اگر فضا کے اندر کلام محفوظ نہ ہو تو ریڈیو کے ذریعے کس چیز کو پکڑ کر آپ تک پہنچاتے ہیں، مشینوں کے ذریعہ آپ اس کلام کو کھینچتے ہیں جو فضا کے اندر محفوظ ہے اور لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں، تو اگر کلام زبان سے نکل کر فنا ہو جایا کرتا تو ریڈیو کی ایجاد نہ ہوتی، اور کلام آپ تک نہ پہنچتا، تو وہ فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے، فضا سے مشینوں کے ذریعے منتقل کر لیتے ہیں، تو کلام بندہ کرے تو مٹنے والا نہیں ہے ایک ایک لفظ اس کا محفوظ ہے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ① کوئی ایک لفظ کوئی ایک قول جو زبان سے نہیں نکالتے مگر تاکنے والا اس کو تاک لیتا ہے، محفوظ کرنے والا محفوظ کر لیتا ہے۔ تو فضا کے اندر یہ سارے کلام محفوظ ہیں۔

حتیٰ کہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم ریڈیو اور سائنسی ترقی کے ذریعے ایک نہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ کلام سنوا دیں گے جو انہوں نے حواریوں کے سامنے بطور خطبہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جتنے کلام اب تک انسانوں نے کئے ہیں وہ سب فضا میں محفوظ ہیں، ہم امتیاز نہیں کر سکتے، شور کی صورت میں اس کلام کو سنتے ہیں مگر ہے محفوظ، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مشینوں کے ذریعے کلاموں کو متمیز کر دیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام

① پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۱۸۔

ہے، یہ فلاں کا کلام ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم تمہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا خطبہ ایجادات کے ذریعہ سے سنادیں گے۔ تو بہر حال کلام محفوظ ہے مٹنے والا نہیں تو بندے کا کلام جو بولنے کے بعد مٹ نہیں سکتا تو خدا جس کلام کا تکلم کرے وہ کیسے مٹے گا؟

آپ کے کلام کو تو فضا گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کا کلام جب چلتا ہے تو فضا کو گھیر لیتا ہے، فضا خود اس کلام میں محفوظ ہے، وہ مٹنے والا نہیں ہے، حتی کہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر یہ لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کرو تو تصور یہ باندھا کرو کہ یہ میں نہیں بول رہا، کلام حق تعالیٰ کا ہے زبان میری حرکت کر رہی ہے، لیکن یہ صوتیہ لفظ اللہ کی طرف سے اُتر رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ اس کی مشق کرتے رہو، پڑھتے ہوئے ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے کان میں آواز آئے گی کہ تم نہیں پڑھ رہے ہو حق تعالیٰ کی آواز ہے، وہ پڑھ رہے ہیں اور جب یہ مشق ہو جائے گی تو: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ ① ہمارا نبی ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتا ہم وحی کرتے ہیں، تو بولتا ہے تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے، کلام اللہ کا ہوتا ہے، اترتا ہے زبان کے اوپر الفاظ کے واسطہ سے۔ تو اگر کوئی بندہ متبع رسول ہو فنائیت کا مرتبہ اختیار کرے اور اس تصور میں غرق ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کی برکت سے امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ تلاوت خود کر رہے ہیں مگر ان کے کان میں آواز آرہی ہے کہ اوپر سے پڑھا جا رہا ہے، محض زبان میری ہے جو حرکت کر رہی ہے: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی﴾ ② تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے جب بندہ کا کلام زبان سے نکل کر نہیں مٹ سکتا وہ برقرار ہے اور باقی رہے گا تو اس کی حفاظت گویا طبعی اور قدرتی ہے تو حق تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ③ ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے، ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو یہ محفوظ رہنے والی چیز ہے، کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔

سابقہ کتب کیوں مٹ گئیں اور قرآن کیوں مٹنے والا نہیں؟...... فرق اتنا ہے کہ سابقہ کتب کی حفاظت کا ذمہ دار امتوں کو قرار دیا گیا تھا کہ تورات کی حفاظت تم کرو، انجیل کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور زبور کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور وہ انجام نہیں دے سکیں، لفظوں میں بھی فرق کر دیا، معانی میں بھی فرق کر دیا، تحریف لفظی اور تحریف معنوی سب کچھ کر دیا جس سے کلام متغیر ہو گیا تو ضرورت پڑی کہ کوئی مستند کلام بھیجا جائے، سابقہ کتب کو تو ان امتوں نے ضائع کر دیا...... اس لئے کہ حفاظت ان کے ذمہ تھی اور وہ نبھا نہیں سکے جبکہ قرآن آخری کتاب ہے قیامت تک اب کوئی نیا کلام دنیا میں آنے والا نہیں ہے تو اگر وہ بھی آپ کے سپرد کر دیا جاتا اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو تورات وانجیل کا حشر ہوا کہ وہ بدل گئیں اور یہ قیامت تک رکھنا تھا۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴. ② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

اس کے علاوہ اس لئے بھی حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے کہ ہم نے یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو اول تو فطری طور پر کلام ضائع نہیں ہوسکتا ہے مگر آپ کے قلوب سے ضائع ہوسکتا تھا تو حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا، سینکڑوں بچے آپ کے مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم پا رہے ہیں، قرآن حفظ کر رہے ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں کہ قرآن کیا چیز ہے! کچھ پتہ نہیں اس کے اثرات کیا ہیں! بس حفظ کر رہے ہیں تو حق تعالیٰ ہی تو حفاظت کر رہے ہیں، ان بچوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں، اگر بوڑھے حفظ کیا کرتے تو وہ حفاظت بوڑھوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بھائی! بوڑھے آدمی سمجھدار ہیں۔ قرآن کی حفاظت کے لئے یاد کر رہے ہیں لیکن بچوں میں تو یہ جذبہ نہیں، یہاں محض حفاظت خداوندی ظاہر ہو رہی ہے کہ ہم حفاظت کر رہے ہیں جو بچوں کے ذریعے سے قرآن کو محفوظ رکھا ہے۔ اور معانی کی حفاظت علماء کے ذریعے کی اور فرمایا کہ:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بینات ہیں جن کے حقائق اور مضامین اہل علم کے سینوں میں ڈالے گئے ہیں۔ وہ وہاں محفوظ ہیں، مٹ نہیں سکتے، حفاظت گاہ ایسی چیز کو قرار دیا گیا کہ نہ وہاں چور پہنچ سکتے، نہ ڈاکو پہنچ سکتے، نہ کوئی خائن پہنچ سکتے، وہ دلوں میں محفوظ ہیں، وہاں چوروں کی رسائی ہی نہیں ہے، اگر لوہے کے صندوقوں میں معانی محفوظ کیے جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ صندوقوں کو دریا برد کر دیں، ممکن تھا زمین میں دفن کر دیں، ممکن تھا کہ زمین صندوقوں کو بھی گلا دے اور اوراق بھی گلا دے، کوئی چور چوری کر کے لے جائے تو قرآن ضائع ہو جاتا۔ تو نہ صندوق میں حفاظت کی، نہ الماریوں میں، بلکہ اہل علم کے سینوں میں حفاظت کی، جہاں نہ چور پہنچ سکتا ہے نہ ڈاکو۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ بچوں اور علماء کے ذریعے سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے تو یہ اسباب حفاظت ہیں، حفاظت کرنے والے وہی ہیں، جیسے خالق وہ اللہ ہیں سبب تخلیق آپ ہیں، درخت بنانے والے وہ ہیں سبب کاشتکار کو بنا دیا۔ تو حفاظت کرنے والے قرآن کے وہ ہیں سبب حفاظت آپ کو بنا دیا۔ یہ آپ کی سعادت ہے جو بھی سبب بن جائے۔ یہ انگلی کاٹ کے شہیدوں میں داخل ہونا ہے، محفوظ تو رہنا ہی ہے یہ کلام، مٹنے والا تو ہے نہیں، آپ ذریعہ بن جائیں تو ہماری سعادت ہے ورنہ رہے گا محفوظ، تو بہرحال کلام خداوندی معجزہ ہے نہ اس کی کوئی مثل لا سکتا ہے نہ اسے کوئی ضائع کر سکتا ہے۔

قرآن کی دو سندیں، سند باطنی...... جہاں تک اس کی سند کا تعلق ہے وہ بھی حق تعالیٰ نے ایسی مستحکم بنائی ہے کہ اس میں خلل اندازی ممکن نہیں۔ قرآن کی سند کے دو درجے ہیں ایک اللہ سے نبی تک اور ایک نبی سے ہم تک۔ ایک باطنی سند ہے اور ایک ظاہری سند ہے۔ باطنی سند تو یہ ہے کہ اللہ نے کلام کیا جبریل علیہ السلام نے سنا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کو سنایا اور ان) کے قلب مبارک پر لا کے اتار دیا تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کا تعلق ہے وہ تو بنائے اخلاص ہے، کمالات کا منبع ومخزن ہے، وہاں سے ہر چیز انتہائی امانت کے

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔

ساتھ سرزد ہوگی، اس میں معاذ اللہ کوئی غلط چیز شامل نہیں ہوسکتی۔ تو حق تعالیٰ شانہ تو امین ہی ہیں، اب بیچ میں نازل فرشتہ ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ بے چارہ معصوم ہے، لہٰذا ہمارا کلام تمہیں قبول کرنا پڑے گا، دباؤ سے نہیں منوایا بلکہ جبریل کے اوصاف بیان کئے جو ناقلوں کے اوصاف ہوتے ہیں، تا کہ تم عقلی اور فنی طور پر یہ سمجھ سکو کہ یہ راوی غلط قسم کا راوی نہیں ہے بلکہ جتنے اصول روایت ہیں وہ سب اس کے اندر پائے جاتے ہیں، ورنہ یہ فرما دیتے کہ کلام ہمارا ہے اور ہمارا فرشتہ لے کر آتا ہے جب آئے گا ماننا پڑے گا کوئی وجہ نہیں کہ انکار کرو، یہ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ راوی کو پرکھ لو، اس کے اوصاف کو دیکھ لو، راویوں کے اوصاف اس میں پائے جائیں تو قبول کرو، نہ پائے جائیں تو نہ قبول کرو تو جبریلؑ کے اوصاف بیان کئے ہیں، سورۂ "اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" میں یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ﴾ ① یہ ایک رسول کا قول ہے یعنی حضرت جبریل کا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لے کر آئے تو اول تو رسول کہنے سے جبریلؑ کی امانت ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ اللہ نے انہیں قاصد بنایا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت اپنا قاصد، اپنا سفیر اسے نہیں بنا سکتی جس میں ذرہ برابر بغاوت کا کوئی شائبہ ہو۔ حکومت اپنا سفیر اسی کو بنائے گی جو حکومت کی پالیسی کا محافظ ہو، حکومت کے قانون کا دل وجان سے دلدادہ ہو، ذرّہ برابر خیانت نہ کرے، حکومت کا جو منشا ہے اس کو دنیا کے آگے پیش کر دے، تو اوّل تو کسی کو قاصد بنا دینا، یا سفیر بنانا یہ خود قابل اعتماد ہونے کی دلیل ہے۔ جب حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہمارا قاصد ہے، ہمارا رسول ہے، تو قاصد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو اس کے اوپر اعتماد ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں قابل اعتماد شخصیت ہیں جنہیں سفیر کے درجے کا اعتماد حاصل ہے۔

سندِ قرآن پر اعتراضات کے جوابات...... لیکن آدمی کہہ سکتا تھا کہ قاصد تو بنایا مگر قاصدوں میں بعض دفعہ کھوٹ ہوتا ہے، کچھ بدل بھی جاتے ہیں ممکن ہے کلام کو بدل دیں یا اس کے منشاء کو بدل دیں۔ تو ایک جملہ آگے فرمایا کہ: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ② وہ فقط رسول ہی نہیں ہیں بلکہ کریم النفس بھی ہیں، بزرگی کے آثار ان میں رچے ہوئے ہیں تو بزرگ آدمی کیسے جھوٹ بولے گا! ایک ادنیٰ صالح کو جسے آپ بزرگ کہتے ہیں کبھی آپ کو شبہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ جھوٹ بولے گا تو فرشتہ معصوم ہو کر جھوٹ بول دے وہ بھی اللہ کے اوپر بزرگ بن کر یہ ناممکن ہے تو فرمایا کہ رسول کا قول ہے، رسول بھی کریم ہے، کرامت والا ہے جس میں بزرگیاں رچی ہوئی ہیں۔

مگر کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی لیکن بے چارہ ضعیف ہے، دبّو قسم کا آدمی ہے، جہاں کسی نے تلوار دکھائی بدل گیا کہ یہ نہیں یہ مطلب تھا، جان بچانے کے لئے جھٹ مطلب کو بدل دیا تو اگر کوئی بزرگ ہو، ہو بے چارہ ضعیف النفس، تو اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دباؤ سے کلام بدل دے یا مضمون کو بدل دے تو جبریلؑ میں بھی ممکن ہے ضعف ہو جو ایسے کلام کو بدل دیں۔ اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿اِنَّهٗ

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔

﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ﴾ ① طاقتور ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں کہ کسی کے دباؤ ڈالنے سے بات بدل دے۔ تو حضرت جبریلؑ کی طاقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی قوم کی جب بستیاں اٹھا کر آسمان پہ لے جا کے پٹخ دیں تو اتنا طاقت ور کسی سے دب کر غلط بات کہہ سکتا ہے! کون اس کے اوپر دباؤ ڈال سکتا ہے! تو فرمایا گیا کہ رسول بھی ہے، بزرگ بھی ہے، کریم النفس بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں ہے کہ دباؤ ڈالنے سے کسی کی بات مان لے یا بات کو بدل دے۔

لیکن اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی اور طاقتور بھی سہی مگر سننے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے، دور سے آواز آ رہی ہے، معلوم نہیں کیا سن لیا ہو؟ کہا کچھ تھا...... اور سننے میں آ گیا کچھ، کوئی پاس اور قریب ہو تو بے شک یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی ہو، مگر ایک شخص نے دور سے سنا ہے تو کتنا ہی نیک نیت ہو سماعت میں تو فرق آ سکتا ہے، کچھ کا کچھ سن لے! اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ ② کہ مقامِ عرش کے پاس مقیم ہے کہیں دور نہیں ہے اس لئے ممکن نہیں ہے کہ سماعت میں غلطی ہو وہیں تو اس کا مقام ہے وہ تو ہمارے ہاں کا حاضر باش ہے جو ہم کہتے ہیں بلا واسطہ وہ سنتا ہے، ممکن نہیں کہ غلطی کرے۔ تو اتنے اوصاف بیان فرما دیئے۔

اس کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ صاحب! بے شک رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقت ور بھی ہے، عرش کے پاس مقیم بھی ہے، لیکن پوزیشن کچھ معمولی قسم کی ہے لوگ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے، کوئی باحیثیت ہو، کوئی منصب اور مقام اس کے پاس ہو تب تو بات قابلِ اعتبار ہوتی، ایک بات کہہ دے ایرا غیرا نتھو خیرا تو اس کی کیا وقعت ہو گی؟ کوئی پوزیشن، منصب اور حیثیت ہونی چاہیے۔ تو ایک جملہ اور بڑھایا کہ مُطَاعٍ سید الملائکہ ہیں، سارے ملائکہ سلام اللہ علیہم کے سردار ہیں۔ تو جو سارے معصوموں کے سردار ہوں اور ان کے اوپر انہیں والی بنایا گیا ہو ان کی عصمت میں کیا کمی رہ سکتی ہے! جو سارے فرشتوں کے مخدوم و مطاع ہوں ان کے کلام میں غلطی کیسے ممکن ہے! تو رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقتور بھی ہے، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہے، سننے میں بھی غلطی نہیں ہے اور مُطاع و سید الملائکہ بھی ہیں۔

لیکن اس کے بعد پھر ایک شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ سارے اوصاف سہی مگر نسیان اور بھول چوک ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ممکن ہے بھول کے کچھ کا کچھ کہہ دیا ہو، یا ارادتاً کچھ کمی بیشی کر دی ہو کہ بھئی وقت کے مناسب یہ ہے، لہٰذا اس کی یہ تاویل کر دو، زمانہ حال کے لوگ ہیں، پرانے زمانے کے لوگوں کے محاوروں کو سمجھیں گے نہیں کوئی محاورہ ہی بدل دو تو آگے ایک اور جملہ بڑھایا کہ: ﴿ثَمَّ أَمِيْنٍ﴾ ③ وہ نہایت امانتدار ہے، ممکن نہیں کہ لب و لہجے میں بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

کوئی فرق کرے، ممکن نہیں ہے کہ الفاظ میں فرق کرے یا معانی میں فرق کرے۔ اب یہ سارے اوصاف ظاہر ہے کہ راویوں کے ہیں۔ تو حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجبور ہوکر اور دب کر مانو کہ یہ قرآن ہے بلکہ بصیرت سے اسے قبول کرو کہ اس کے راوی کیسے ہیں سند میں تو کوئی غلطی نہیں۔

پیغام رسانی میں جھوٹ اہل کفر بھی عیب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ اہل ایمان...... سند میں کوئی غلطی ممکن نہیں اوّل تو یہ ہمارا قاصد ہے جو کہ خود معتمد علیہ ہونے کی دلیل ہے پھر اپنی ذات سے بزرگ اور کریم النفس بھی ہے تو کریم النفس لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ یہ تو کمال ایمان کی بات ہے میں تو کہتا ہوں کفار بھی اپنی حیثیتِ عرفی سنبھالنے کے لئے اس کی رعایت کرتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں چاہے دنیاداری کے مجمع میں ہوں۔

ابوسفیان ہرقل کے دربار میں...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام جب عظیم روم کے نام پہنچا ہے تو ہرقل نے کہا کہ عرب کے کچھ لوگ آئے ہوں تو ان کو ذرا جمع کردو، میں ان کے حالات پوچھوں جنہوں نے دعوائے نبوت کیا ہے۔ تو اس کے سامنے عربوں کا وفد پیش ہوا اس وفد کی قیادت ابوسفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ انہیں آگے کھڑا کیا باقی جو عرب تھے انہیں پیچھے کھڑا کیا گیا اور ہرقل نے کہا کہ میں تمہارے قائد سے سوال کروں گا اگر یہ صحیح کہے گا تو تم سب کی طرف سے صحیح تسلیم ہوگا اگر غلط کہے تو تم لوگ ٹوک دینا۔

ابوسفیان سے ہرقل نے چند سوالات کئے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کبھی اس (مدعیِ نبوت) شخص کا تم پر جھوٹ ثابت ہوا؟ کبھی عمر بھر میں کوئی غلط بات کہی ہو؟ اگر کبھی ایک جھوٹ بھی ثابت ہو تو یہ کہہ سکیں گے کہ دعویٔ نبوت میں وہ غلط ہے۔ تو ابوسفیان کہتے ہیں کہ اب مجھ کو کشش و پیچ ہوئی اس لئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتے تو تھے نہیں، ہوسکتا تھا کہ دُور کا فاصلہ ہے، شام میں بات چیت ہو رہی ہے کوئی غلط بات منسوب کردیتے کہ ہاں صاحب! فلاں بات غلط ثابت ہوئی ہے، لیکن انہوں نے دل میں کہا: اگر میں نے ایک جھوٹ بول دیا تو میری جو حیثیتِ عرفی ہے وہ ختم ہو جائے گی، اس لئے مجھے سچ بولنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ: ہم نے کبھی جھوٹ کے اوپر تجربہ نہیں کیا۔ گنجائش اتنی نکلی کہ اکثر کی تو بات یہی ہے باقی میرے آنے کے بعد جھوٹ بول دیا ہو تو یہ الگ بات ہے، اس کے سوا کوئی جملہ نہیں کہہ سکے۔ ① تو ابوسفیان کو کفر کے باوجود اس کی رعایت ان کے ذہن میں تھی کہ کوئی جھوٹ کا کلمہ نہ نکلے ورنہ میری حیثیتِ عرفی بگڑ جائے گی۔

تو ایک کافر جب پیغام رسانی میں جھوٹ بولنے کو عیب سمجھتا ہے تو ایک مؤمن کیسے عیب نہیں سمجھے گا اور مؤمن بھی فرشتہ جو ایمان کی حدِ کمال کے اوپر ہو، وہ کیسے جھوٹ بولے گا! وہ کیسے امانت میں خیانت کرے گا! تو حق تعالیٰ نے دباؤ نہیں ڈالا کہ چونکہ ہم بھیجتے ہیں لہٰذا ماننا پڑے گا، نہیں! بلکہ جسے بھیج رہے ہیں اس کے احوال کو دیکھو، اس کے اوصاف کو دیکھو، وہ اوصاف پر پورا اترتا بھی ہے کہ نہیں تو اللہ تعالیٰ تو بے عیب ہے، منبع کمال ہے، وہاں تو غلطی

① الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص: ۱ رقم: ۷.

کا امکان ہی نہیں، بیچ میں امکان تھا تو فرشتے کے اوصاف بیان کئے کہ وہ راوی غلط نہیں ہوسکتا۔

کلام اللہ کو تین امانتوں نے گھیر رکھا ہے...... اب تیسری ذات وہ ہے جس پر کلام اترا وہ پیغمبر ہیں۔ پیغمبر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو سارے انبیاء کے کمالات کا نچوڑ اور سارے کمالات کا منتہاء ہیں، کوئی کمال ایسا باقی نہیں ہے کہ کسی اور نبی کو لا کر اسے پورا کرایا جائے۔ ایک نبی میں وہ سارے کمالات جمع کر دیے گئے اور قیامت تک ایک ہی آفتاب کی روشنی باقی رہے گی، ان پر وہ کلام اُترا تو نبی معصوم، فرشتہ معصوم، اور حق تعالیٰ منبع کمالات۔ تو مروی عنہ جس سے روایت چلی (اللہ تعالیٰ) وہ بے عیب، فرشتہ جو کلام لے کر آیا وہ بھی معصوم وامانت دار اور جس پیغمبر پر لے کر آیا وہ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کی عظمت میں کلام نہیں۔ اللہ کے ناموں میں ایک نام امین ہے تو اللہ الامین کی طرف سے کلام اترا اور جبریل کا لقب بھی امین ہے، کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امین کہتے ہیں۔ تو امین نے کلام کیا، امین لے کر آیا اور امین کے اوپر اترا۔ تین (اعلیٰ درجے کی) امانتوں میں اوپر سے نیچے تک گھرا ہوا ہے، پھر اس میں غلطی کا احتمال کیا ہے! پھر بھی اگر آدمی نہ مانے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ نے کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا، اوصاف بیان کر دیے ہیں کہ ان اوصاف کا راوی غلط نہیں ہوسکتا، اس لئے ماننا چاہیے، آدمی کے دل میں انصاف ہو تو مانے گا۔

سندِ کلام اللہ میں ذاتِ نبوت کا مقام...... اب آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی ہے تو آپ کے اوصاف شروع کئے۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ نبی ہیں مان لو۔ بے شک اگر نبی کہہ کر منواتے تو ماننا پڑتا کیونکہ نبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ جھوٹ سے بری اور بالا ہو۔ مگر آپ کے بھی اوصاف بیان کئے فرمایا: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ① جن پر یہ کلام اترا ہے کوئی جنونی تھوڑے ہی ہیں، یہ تو خود سرچشمۂ عقل ہیں اور یوں جنون کی نفی کر دی۔ اب رہا یہ کہ عقلمند کیوں نہ کہہ دیا، بجائے اس کے کہ جنون کی نفی کر دی جائے...... یوں کہہ دیا جاتا کہ آپ بہت بڑے عقل مند ہیں، یہ نہیں فرمایا؟ اس لئے کہ عقل مند کہنے سے شبہ ہوتا: آیا فلسفیوں میں سے کوئی فلسفی ہیں؟ جب کہ نبی اور فلسفی میں بونِ بعید ہے، عقل مند ثابت کرنے کے معنی یہ تھے کہ آپ کو فلسفی ثابت کیا جائے اور نبوت وفلسفہ میں بُعد ہے، اس لئے جنون کی نفی کر دی یہ کہ کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں! باقی یہ ہے...... عَلٰی سَبِیْلِ التَّنَزُّلِ جب کسی بڑے آدمی کا کلام منوایا کرتے ہیں جس کے سب اوصاف مسلّم ہوں تو یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کام کرنے والا کوئی دیوانہ تھوڑا ہی ہے، اس کی بات ماننا کیوں نہیں! تو جنون کی نفی درحقیقت ساری برائیوں کی نفی ہے تو آپ کی یہی شان بیان فرمائی کہ: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ② اب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے جو روایت سنی ہے وہ انہی سے سنی بھی ہے یا محض اپنے تخیل سے معاذ اللہ کچھ کہہ دیا ہے! تو فرمایا کہ: صرف سنی ہی نہیں ہے بلکہ راوی کو دیکھا بھی ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ ③ تو صرف سماع ہی نہیں

① پارہ: ۳۰، سورة التكوير، الآية: ۲۲. ② ③ ایضاً الآیة: ۲۳.

دیدار بھی ثابت ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ نے اصلی صورت میں دیکھا ہے تو اب جب راوی کو دیکھا بھی ہو، اس کی بات سنی بھی ہو اور پاس بیٹھ کر سنی ہو..... تو سنانے والا بھی امین، سننے والا بھی امین، بھیجنے والا بھی امین، امانتوں میں گھرا ہوا کلام اور راوی اور مروی عنہ دونوں صاحب کمالات، تو اب خطاء کا احتمال کیسے ہوسکتا ہے! اب خواہ مخواہ عناد سے کوئی انکار کرے تو کرے! لیکن اصول کی رُو سے انکار جائز نہیں ہے۔ تو جبریل کو دیکھا بھی ہے، اس سے کلام سُنا بھی ہے تو سماع و دیدار کے ساتھ روایت کر رہے ہیں۔

اب یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ بات تو ساری سچی سنی اور واقعی پورا کلام لے لیا مگر آگے کہنے میں ذرا بخل ہے کہ بھئی! ہر ایک کو میں اپنا علم کیوں دوں! بہت سے صاحب کمال ہوتے ہیں کہ فن آتا ہے مگر سکھلاتے نہیں کہ کہیں دوسرا میرا ہمسر نہ ہو جائے! میں ہی تنہا اور یکتا رہوں! ہزاروں آدمی اپنے اپنے کمالات کو قبر میں لے گئے اور دنیا میں ان کا نشان بھی نہیں۔ بڑے بڑے اطباء بہترین نسخے اپنے سینے میں رکھ کر لے گئے! کسی کو نہیں بتلائے..... تو گویا صاحب فن نے بخل برتا، ممکن ہے یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہو تو فرمایا گیا: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ ① غیب کی چیزیں پہنچانے میں وہ بخیل نہیں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ غائب کی چیزوں کو آگے پہنچایا جائے تاکہ ہر چیز کی تمہیں ہدایت ملے۔ اب یہ ممکن تھا کہ کوئی یوں کہتا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درست سنا تھا مگر ممکن ہے کہ شیطان نے بیچ میں کوئی کلمہ ملا دیا ہو تو وہ خلط ملط ہو گیا ہو آگے اس کی بھی نفی فرما دی کہ: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ﴾ ② تو شیطان کا کیا دخل! جب قرآن کی وحیٔ خداوندی چلنی شروع ہوئی تو شیطان کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک جاتے تھے، ملائکہ کی کبھی کبھار کوئی بات سن کر اس میں سو جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو پیش کر دیتے تھے، کوئی ایک آدھ بات سچی بھی نکل آتی تھی تو لوگ معتقد ہو جاتے تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ شیطان آسمان پر اس طرح جاتے تھے اور کچھ جھوٹ ملا کے دعویٰ کیا کرتے تھے لیکن ان کے راستے بند کر دیے گئے کہ اب تک تو آسمانوں کے دروازوں سے چڑھتے تھے اب چڑھ بھی نہیں سکتے خلط ملط تو وہ کیا کرتے، تو شیطان کا دخل بھی نہیں ہے۔

کلام بھی امین کا ہے اور پہنچانے والا بھی امین، امین بھی ایسا کہ کلام کے پہنچانے میں بخیل بھی نہیں بلکہ پہنچانے کا خود اس نے حکم دیا ہے: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" ③ ایک جملہ، ایک بات اور ایک آیت بھی میں کہہ دوں تو دوسروں تک پہنچا دو۔ بخل مت کرو اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو نصائح ارشاد فرمائیں اس میں صاف واضح طور پر فرمایا کہ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ④ جو حاضر ہے وہ غائبین کو میرا پیغام پہنچا دے تو

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۴۔ ② ایضاً، الآیۃ: ۲۵۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ذکر عن بنی اسرائیل، ص: ۵۸۲ رقم: ۳۴۶۱۔

④ الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ فی ایام منیٰ، ص: ۱۳۶ رقم: ۱۷۳۹۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا اہتمام کیا اور ایک ایک روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی...... امت تک پہنچائی۔ تو بہرحال قرآن پاک کی سند کا ایک باطنی درجہ ہے کہ وہ اللہ سے چلی فرشتہ پر آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچی، وہ سند بے عیب اور بے غبار ہے۔

سندِ ظاہری...... اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس طرح پہنچائیں؟ اُمت کو تو آپ نے پہنچایا اور انتہائی امانت، دیانت اور سخاوت کے ساتھ پہنچایا کہ ایک ایک لفظ، زبر، زیر حتیٰ کہ صوت اور آواز تک بھی پہنچادی، پھر صحابہ رضی اللہ عنہ نے اسی اہتمام سے تابعین کو پہنچایا، تابعین نے اسی اہتمام سے تبع تابعین کو پہنچایا، انہوں نے اپنے اتباع کو پہنچایا...... یہاں تک کہ وہ کلام ہم تک پہنچ گیا۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں (روایت کرنے والا طبقہ) تواتر طبقہ ہے، ایک ایک آدمی روایت نہیں کرتا بلکہ ہر زمانے میں لاکھوں لاکھوں آدمی روایت کرتے آرہے ہیں اور محض روایت نہیں بلکہ ان کے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور صرف سینوں میں محفوظ نہیں بلکہ وہ قرآن کے ساتھ حمائل بنے ہوئے ہیں کہ جو ذوق قرآن کا ہے وہ اہل علم نے اپنا ذوق بنالیا ہے۔ تو قرآن کا ذوق بھی پیدا کیا اس لئے کھوٹ کی، غلطی کی، خیانت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سندِ قرآن پر قانوناً بھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا...... تین چار آدمی مل کر اگر کوئی بات کہیں تو ہم قانوناً ان کی بات ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور یہ لاکھوں کروڑوں ہر زمانے میں جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو، وہ تو سینوں میں محفوظ ہے اور حفاظت کا یہ حال ہے کہ اس کی سورتیں گنی ہوئی ہیں، نہ زیادتی ممکن نہ کمی ممکن، علامات اور آیات بھی اس کی گنی ہوئی کہ قرآن میں کتنی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں کے حروف الگ گنے ہوئے ہیں کہ اتنے حروف ہیں، کل آیتوں کے اعراب تک گنے ہوئے ہیں کہ اتنے زبر، اتنے زیر، اتنے پیش، اتنے تشدید اور اتنے جزم۔ اس حفاظت کیساتھ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر کمی بیشی ہو یا کوئی جرأت کرے کہ ایک آدھ لفظ بڑھادے یا اس میں سے گھٹادے، کوئی ایک آدھ ہی ایسا احمق اور بے وقوف ہوگا جو تبدیلی کرے، مگر امت اسے نہیں مانے گی اور اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

جیسے ایک صاحب کاتب تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جو چیز ان سے نقل کروائی جاتی اس میں اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے بڑھاتے ضرور تھے، لوگ سمجھتے تھے کہ فلاں کاتب کو کوئی مسودہ وغیرہ مت دینا، وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کردیتا ہے۔ تو قرآن شریف انہیں لکھنے کو دیا گیا کہ بھئی! اس کی نقل کردو اور یہ کہہ دیا گیا کہ دیکھو یہ اللہ کا کلام ہے اس میں کمی بیشی ممکن نہیں، کوئی لفظ گھٹانا بڑھانا نہیں، اگر تم نے گھٹایا بڑھایا تو تم جہنمی بن جاؤ گے۔ قرآن تو غلط نہیں ہوگا پھر صحیح ہوجائے گا مگر تمہاری عاقبت خراب ہوجائے گی وہ کہنے لگے: صاحب! یہ کلام خداوندی ہے، اس میں کمی بیشی کیسے کرسکتا ہوں، یہ تو لوگوں کے کلام میں...... میں اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا دیتا ہوں۔ خیر انہوں نے لکھا، لکھ کر لائے تو بہت خوش قلم، پوچھا: کہ بھئی! گھٹایا بڑھایا تو نہیں؟ کہا: نہیں بلابالکل نہیں! بھلا خدا کا کلام ہے، اس

میں کیسے کمی زیادتی کرسکتا ہوں، ہاں تھوڑی سی کمی بیشی میں نے کردی ہے وہ یہ کہ قرآن کے اندر کہیں فرعون کا نام کہیں ہامان کا نام اور کہیں قارون کا نام تھا، یہ نام کیسے؟ یہ بڑے بڑے فُسّاق! بھلا قرآن اور اس میں کافروں کا ذکر، ہاں بس میں نے ان کے نام مٹا کے کہیں آپ کا نام، کہیں آپ کے والد ماجد کا نام لکھ دیا اور کہیں آپ کے دادا کا نام۔ بس اتنا تو کیا اور کچھ نہیں کیا۔ تو ایسا کوئی احمق ہو تو کچھ گھٹا بڑھا دے وہ اپنی عاقبت خراب کرتا ہے کوئی مانتا نہیں ہے۔ ہزاروں پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے تحریف کرنا چاہی ہوگی مگر وہ مٹ چکے ہیں ان کا نام ونشان تک نہیں قرآن اسی طرح اپنی جگہ ہے۔

حدیث از روئے قرآن محفوظ ہے...... حدیث کے انکار کرنے والے بہت سے پیدا ہوئے۔ پہلے وضّاعین (احادیث کو وضع کرنے والے) پیدا ہوئے۔ انہوں گھڑ گھڑ کے حدیثیں ملائیں تاکہ اصل حدیث پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ محدّثین کرام کو اللہ جزائے خیر دے! انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا اور ایسے اصول وضع کردیے، ایسے کانٹے ہاتھ میں دے دیئے کہ ممکن نہیں غلط روایت صحیح حدیث میں مل جائے۔ کانٹے سے پہچان سکتے ہیں۔ تو قرآن بھی محفوظ اور حدیث بھی محفوظ۔ اور اللہ نے اس کا وعدہ دے دیا ہے ایک تو یہ فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ہم نے قرآن اتارا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ حدیث بھی محفوظ ہے کیونکہ وحی جب اترتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے جلدی جلدی رٹنا شروع کرتے تاکہ بھول نہ جائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ رہ جائے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ② اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دو! جلدی مت کرو! یہ جو آپ کو خطرہ ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں تو اس کا وعدہ دیا کہ: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ③ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے سینے میں جمع بھی کردیں گے اور پڑھوا بھی دیں گے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں بلکہ آپ سنتے رہیں۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ④ جب ہم (بواسطہ فرشتہ روح الامین) قرآت کیا کریں آپ سنتے رہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کے قلبِ مبارک میں جمع کردیں۔ کوئی غلطی ممکن نہیں اور نہ صرف جمع کردیں گے بلکہ آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے، اُسی طرح سے ادا بھی کرادیں گے۔ تو قرآن ظاہر بات ہے کہ اپنے لفظوں کے لحاظ سے محفوظ ہوگیا، ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ⑤ سے اللہ نے گارنٹی دے دی، جَمْعَهٗ کے لفظ سے یہی مراد ہے کہ جمع بھی کردیں گے۔ تو جمع تو لفظ ہی کئے جاتے ہیں۔ وَقُرْاٰنَهٗ اور پڑھوا بھی دیں گے۔ تو لفظ ہی پڑھے جاتے ہیں معنی پڑھے نہیں جاتے تو لفظوں کے جمع ہونے کی گارنٹی دی اور یہ کہ آپ کی زبان سے ادا بھی کرادیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع بھی کردیں گے۔ اب رہ گئے آگے معانی! کہ اس کا مطلب کیا؟ اس سے مراد کیا؟

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۲۹ سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶. ③ ایضاً، الآیۃ: ۱۷.
④ ایضاً، الآیۃ: ۱۸. ⑤ ایضاً، الآیۃ: ۱۷.

اس کی بھی گارنٹی دی، فرمایا: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کر دینا بھی ہے کہ مراد کیا ہے اور مطلب کیا ہے!۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی، اس کے معانی کی ذمہ داری بھی حق تعالیٰ نے لی تو لاکھ کوئی تحریف معنوی کرے، جاہلانہ تاویلات کرے لیکن وہ چلنے والی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی حفاظت شاملِ حال ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ'' ② آپ نے وعدہ دیا کہ امت کے اندر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، وہ کیا کریں گے؟ وہ علمِ خداوندی اور جو آیت و روایت ان تک پہنچی ہیں ان میں غلو کرنے والوں کے غلو کا پردہ چاک کر دیں گے کہ یہ معنی محبت و عداوت اور غلو کی وجہ سے لیے گئے ہیں، باطل پسندوں اور باطل پرستوں کی جو دروغ باطنیاں ہیں انہیں وہ کھول کر رکھ دیں گے، وہ اغلاط عیاں ہو کر دنیا کے آگے آجائیں گی۔ یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے معانی میں خلط ملط کر دیں۔ لوگ جاہلانہ تاویلات کتنی کریں لیکن پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا، لفظوں اور معانی دونوں میں کوئی تحریف ممکن نہیں، دونوں کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے۔

قرآن علمی معجزہ ہے..... تو قرآن کریم کا ایک وصف تو ثابت ہوا کہ وہ معجزہ ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں لا سکتا، اس کی کوئی مثل نہیں بنا سکتا، وہ جامعیت کوئی پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ جامعیت علم سے متعلق ہے اور بندے کا علم جامع تو کیا ہوگا! پورا علم بھی نہیں: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ③ لوگ اس کے علم کو نہیں لا سکتے مگر وہ جتنا چاہے دے دے اتنا لے لیں گے۔ تو اوّل تو وہ علم عطائی اور پھر وہ بھی قلیل۔ سب سے زیادہ علم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے کہ آپ اعلم الخلائق ہیں، اعلم البشر ہیں دنیا میں علم کے اندر آپ کا کوئی مثل نہیں ہے لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم کے سامنے میرے علم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اتھاہ سمندر کے کنارے پر ایک چڑیا چونچ ڈالے اور اس کو کچھ تری لگ جائے! وہ نسبت ہے میرے علم کو اللہ کے علم سے۔ تو جب علمِ خداوندی کے سامنے اعلم الخلائق کے علم کا یہ حال ہے تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ تو جس کا علم اتنا جامع ہوگا اس کا کلام معجزہ ہی ہوگا دوسرے کا کلام معجزہ نہیں ہو سکتا کہ اس جیسا کلام نہ لا سکے تو پہلی چیز تو یہ ثابت ہوئی کہ وہ معجزہ ہے۔

قرآن دلیل ختمِ نبوت بھی ہے..... دوسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ وہ فطرتاً محفوظ ہے کیونکہ کلام وہی ہے دوسری کتابیں کلام نہیں اور کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹ نہیں سکتا۔ وہ جو (فضاء) کے اوپر حاوی ہے، خلا کے اندر محفوظ ہے۔ تو محفوظ ہونا بھی معجزہ ہے، دنیا کی کسی قوم کے ہاتھ کسی پیغمبر کا کوئی معجزہ موجود نہیں ہے۔ ایک امتِ اسلامیہ ہے جس کے ہاتھ میں معجزہ موجود ہے اور معجزہ نبوت کی دلیل ہوتی ہے، معجزے سے ہی

① پارہ: ۲۹ سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ② السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الشهادات، باب الرجل من اهل الفقه ج: ۱۰ ص: ۲۰۹، مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الاول ج: ۱ ص: ۵۳ رقم: ۲۴۸۔ ③ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵۔

پہچانا جاتا ہے کہ یہ نبی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاند کے دوٹکڑے کر دیئے تو پہچانا گیا کہ آپ پیغمبر ہیں، خلافِ عادت جو کام آپ کے ہاتھ پر ہوا دنیا وہ کام نہیں کر سکتی ۔ ہزاروں معجزات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ظاہر ہوئے۔ تو معجزہ دلیلِ نبوت ہوتی ہے جس سے نبی کو پہچانا جاتا ہے لیکن پچھلے انبیاء علیہم السلام کو جتنے معجزات دیئے گئے اس سے ہزاروں گنا زائد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیئے گئے مگر وہ عملی معجزات تھے اور عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب عامل دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے تو پچھلے انبیاء کرام کو معجزات عملی دیے گئے تھے تو جب وہ دنیا سے پردہ کر کے چلے گئے ان کے معجزات بھی ختم ہو گئے۔ تو نبوت کی دلیل باقی نہ رہی عصاءِ موسیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دلیل تھی، آج نہ عصاءِ موسیٰ موجود ہے نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت، عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، ان کی نبوت کی یہ دلیل تھی آج نہ مسیح علیہ السلام ہیں اور نہ احیاءِ موتیٰ موجود، دلیلِ نبوت موجود نہیں۔ یوسف علیہ السلام نے قمیص بھجوا دیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دو، بینائی واپس آ جائے گی! آج نہ قمیصِ یوسف ہے نہ حضرت بینا ہو سکتے ہیں، گویا وہ معجزہ موجود نہیں جو ان کی نبوت کی دلیل تھی۔ جتنے معجزات تھے وہ سب انبیاء کے ساتھ رخصت ہو گئے کیونکہ وہ عملی تھے اور عامل کے جانے سے عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر علم ہے تو عالم کے دنیا سے اٹھنے سے اس کا علم ختم نہیں ہوتا، ہزاروں علماء چلے گئے مگر ان کا علم محفوظ ہے۔ اپنے علم کے پردے میں آج بھی وہ علماء زندہ موجود ہیں اور ان کے علم کی دلیل موجود ہے کیونکہ ان کا علم کتابوں میں مدوّن ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاں ہزاروں علمی معجزات دیے گئے ان میں سب سے بڑا معجزہ کلامی وعلمی ہے جو قرآن مجید ہے اور اس کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت دی جا سکتی ہے، اس لئے کہ نبوت کی دلیل موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت نہیں دی جا سکتی کیونکہ ہمارے ہاتھ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف نہیں بلایا جا سکتا اس لئے کہ ہمارے سامنے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ سب معجزات ختم ہو چکے، لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ اور نبوت کی دلیل معجزۂ قرآنی ہے، یہ محفوظ ہے اور بحفاظتِ خداوندی محفوظ ہے تو وہ دعوت بھی محفوظ ہے۔ آج اگر دعوت دی جائے گی تو قرآن کی طرف دی جائے گی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی طرف دی جائے گی، اسلامی شریعت کی طرف دی جائے گی کیونکہ اس کی دلیل موجود ہے۔ اگر کوئی شبہ کرے گا! اعتراض پیش کرے گا! تو قرآن نے سب چیزوں کی کفالت دی ہے، دلائل موجود ہیں، ہر شبہ کو رفع کیا ہے، ہر اعتراض کا جواب اس میں موجود ہے، ہر مُفسِدہ کی اصلاح کی ہے، گویا مکمل طور پر شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے ۔

نفاق کے سوا حجت و برہان سے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا ممکن نہیں ...... یہی وجہ ہے کہ یہود ونصاریٰ نے مقابلے کیے، تیغ وسنان سے مقابلے کیے، جنگیں لڑیں، مشرکین کو کھڑا کیا مگر غالب نہیں آئے ۔

مسلمانوں سے نہ صرف تیغ وسنان سے مقابلے کئے بلکہ حجت وبرہان سے بھی مقابلے کئے تو قرآنی حجتوں کے مقابلے میں کوئی حجت نہیں پیش کر سکے، عاجز آ گئے اور اخیر میں پھر نفاق کا طرز اختیار کیا کہ مسلمان بن کر مسلمانوں میں نفاق پھیلاؤ۔ یہ تدبیر ان کی البتہ کارگر ہوئی۔ پھر دو پارٹیاں بن گئیں اور مسلمانوں کی جو وحدت تھی وہ پارہ پارہ ہوگئی۔ تو منافق بن کر مسلمانوں میں نفاق ڈالا جاسکتا ہے لیکن حجت وبرہان اور دلیل کی رُو سے کوئی چاہے کہ اختلاف ڈلوادے...... ممکن ہی نہیں ہے۔ حجت قوی موجود ہے، ہر باطل دلیل رد کی جاسکتی ہے دلیل وبرہان سے۔ مختلف قوموں نے مقابلے کئے مگر عاجز آ گئیں! نہیں چل سکیں۔ تب یہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی بھی حجت وبرہان سے عاجز نہیں ہوگا خواہ دنیا کی اقوام کیوں نہ جمع ہو جائیں۔

آج بھی ایک اور دس کی نسبت ہے بلکہ ایک آتا ہے تو سو کو سبق دیتا ہے، آج تک یہ چیز موجود ہے۔ تو تیغ وسنان سے مقابلہ کیا مگر نفاق کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس امت میں بہت سے منافق ہوں گے جو واقع میں ایمان نہیں رکھتے ہوں گے دعویٰ ایمان کا کریں گے جیسے واقع میں نبوت ناممکن ہے مگر اس امت میں تیس دجال کذاب پیدا ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے تو نفاق سے ممکن ہے پارٹی بنادی جائے مگر حقائق اور حجت وبرہان سے نہیں ہوسکتی، تیغ وسنان سے نہیں ہوسکتی۔ تو قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور دلیلِ نبوت بھی ہے۔ کلام خداوندی بھی ہے جو اٹل اور محفوظ ہے تو اعجازی کلام خود معجزہ اور دلیل نبوت ہے، اس لئے قیامت تک اس کی دعوت جاری رہے گی اور محفوظ بھی ہے کہ حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے بچوں کے ذریعے اور بوڑھوں کے ذریعے حفاظت کرائی، امت میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے کہ بچوں کو تو خیر حفظ کرایا خود بڑھاپے میں بھی حفظ کیا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا حفظِ قرآن کا واقعہ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب پہلا حج کیا تو کراچی کے راستہ سے کیا تھا۔ اس زمانے میں اسٹیمر نہیں تھی، بادبانی جہاز تھے۔ بادبان باندھ دیا گیا تو کشتی چل رہی ہے، ہوا جب مخالف چلی لنگر ڈال دیے، جس سے کشتی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے میں جدہ پہنچتے تھے۔ تو حضرت بھی بادبانی جہاز میں سوار ہوئے اور رمضان شریف آ گیا۔ گویا شعبان میں چلے تھے، کشتی کے اندر رمضان آ گیا اور اتفاق سے کوئی حافظ نہیں! تراویح: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے ہوئی تو حضرت کو بڑی غیرت آئی کہ اڑھائی تین سو آدمی جہاز میں موجود اور تراویح میں قرآن کریم نہ سنایا جائے! ایک بھی حافظ نہیں! بس اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے سورتیں یاد ہیں۔ اسی دن قرآن یاد کرنے بیٹھے، روز ایک سپارہ حفظ کرتے، رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ اس طرح سے محفوظ ہو جانا کہ بوڑھے بوڑھے بھی اس کو یاد کرلیں اور ذہن کے اندر اتر جائے، یہ بھی معجزہ ہے۔ آپ کسی کتاب کو جو لمبی چوڑی کتاب ہو، دلچسپ بھی ہو، کوئی پانچ سو ہزار صفحات کا ناول ہو، بیس دفعہ بھی رٹیں گے تو نہ اس کے الفاظ یاد ہیں نہ اس کے معانی، قصے کہانیاں بھی یاد نہیں رہیں گے۔ روز کا مشاہدہ ہے: قرآن یاد کرتے ہیں تو سینوں میں اترتا جاتا ہے، یہ

بھی معجزہ ہے۔ یہ اس کے اندر طاقت ہے کہ وہ قلوب میں محفوظ ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عینِ فطرت کے مطابق ہے۔ فطری چیزوں کو فطرت خود جذب کرتی ہے۔ تو قرآن کریم جب پہنچتا ہے تو فطرتیں قبول کر لیتی ہیں چاہے شعور بھی نہ ہو تب بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو امت میں بچے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں اربوں پیدا ہوں گے جو حافظ ہوں گے اور واقعۂ ہوئے ہیں اور بعد میں جوان ہو کر بھی حافظ رہے، بوڑھے بوڑھوں نے بھی قرآن یاد کیا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حفظِ قرآن کا واقعہ..... حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو انگریزوں نے ۱۳۶۲ھ میں گرفتار کیا تو جیل میں کوئی اور مشغلہ نہیں تھا قرآن کریم یاد کرنا شروع کر دیا اور تقریباً دو ثلث یا ایک پارہ یاد کیا اور روزانہ سے تراویح میں پڑھا کرتے تھے۔ تو مولانا مرحوم کی عمر ستر پچھتر سال کی تھی اور اس عمر میں یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ جو اس کی طرف متوجہ ہو وہ خود اس کے قلب کے اندر آ جاتا ہے اگر خود بے اعتنائی کرے تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔

قرآن بے اعتنائی سے جاتا رہتا ہے..... حدیث میں قرآن کو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ رسیاں باندھ کے رکھو گے تو چلے گا، ذرا ڈھیل دو گے تو وہ تمہارے پاس سے چلا جائیگا۔ اس لئے کہ غنی کا کلام ہے محتاج تم ہو۔ تمہیں ہزار دفعہ اس کی ضرورت پڑے تو پڑے۔ وہ محتاج نہیں کہ خواہ مخواہ تمہاری طرف آئے۔ اگر ذرا تم نے ڈھیل کی تو تمہارے دل سے نکل جائے گا۔ تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے اس میں خود غناء (بے پرواہی) موجود ہے۔ ہم محنت کریں۔ یہ اس کا فضل ہے کہ وہ ہمارے اندر آ جاتا ہے اور پیوست ہو جاتا ہے، جزوِ نفس بن جاتا ہے اور بے دلی کریں تو بھاگ جاتا ہے۔ تو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی۔ بہرحال اس کے اندر احکام بھی ہیں معانی بھی ہیں معارف بھی ہیں علل بھی ہیں، یہ اسی اعجاز کا ثمرہ ہے کہ امت پوری کی پوری محافظِ قرآن بن گئی۔

کثرتِ تصنیف اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے..... قرآن کا یہ اعجاز بھی ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اتنی تصانیف دنیا کی کسی امت میں نہیں ہوئیں جتنی اس میں ہیں ملکوں میں کتب خانے بھرے پڑے تھے۔ اور ہر کتاب کو دیکھو وہ قرآن کی کسی ایک ایک آیت کی تشریح و تفسیر ہے۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں، مصر کے کتب خانوں کو دیکھو..... سو برس سے مصری حکومت چھاپتے چھاپتے عاجز ہو گئی مگر مصر شہر کی کتابوں کا عشر عشیر بھی ابھی نہیں چھپ سکا۔

تاتار نے جب مسلمانوں پر قبضہ کیا اور بغداد کی خلافت کو تہ و بالا کیا ہے تو مسلمانوں نے پل توڑ دیا تھا تا کہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے تو صرف ایک کتب خانہ جو دریا کے قریب تھا۔ تاتاریوں نے اس پر قبضہ کیا اور اس کی کتابیں دریا میں ڈال کر اُس پار تک اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ تین گاڑی برابر گذاری جا سکتی تھیں اور پھر روشنائی جو گھلی ہے تو ایک مہینہ تک دجلہ کا پانی ' سیاہ چلتا رہا۔ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء کو دوات میں روشنائی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی دجلہ کا پانی دوات میں بھرتے تھے اور اس سے قلم چلتا تھا، اتنی سیاہی پھیل گئی تھی۔ یہ ایک کتب خانے کا

حال ہے کہ جس سے تاتاریوں نے پل بنادیا اور ایسے ہزاروں کتب خانے بغداد میں موجود تھے۔

اندلس کے اتنے کتب خانے تھے کہ جب مسلمانوں کا قبضہ اٹھا اور پھر عیسائیوں نے قبضہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے لٹریچر کو تباہ کرو، جب تک یہ لٹریچر باقی ہے ان میں روح ایمان باقی رہے گی تو عیسائی حکومت نے مستقلاً ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے کتب خانے تباہ کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک مستقل عملہ بنایا گیا جو سارے کتب خانوں کو آگ لگادے، جلادے اور تلف کردے۔ اس کا ایک انچارج آفیسر مقرر کیا تو لکھتے ہیں پچاس برس میں اندلس کے کتب خانے کہیں مٹ سکے ہیں۔ حکومت نے زور لگا کے پورے پچاس برس میں جاکے اندلس کے کتب خانوں کو ختم کیا ہے۔

یہ صرف قرآن کے طفیل تھا۔ ہر ایک کتاب کسی آیت کی شرح تھی، ہر کتاب کسی آیت کی تفسیر تھی تو کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اس کی تصنیف کو دیکھ کر دنیا کی امتیں آج مصنف بنی ہیں ورنہ اگر وہ اپنی ذات سے مصنف تھیں تو تورات اور انجیل کے شباب کے زمانے میں کتنی کتابیں تصنیف ہوئیں، زبور کے شباب کے زمانے میں کتنے کتب خانے بھرے گئے، کوئی نشان نہیں۔ یہ قرآن ہی کے زمانے میں کیوں مصنف بنے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہی طفیل ہے کہ مسلمانوں کے مواعظ، ان کی تقریریں، ان کی شعلہ بیانی غیر شعوری طور پر اقوام عالم میں اثر کرتی رہی اور ان میں اتنی طاقت پیدا کی۔ اس لئے آج وہ مصنف بنے اور تصنیفیں کیں اور امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کے مصنف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کو کتب خانوں سے بھردیا۔

قرآن کو چھوڑنے کا نتیجہ اعجازی قوت سے محرومی ...... تو قرآن کریم کلامی معجزہ ہے اس کے اعجازی اثرات ظاہر ہور ہے ہیں اور یہ صرف معجزہ نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی بہت سے معجزات اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ آج امت کے اندر اس تیرہ سو برس میں بہت سے اکابر پیدا ہوئے، ہر طبقے میں اہل علم پیدا ہوئے، صوفیاء میں دیکھو تو جنید وشبلی اور سری سقطی رحمہم اللہ وغیرہ ہزار ہا اہل تصوف گزرے ہیں، محدثین میں دیکھو تو امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ اور اسی طرح سے کتنے محدث گذرے ہیں، فقہاء میں دیکھو تو امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کتنے آئمہ گذرے، متکلمین میں دیکھو تو کتنے آئمہ گذرے ہیں، ہر فن کے اندر اہل علم اور اہل کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعے سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے، وہ علوم لاکے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آگئیں۔ یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ جس نے لوگوں کے اندر اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہوجائیں گے، امت کی طاقت ختم ہوجائے گی...... اسی کی طرف لوٹیں گے تبھی جاکر امت کی شوکت بازیاب ہوگی۔ تو قرآن کریم محفوظ اور معصوم ہے اور حق تعالیٰ نے اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی صورتیں ...... جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہوگیا، اس نے الفاظ کو محفوظ کیا، ہر دور میں لاکھوں حافظ تھے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے، علماء کا طبقہ کھڑا ہوگیا۔ اس کے معانی کو

محفوظ کیا اور کتابیں لکھیں۔ کتابوں سے لاکھوں کتب خانے بھر دیے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے صوفیاءِ کرام کا طبقہ کھڑا ہوگیا، انہوں نے وہ وہ حقائق اور معارف بیان کئے کہ دنیا ان کے معارف کو دیکھ کر حیران ہوگئی گویا ایک مستقل طبقے نے اس کے معارف کی حفاظت کی، قرآن کریم کے رسم الخط کے لئے بھی ایک مستقل طبقہ علماءِ رسم الخط کھڑا ہوگیا کہ ایک ہی طریقے سے قرآن لکھا جائے دوسرے طریقے سے نہیں۔

مثلاً رحمٰن کا لفظ ہے رحمٰن کا لفظ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ میم کے ساتھ الف ملاؤ اور نون الگ لکھو جیسے ''رحمان''، لیکن قرآنی رسم الخط یہ ہے کہ میم کے ساتھ نون ملا کے میم کے اوپر کھڑا زبر لکھے جیسے ''رحمٰن''۔ تو اس کے خلاف لکھنا جائز نہیں، وہی لکھنا پڑے گا۔ تو علماء رسم الخط کھڑے ہوگئے جنہوں نے قرآنی رسم الخط کی حفاظت کی۔

اب اس کی طرزِ ادا کا مسئلہ تھا تو قراء اور مجوّدین کو اللہ نے کھڑا کر دیا کہ اسی لب و لہجے کو یعنی جس انداز سے عرب پڑھتے ہیں وہی انداز اختیار کرو۔ تو انہوں نے تصحیح مخارج، اداءِ کلمات حتیٰ کہ صوت (آواز) تک محفوظ کرنے کی کوشش کی کہ عجمی انداز سے قرآن کو نہ پڑھا جائے، مزامیر کے انداز سے نہ پڑھا جائے بلکہ اسی انداز سے پڑھا جائے جس انداز سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پڑھا، تابعین نے پڑھا اور آج تک پڑھا جاتا آرہا ہے: ''اِقْرَؤُوا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ'' ① کہ قرآن کو عرب لہجے میں پڑھو، فرمایا گیا نیز فرمایا گیا کہ: ''حسنوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا'' ② خوش آمیزی اور درد آمیز آواز سے قرآن کو پڑھو اس سے قرآن کا حُسن بڑھتا ہے۔

قرآن سے غیر مسلم بھی متاثر ہوتے ہیں...... واقعی یہ بات ہے کہ اگر صحیح انداز پر صحیح درد دل سے پڑھنے والا ہو، کفار تک متاثر ہوتے ہیں، جو سمجھتے تک نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں! اس انقلاب سے پہلے انڈیا میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی جو ہر مرحوم اس کے صدر تھے تو مولانا محمد علی (مرحوم) فطرتاً جری انسان تھے اور ان میں بہادری کی ایک شان تھی، لاکھ دو لاکھ آدمی کا مجمع تھا تو مولانا نے کھڑے ہو کر کہا کہ جلسہ کی ابتداء قرآن شریف سے ہوگی۔ تو لوگوں نے کہا صاحب! سیاسی جلسہ ہے وہ بھی کانگریس کا! ہندو مسلم سب جمع ہیں، یہاں قرآن کا کیا کام! اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پنڈت کہیں گے کہ ہم بھی آسوب پڑھیں گے، پادری صاحب کہیں گے کہ میں بھی انجیل پڑھوں گا، یہودی کوئی کھڑا ہوگا تو کہے گا میں بھی تورات پڑھوں گا۔ فرمانے لگے سب کو اجازت دوں گا کہ سب پڑھیں مگر شروعات آیتِ قرآن کریم سے ہوگی۔ وہ سب چپکے ہوگئے۔ قاری ابراہیم رشید عرب تھے مولانا نے انہیں آواز دی، انہیں بلایا، حیدر آباد میں جو جامع مسجد ہے جس کا نام مکہ مسجد ہے اس کے وہ خطیب تھے۔ تو اوّل تو عرب پھر بڑے جہری الصوت، بڑے خوش آواز، عربی انداز سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔

---

① شعب الايمان، فصل فى ترك التعمق فى القرآن، التاسع عشر من شعب الايمان ج:٦ ص:١٧٥. ② شعب الايمان للبيهقي، التاسع عشر من شعب الايمان، فصل فى تحسين الصوت بالقرائة ج:٥ ص:١٥٧ رقم:٢٠٧٤.

مولانا مرحوم نے فرمایا: کہ آپ پڑھو! قاری ابراہیم صاحب نے سورۃ الصف کے دونوں رکوع کوئی آدھ گھنٹہ سے زیادہ میں تلاوت کیے۔ وہ تلاوت کر رہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگوں کے سروں کے اوپر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان میں حس و حرکت ہی نہیں۔ بہت سے غیر مسلم ہندوؤں کی بھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کچھ نہیں سمجھتے تھے مگر آنسو جاری تھے۔ تو قرآن کریم صحیح طور پر کوئی پڑھنے والا ہو، مجوِّد ہو، اچھی تجوید سے پڑھے تو کفار تک متاثر ہوتے ہیں، مؤمن کا تو کہنا ہی کیا ہے! تو قرآن کی طرزِ اداء کے لئے بھی مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس کا نام مجودین اور قراء ہے، وہ اسی انداز سے آج تک چل رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمیں حضرت قاری سراج احمد صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اللہ نے ان کے ذریعے دار العلوم الاسلامیہ کو قائم کیا جہاں سینکڑوں قاری پیدا ہوئے۔ اس مدرسہ کے قائم ہونے سے پہلے پنجاب بہت دفعہ میری حاضری ہوئی تو امام (مسجدوں) میں کچھ صحیح نہیں تھے، بس پنجابی انداز میں قرآن کریم پڑھتے تھے وہی لب ولہجہ تھا تو اس میں وہ لطف نہیں ہوتا تھا لیکن اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد دیکھا جگہ جگہ مدارس میں بہترین قاری پیدا ہونے لگے ہیں اور ہر جگہ عمدہ قرآت موجود ہے، گویا ایک فیض عام ہو گیا۔

اور قاری عبد المالک صاحب کا بالآخر فیضانِ عام ہوا، ہندوستان میں بھی ان کا فیضان عام تھا اور یہاں آکر بھی ان کا فیضان عام ہوا، آج پاکستان میں سینکڑوں قراء موجود ہیں بلکہ قرأت کے مقابلے ہونے لگے ہیں کہ کون زیادہ اعلیٰ درجے کا پڑھتا ہے اور بین الاقوامی مقابلوں میں بھی یہاں کے قراء جانے لگے اور یہاں سے باہر جا کر وہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوئے۔ یہ انہی مدارس کا طفیل ہے تو ہمیں حضرت قاری صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک مینار قائم کیا کہ آج سینکڑوں قاری اور مجود پیدا ہو گئے اور آپ نے یہ جو پچاس ساٹھ آدمیوں میں سندیں تقسیم کیں یہ قاری ہو کر نکلے تو ایک ایک آدمی اگر دس دس کو بھی تیار کرے تو پانچ سو ہزار آدمی تو انہی سے تیار ہو جائیں گے۔ دِیا یوں ہی جلتا رہے گا۔ تو قرآن کا فیضان الفاظ کا الگ ہے، لب ولہجے کا الگ ہے، معانی کا الگ ہے، حقائق کا الگ ہے، تفسیرات کا الگ ہے، حکمتوں کا الگ ہے اور ہر پہلو کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک طبقہ کھڑا کر دیا۔ اسی کو فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① کہ ہم نے ہی قرآن اتارا ہے ہم ہی اسکی حفاظت کرینگے تو انہوں نے جو قرآن اتارا ہے تو فقط مضمون نہیں اتارا الفاظ بھی اتارے ہیں اور لفظ ہی نہیں بلکہ آواز بھی اُتاری ہے۔

خلفائے خداوندی محافظین قرآن کے القابات...... حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ایسی آواز سنتا ہوں کہ كَاَنَّهَا صَلْصَلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ ②

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ج: ۱ ص: ۱ رقم: ۲.

جیسے چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچو تو اس سے ایک جھنجھناہٹ اور گونج کی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس قسم کی آواز سنتا ہوں۔ اس سے پھر الفاظ بنتے ہیں اس سے پھر معانی القاء ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن میں صوت کا بھی دخل ہے، فقط لفظ ہی نہیں کہ قلب کے اوپر آ گئے بلکہ سنائے گئے اور جب سنائے جائیں گے تو بہر حال لب ولہجہ بھی ہوگا، اس لب ولہجے کی حفاظت کے لئے اللہ نے مستقل طبقہ کھڑا کر دیا، وہ مجودین کا طبقہ ہے تو حقیقت میں یہ خلفائے خداوندی ہیں۔

اصل پڑھنے والے حق تعالیٰ ہیں تلاوت کرنے والے وہ ہیں، حافظِ قرآن وہ ہیں۔ قرآن میں خود فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ہم نے اتارا ہم ہی حافظ ہیں تو اپنے کو حافظ کہا۔ نیز فرمایا: ﴿نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ﴾ ② اے پیغمبر! ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا اصل میں تلاوت کنندہ حق تعالیٰ ہیں اور فرمایا ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ اے پیغمبر! جب ہم قرأت کریں تو سنتے رہا کریں۔ معلوم ہوا کہ قاری بھی حق تعالیٰ ہیں تو قاری بھی وہ، تلاوت کنندہ بھی وہ، حافظ بھی وہ۔ یہ اس کا فضل ہے کہ جو حفظ کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ آج سے جو لقب ہمارا تھا تمہارا بھی ہے، کوئی قرأت سیکھ لیتا ہے تو فرماتے ہیں کہ قاری تو ہم ہیں لیکن آج سے ہم نے اپنا لقب تجھے دے دیا، اسی طرح تلاوت کرنے والے ہم ہیں مگر جب تم تلاوت کر رہے ہو تو تم بھی یہ لقب استعمال کر سکتے ہو۔

اہلِ جنت کے خدائی القابات ...... تو سرکاری القاب آپ کو دے دیئے، خود وہ حافظ تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حافظ کہا، خود تالی تھے آپ کو بھی تالی کہا، خود قاری تھے آپ کو بھی قاری کہا، یہ اس کا فضل ہے کہ اپنے القاب بندے کو عطا کر دیے ورنہ بندوں کے الفاظ ممتاز ہوتے ہیں، مثلاً پریذیڈنٹ یا صدرِ جمہوریہ یا وزیراعظم کا اگر کوئی دعویٰ کرنے لگے کہ میں وزیراعظم ہوں مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ تو کدھر سے وزیراعظم ہے! تجھے قانون کی رو سے لفظ بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہیں، کوئی کہے کہ میں صدرِ جمہوریہ ہوں تو مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ صدرِ جمہوریہ ایک ہی تو ہے تو کدھر سے ہو گیا! تو سرکاری القاب کوئی اختیار نہیں کر سکتا جب تک سرکار ہی لقب یا خطاب نہ دے دے۔ پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ لقب تو اپنے سرکاری ہیں اور تمہیں دے دیے گئے کہ جب تم اس مقام پر پہنچو تو تم بھی حافظ، تم بھی قاری، تم تالی، تم سب کو وہ لقب دیں گے یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے، جنتوں میں پہنچ کر ہر جنتی کو القاب دیئے جائیں گے جو اللہ ہی کے نام سے ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنت والوں کو نشاط میں لانے کے لئے حق تعالیٰ خط وکتابت کریں گے ملائکہ خطوط لے کر آئیں گے، جس میں مزاج پرسی حالات کا پوچھنا اور حالات کا بتلانا بھی ہوگا۔ اگر کسی کے پاس وزیراعظم کا خط پہنچ جائے تو اپنی پوزیشن بڑھانے کے لئے اخبارات میں چھاپے گا کہ میرے نام وزیراعظم کا خط آیا ہے، پریذیڈنٹ کا خط آئے تو اخبارات میں چھاپ دے گا تاکہ میری عزت دوبالا ہو کہ پریذیڈنٹ نے مجھے خط لکھا ہے

---

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

اگر قدیم زمانے کے شاہی فرامین کسی کے گھر میں ہوں تو وہ آج تک فخراً کہتا پھرتا ہے کہ میرے خاندان میں شاہی فرمان چلا آرہا ہے، ان کا خط موجود ہے، تو بادشاہوں کے یہ خطوط آئیں تو فخر کا یہ عالم ہے اور اللہ میاں کا خط آئے تو فخر ومباہات کی کیا انتہا ہوگی، اور اس نشاط کی کیا انتہا ہوگی جو اہلِ جنت محسوس کریں گے تو حق تعالیٰ خطوط بھیجیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام چٹھی رساں (ڈاکیے) کے طور پر خطوط لے کر آئیں گے۔ ان خطوط کے لفافے کے الفاظ کیا لکھے ہوں گے؟ لکھا ہوا ہوگا کہ: مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے۔ تو عزیز رحیم اللہ کا لقب ہے اور اہل جنت کو دے دیں گے مگر یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے والے کو دنیا میں ہی وہ لقب دیدیں گے جو اُن کا اپنا لقب ہے کہ ہم حافظ تو تم بھی حافظ، ہم قاری تو تم بھی قاری، ہم تالی (تلاوت کنندہ) تو تم بھی تالی۔ تو حقیقت میں مجودین خلفائے خداوندی ہیں، ان کو خلافت عطا کی گئی ہے، کسی کو علم کی خلافت ملی، کسی کو اخلاق کی خلافت ملی، انہیں کلام خداوندی کی خلافت ملی کہ اللہ متکلم ہیں تو یہ بھی متکلم تو اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے۔

حافظوں کا عنداللہ مقام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ جو شخص اپنے بچے کو قرآن حفظ کرائے گا تو قیامت کے اولین وآخرین کے مجمع میں اس کے باپ کو تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے سارا عالمِ محشر منور ہو جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن یاد کرایا اور کلامِ خداوندی کو اس کے سینے میں ڈالا، گویا اس کی تاج پوشی ہوگی۔ ①

دنیا میں کسی بادشاہ کی تاج پوشی ہوتی ہے تو اہل شہر جمع ہو جاتے ہیں، معززین شہر اکٹھے ہو جاتے ہیں بہت سے بہت...... صوبے کے افراد جمع ہو جاتے ہیں اور بہت ہوئے تو ملک کے افراد اور اگر بہت ہی بڑا بادشاہ ہے تو بین الاقوامی طور پر وہ دعوت دے گا کہ تاج پوشی کا اعزاز ہے آپ سب آجائیں۔

تو دوسرے ممالک کے سربراہ بھی شریک ہوں گے، بڑا جلسہ ہوگا لیکن ایک ہی زمانے میں ہوگا اور قیامت میں وہاں اولین وآخرین، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد...... اتنا بڑا جلسہ ہوگا کہ دنیا میں تو ممکن ہی نہیں تو ساری اولادِ آدم ہوگی اور تاج پہنانے والے حق تعالیٰ ہیں جو اس باپ کو تاج پہنائیں گے جس نے اپنے بچے کو حفظ کرایا تھا جس کی روشنی سے پورا عالمِ محشر منور ہوگا گویا بتلایا جائے گا کہ اس نے دنیا میں قرآن کریم کی روشنی پھیلائی تو اب تاج بھی وہ دیا جارہا ہے جس کی روشنی پورے عالمِ محشر میں پھیلے گی۔ تو دنیا میں یہ خلفائے خداوندی ہیں اور آخرت میں یہ تاج پوش بادشاہ بنیں گے۔ جس کو حفظ کرادیا اس سے زیادہ اس کی فضیلت اور اس کی بڑائی اور کیا ہوسکتی ہے!۔

اور حفظ کرنے والے جب کہ ان کی ادا بھی صحیح ہو اور اسی لب ولہجے سے ہو جو عربوں کا لب ولہجہ ہے پڑھیں تو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ثواب تلاوۃ القرآن، ج:۴ ص:۲۴۶ رقم: ۱۲۴۱۔

اس سے قرآن کریم کا اور زیادہ حسن بڑھ جاتا ہے: فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَةَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا ① تو بہر حال ہمارے قاری صاحب، قاری صاحب نے جن مجودین کو رکھا وہ مجودین، اس کی اعانت کرنے والے، تمام معاونین اور انتظام کرنے والے سارے منتظمین ...... یہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنتوں کا نچوڑ آج ان کے سامنے آیا ہے۔ جن بچوں پر ان حضرات نے محنت کی آج وہ قابل بن کر اور مجود بن کر آپ کے سامنے آئے اب وہ تجوید قرآن کو دنیا میں پھیلائیں گے تو نور پھیلے گا اور روشنی پھیلے گی، یہی ذریعۂ ہدایت بنے گی۔

دین و دنیا کی ترقی کا داعی قرآن کریم ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے: لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا اس امت کے اوّل طبقے کی اصلاح جس چیز سے ہوئی تھی، اسی سے اس امت کے آخری طبقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے، اور وہ ہے قرآن۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے کتب خانے میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں تھی، اسی نے ان کی اصلاح کی، اسی سے وہ اونچے بھی ہوئے اور بالا بھی۔ آج بھی مسلمان اگر بالا ہونا چاہتے ہیں تو اسی کو پکڑیں! اس کے پکڑنے کو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ''مُلّاں'' بن جائیں گے، ترقی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ یہ محض ایک مہمل خیال ہے۔ ترقی کا داعی تو قرآن کریم ہی ہے۔ اس نے دین اور دنیا دونوں سکھلائے، اس نے علم وکمال کے ساتھ شوکت دینا، حکومتیں قائم کرنا، نظامِ مملکت چلانا بھی سکھایا، قوت عسکری بھی قائم کی، جا بجا احکام ہیں کہ مسلمان عسکری قوت پیدا کریں، مسلمان سپاہی بنیں، مسلمان عالم بنیں اور علم اور معرفت کیساتھ سپاہیانہ زندگی، سیاسی زندگی، شوکت کی زندگی، اقتدار کی زندگی بھی سکھلائی تو یہ غلط خیال ہے کہ قرآن کریم سیکھیں گے تو ترقی سے رہ جائیں گے۔ اصل ترقی تو یہی ہے۔ نیز دیکھا جائے تو اصل حکومت اللہ کی ہے۔ اس لئے اصل حکومت قرآن کی ہے۔ یہ قانون فطری ہے، اس کی حکومت ہوگی تو فطرت کے مطابق ہوگی۔ اس کے خلاف ہوگی تو وہ غیر فطری ہوگی اور اس میں نقصانات، فسادات اور ہنگامے پیدا ہوں گے۔ اس لئے جتنا اس کی حکومت کو رائج کیا جائے ...... رائج کرنے والے بھی خدا کے ہاں محترم بنیں گے، جو اس قانون کو لائیں گے ان کی عظمت بھی اس دنیا میں بڑھ جائے گی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے تو قرآن کریم تنزل نہیں سکھلاتا، پستی نہیں سکھلاتا بلکہ ترفّع سکھاتا ہے اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔

جب تک یہ (قرآنی) ہوا قلوب میں بھری رہی مسلمان بلند و بالا رہے۔ جب یہ نکل گئی مسلمان پست ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی مثال ہے جیسے گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو اگر آپ اسے زمین پر دے کر ماریں تو دس گنا اوپر کو اچھلے گی، اوپر کو جائے گی، نیچے نہیں رہے گی، اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے، وہ نیچے نہیں ٹکنے دے گی اور اگر سوئی گھسا کے ہوا نکال دو تو جہاں ڈال دو گے پھس سے پڑی رہ جائے گی، پھر اس میں اٹھنے کی سکت نہیں۔

① شعب الایمان للبیهقی، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی تحسین الصوت بالقرآن ج:۵ ص:۱۵۷ رقم:۲۰۷۴.

تو قرآن کریم نے جو ہوا اور شوکت بھری تھی جب تک بھری رہی...... اقوام نے انکو دبانا چاہا، زمین پر پٹخنا چاہا، جتنا پٹختے گئے، مسلمان اتنا ہی اوپر کو اُٹھے۔ نہ صرف خود اٹھے بلکہ دنیا کو بلند کر دیا۔ لیکن جب ہوا نکال دی، کسی نے سوئی مار دی وہیں پھس سے ہو کے رہ گئے۔ تو مسلمان دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور اصلاح جبھی کرے گا جب اصلاحیت ان کے اندر رچی ہوئی ہو۔ یہ بھک بھکا بن کر نہیں آیا کہ دنیا کی اقوام سے بھیک مانگے کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو، معاشرت اور رہن سہن کی بھیک دے دو۔ یہ تو دنیا کو سچا رہن سہن سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ تو مسلمان سائل نہیں بلکہ مُعطی ہے۔ اگر یہ دنیا سے تمدن و معاشرت کی بھیک مانگے تو یہ اپنی توہین کرتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس معاشرت کو جو فطری ہے اور اس سیاست کو جو فطری ہے دنیا کے اوپر لاگو کرے، دنیا کو اس کی طرف لائے رکھے۔ مسلمان یوں کہیں کہ ہم اسلام کو چلانا چاہتے ہیں اور اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت کو چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ مبارک باد کے بھی مستحق ہیں اور سب کا فرض ہے کہ ان کا احترام کریں، اس لئے کہ اصل احترام اللہ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، اس سے جو تمسّک کرے گا (اس کا ساتھ لے گا) وہ بھی قابلِ احترام بن جائے گا۔

اختتام......! بہر حال اس مدرسہ نے بحمد اللہ اس بیس پچیس سال کے اندر جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ثمرہ ہے کہ آج اتنے لوگ جمع ہیں اور قرآن کریم کے پروانے بنے ہوئے ہیں اور اس کے نمونے سامنے آرہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ بانی کو بھی اور منتظمین کو بھی اور معاونین کو بھی جزائے خیر نصیب فرمائے! تو میں ان بچوں کے لئے مبارک باد پیش کرنے بیٹھا تھا...... یہ میرے اور آپ کے بچے ہیں۔ ان الفاظ سے میری مبارکباد پیش ہے۔ حق تعالیٰ اس مدرسہ کو قائم و دائم رکھے اور پاکستان نیز باہر کے لوگوں کو اس سے متوّر فرمائے آمین! ان الفاظ پر میں ختم کرتا ہوں۔

ایک درخواست آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں، اُمید ہے کہ قبول کی جائے گی بیان ہوا...... بہر حال آپ نے توجہ سے سنا اور میں معمولی طالب علم کہہ ہی کیا سکتا تھا! جو طالب علمانہ باتیں آئیں آپ نے بہر حال سنیں اب اخیر میں درخواست یہ ہے کہ اس عرض معروض سے بہر حال آپ کے اور ہمارے قلوب مل گئے ہیں، ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں، قلوب مل گئے ہیں اس لئے مصافحہ کی تکلیف نہ فرمادیں۔ میں اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا تحمل نہیں کر پاتا، اس لئے کہ آپ ایک ایک دفعہ ہاتھ ملائیں گے تو مجھے بیس ہزار دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا۔ میرے اندر اتنی طاقت نہیں، اس واسطے مصافحے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں، بس دعائے خیر سے یاد رکھیں، یہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اب جلسہ کی بقیہ کاروائی ان شاء اللہ پوری ہوگی۔

”وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ“

جُہلائے عرب سے مقامِ صحابیت تک

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا، یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا، وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ o﴾صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

مقصد بعثتِ انبیاء علیہم السلام ...... بزرگانِ محترم! دنیا کی اقوام جب مشکلات اور پریشانی میں مبتلا ہوتی ہیں اور ایسی مصیبتیں انہیں گھیر لیتی ہیں، کہ نہ جانے کا راستہ باقی رہتا ہے نہ ٹھہرنے کا، دلوں میں بھی امن باقی نہیں رہتا اور دلوں کا سکھ اور چین اٹھ جاتا ہے رات دن پریشانی اور آفات کا سامنا رہتا ہے، اس سے عیش میں بھی خلل اور زندگی کے اندر سکون بھی ندارد...... جب ایسے حالات میں اقوام مبتلا ہوئی ہیں، تبھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے، انہوں نے آکر اقوام کو مشکلات سے نجات دلائی۔ دنیا میں انبیاءؑ کا آنا محض اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھوا دیں، یا سفرِ حج پڑھا دیں یا اور عبادات ادا کروا دیں، یہ مقصودِ اصلی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیوی مشکلات اور مصائب کا خاتمہ کرنا، انسانوں میں امن وسکون پیدا کرنا، حقوق کی ادائیگی کرانا...... یہ سب انبیاء علیہم السلام کے فرائض میں سے ہے، جہاں وہ آخرت کی مشکلات سے نجات دلاتے ہیں وہیں دنیا کی مشکلات سے بھی نجات دلاتے ہیں اور اقوام نجات پاتی ہیں، جو ان کے نقشِ قدم پر چل پڑا اس نے نجات پالی، جو نہ چلا وہ مشکلات میں گھر گیا اس نے دنیا وآخرت دونوں کھودی۔

بنی اسرائیل کی ذلت ...... بہر حال انبیاء علیہم السلام کا آنا دنیا اور آخرت دونوں کیلئے ہوتا ہے، فقط آخرت کیلئے نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل جب فرعون کی ڈالی ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی اور اس

① پارہ:۱۸، سورۃ النور، الآیۃ:۵۵.

درجہ اس نے بنی اسرائیل کو پریشان کر دیا کہ بالکل اچھوت بنا کے چھوڑا، نہ دنیوی عزت رہی نہ دینی، ذلیل ذلیل خدمات پر انکو مامور کیا جاتا تھا۔ وہ قوم جو انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھی وہ پس ماندہ قوم بن گئی جن کے بارے میں فرمایا گیا تھا: ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① دنیا جہانوں پر ہم نے ان کو برگزیدہ بنایا، وہ قوم اس درجہ مبتلائے مشکلات اور پریشان حال ہوئی کہ نہ اس کا دنیوی چین باقی رہا نہ آخرت اسکے سامنے رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو خدا کے راستہ پر ڈالا اور ہدایت کی، پھر ایک وقت آیا کہ فرعون کے مصائب سے نجات ہوئی، فرعون خود غرق ہوا، بنی اسرائیل برسراقتدار آئے اور دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی۔

پھر بنی اسرائیل پر ایک دور آیا جس میں یہ قوم پھر مبتلائے مصائب ہوئی۔ یہ حضرت دانیال علیہ السلام کا زمانہ تھا انہوں نے نصیحت کی، راہ حق بتلائی اور فرمایا اگر تم راہ حق پر نہیں چلو گے پھر مشکلات میں مبتلا ہو گے، انجام بخیر نہیں ہوگا۔ قوم نے تسلیم نہیں کیا، رات دن کا عیش وتعیش اور رات دن کی عیاشی میں مبتلا رہے۔ دانیال علیہ السلام نے نصیحت کی، راہ حق دکھلائی، قوم نے نہیں مانا تو بخت نصر ان پر مسلط ہوا اور اس نے پوری قوم کو تاخت وتاراج کیا، پوری قوم کو تباہ وبرباد کیا، ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل قتل ہوئے اور ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل کو مشکیں باندھ کر غلام بنا کر لے گیا، بیت المقدس کو بھی تباہ وبرباد کیا۔ اس طرح ایک بڑی عظیم الشان قوم اپنی بدعملی کی وجہ سے دنیا ہی میں تباہ وبرباد ہو گئی، آخرت کی خبر تو خدا جانے، بخت نصر گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام بھی گرفتار ہوئے، جب قوم کی مشکیں کسی گئیں تو حضرت دانیال علیہ السلام جو پیغمبر تھے انکی بھی مشکیں کسی گئیں ان کو بھی قید کیا گیا۔ دانیال علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا...... تم بھی مبتلا ہوئے مجھے بھی مبتلا کیا۔ قوم نے اس وقت ندامت کا اظہار کیا اور کہا کہ بے شک ہم سے غلطی ہوئی، اب آپ ہمارے لئے دعا فرمادیں! انبیاء علیہم السلام کی شفقت تو بے پایاں ہوتی ہے باوجودیکہ قوم کی وجہ سے وہ خود بھی مشکلات میں مبتلا ہوئے مگر پھر بھی تسلی دی اور فرمایا کہ تم اللہ کے راستہ پر آجاؤ تمہیں نجات مل جائے گی۔

بالآخر قوم جیل خانوں میں ڈالدی گئی بخت نصر کا یہ واقعہ لانبا ہے وہ مجھے سنانا نہیں ہے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ دانیال علیہ السلام بھی جیل خانے میں ڈالے گئے؛ اگرچہ ان کی بزرگی، تقدس اور خدا ترسی کو دیکھ کر جیل کے حکام بھی متاثر ہوئے، جیلر بھی معتقد ہو گئے، ہزاروں قیدیوں کی جیل کے اندر اصلاح ہو گئی۔ بالآخر چند سال گزرنے کے بعد وقت آیا کہ بنی اسرائیل کا اقتدار پھر لوٹا، بیت المقدس میں بھی دوبارہ ان کی حکومت قائم ہوئی، پھر وہ دوبارہ برگزیدہ قوم بن گئی۔ غرض ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصائب ومشکلات سے چھڑوایا، دوسری دفعہ حضرت دانیال علیہ السلام نے چھڑوایا اور مصائب ومشکلات سے نجات دلائی۔

دور جاہلیت کا اجمالی خاکہ...... یہی صورت آخر میں آکر عرب کے لوگوں کی ہوئی۔ اسلام سے قبل ہر قسم کی

---

① پارہ: ۲۵، سورة الجاثية، الآية: ۱۶۔

مصیبتوں میں یہ قوم مبتلا تھی۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز کو جانتے تھے، مگر خدا کو نہ جانتے تھے، ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، مگر خدا کی عبادت سے محروم تھے، خانہ کعبہ کے اردگرد مطاف میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے، طواف کرتے جاتے تھے اور تین سو ساٹھ بُتوں کی پوجا کرتے جاتے تھے۔ دو بڑے بڑے بُت خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے تھے اندر جاتے تھے تو ان دو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ مسجد بیت الحرام سے باہر نکلتے تھے تو ہر شخص کے گھر میں ایک ایک بُت رکھا ہوا تھا، اسکی پوجا کرتے تھے، گھر سے سفر میں جاتے تھے تو بت کو جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے کہ ممکن ہے خدا راستے میں نہ ملے پوجا کس کی کریں گے تو اسے جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے، وہاں اس کی پوجا کرتے اور اگر کسی جگہ بیٹھ گئے اور کوئی زیادہ خوشنما پتھر نظر آ گیا تو پہلے کو جیب میں سے پھینک دیا اور دوسرے کو سامنے رکھ کر اسکی عبادت شروع کر دی۔ غرض ہر خاندان کے ہر فرد کا خدا اجُدا اجُدا تھا اور سفر کا الگ، حضر کا الگ تھا، پوجنے والے تعداد میں اتنے نہ تھے جتنی خداؤں کی تعداد تھی، پوجنے والے تو چند لاکھ تھے جبکہ خدا کروڑوں بنا رکھے تھے۔ ان کی یہ حالت تو جہالت کی تھی، بداخلاقی کا یہ عالم تھا کہ زنا کاری، ڈکیتی رات دن کا مشغلہ تھا۔ مختلف قسم کے نکاح تجویز کر رکھے تھے، ہوسناکی کے بہت سے طریقے تجویز کر رکھے تھے، نام ان کا نکاح تھا۔ اگر کسی عورت کا خاوند بدصورت ہوتا تو قانوناً اسے اجازت تھی کہ وہ کسی حسین وجمیل مرد کے پاس چلی جائے۔ اگر اس سے اولاد ہوگئی تو اُسی کالے بدصورت ہی کی اولاد ہوگی کسی دوسرے کی اولاد نہیں ہوگی، ایک عورت بے محابا گورے آدمی کے پاس چلی جاتی تھی کہ میرا خاوند کالا اور بدصورت ہے۔ زنا کاری الگ تھی اور نکاح کے نام سے الگ زنا کاری ہوتی تھی، شراب انکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی بچے کے حلق میں ٹپکائی جاتی تھی، ڈکیتی، زنا کاری اور شراب کاری بھی تھی۔ پھر لڑائی جھگڑے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناچاقی ہو جاتی تھی، پھر اسمیں قومی اور خاندانی عصبیت نے اثر کیا، اگر دو خاندانوں میں جنگ چھڑ گئی تو مرنے والے نصیحت اور وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی بندمت کرنا...... کبھی خاندان کی ناک کٹ جائے۔ ایک ایک لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس چلتی تھی۔ بے دردی اور قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ سب سے زیادہ محبوب اولاد ہوتی ہے، لیکن ان کے ہاں یہ صورت ہوتی تھی کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو باپ اپنے ہاتھ سے اسے زمین میں زندہ دفن کر دیتا تھا، اسے عار آتا تھا کہ میرا کوئی داماد کہلائے، میرے گھر میں کوئی دوسرا آدمی آئے، بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اگر چار بیٹے ہیں اور رزق کی تنگی ہے تو باپ دو جوان جوان بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا کہ میرے پاس چار آدمیوں کے کھلانے کو نہیں ہے دو کو روٹی دے سکتا ہوں۔ تو قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا جس کو قرآن کریم نے فرمایا کہ ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ﴾ ① اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے مت قتل کرو، رزّاق تو ہم کرتے ہیں تم کہاں سے دنیا کے رزّاق بنے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو ہم پر ہے۔ تو بے رحمی کا یہ عالم تھا کہ جو اپنی اولاد کو ذبح کرتے تھے دوسرے

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۱۔

خاندان والوں پر وہ کیا رحم کر سکتے تھے؟ اور دوسرے ملک کے مسافروں پر تو وہ کیا ہی رحم کر سکتے ؟ تو ڈکیتی، مار دھاڑ، قتل وغارت اور بدامنی پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، نہ ان کا کوئی نظام تھا، نہ ان کا کوئی بادشاہ اور امیر مقرر تھا، دنیا کی قومیں ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں، کوئی کہتا تھا: اونٹوں کے چرانے والے، کوئی کہتا تھا: مینگنی میں کھیلنے والے، کوئی کہتا تھا: گندگیوں میں بسر کرنے والے، یہ اس قوم کے القاب تھے۔ تو عرب کی قوم دنیا کی متمدن قوموں میں سب سے زیادہ ذلیل قوم سمجھی جاتی تھی۔ ان کے اندرونی اخلاق بھی بُرے، اعمال بھی بُرے، توحید بھی ندارد، شرک میں مبتلا، غیر منظم، رات دن کے مصائب میں بھی مبتلا، دنیا کی قومیں ان پر چھاپہ مارتی رہیں، کبھی رومیوں نے چھاپہ مارا تو کبھی فارسیوں نے، ہر ایک کی غلامی انہیں قبول کرنی پڑتی تھی اور وہ جھکنے پر مجبور تھے۔ تو گویا حقیقی معنی میں نہ دن میں چین تھا، نہ رات میں، دلوں کے اندر بھی کوئی سکھ اور آرام نہیں تھا، ایک بدیشی قوم تھی اور یہ مجموعی کیفیت تھی۔ تو دنیا کے اعتبار سے بھی مشکلات میں مبتلا اور آخرت کے اعتبار سے بھی کھوئی ہوئی قوم تھی۔

مقصدِ بعثتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)...... اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی، ان ظلمتوں میں فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اس کی لمبی لمبی کرنیں پڑیں، حجاز پر ہی نہیں بلکہ حجاز کے پورے ماحول اور دنیا کے سارے ممالک پر پڑیں۔ آپ نے تشریف لاکر پروگرام بتلایا کہ یہ قوم مشکلات سے کیسے نکلے! آپ نے اپنی بعثت کی غرض وغایت کیا ظاہر فرمائی؟ دو باتیں جو دو حدیثوں میں بتائی گئی ہیں ظاہر فرمائیں، فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ تمہیں تعلیم دوں اور علم سکھاؤں، تمہاری جہالت دور کروں۔ دوسری حدیث میں یہ فرمایا کہ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ② میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ تمہارے اخلاق کو پاکیزہ بناؤں، تمہارے سامنے پاک اخلاق کا نمونہ پیش کروں اور اعلیٰ ترین اخلاق پر تمہیں لاکر کامل مکمل قوم بناؤں۔ گویا دو اغراض ظاہر فرمائیں انہی دو چیزوں کے اندر قوم کا علاج پوشیدہ تھا ساری مشکلات اور مصائب کا ذریعہ دو چیزیں بنی ہوئی ہیں: ایک قوم کی جہالت دوسرے قوم کی بداخلاقی، یعنی ان میں علمی قوت فنا ہوگئی تھی، تعلیم ندارد کے طور پر تھی، علمی قوت بھی فنا ہوگئی تھی کیونکہ اخلاق ندارد تھے۔

عرب کی پس ماندہ قوم کو عروج کیسے ملا؟...... جب دنیا کی کوئی قوم برباد ہوتی ہے تو انہی دو قوتوں کی بنا پر تباہ ہوتی ہے کہ علم نکل کر اس میں جہالت آجائے اور پاکیزہ اخلاق نکل کر اس میں بداخلاقی پیدا ہو جائے۔ جب یہ دو عنصر جہل اور ظلم کسی قوم میں آئیں گے، تو وہ قوم کبھی پنپ نہیں سکتی۔ اور جب کسی قوم میں علم اور عدل آئے گا تو وہ قوم کبھی پست نہیں رہ سکتی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض وغایت یہ دو چیزیں ظاہر فرمائیں

---

① السنن لابن ماجة، كتاب السنة، باب فضل العلماء ...... ص: ۱۹۱ ۲۴ رقم: ۲۲۹.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے تمہارے سامنے رکھوں اور تمہیں ایک اخلاقی قوم بنادوں۔ اسی واسطے قرآن کریم کی جو سب سے پہلی آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ یہ تھی: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ ①
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا میں عبادت میں مشغول تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا ہوا نہیں کہ کچھ پڑھ سکوں۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے سینے سے چمٹایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اور اتنے زور سے دبایا کہ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَھْدُ میرے اوپر مشقت گزرنے لگی، یوں معلوم ہوا جیسے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی، اس طرح سے مجھے دبایا اور پھر فرمایا اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں کس طرح پڑھوں؟ پھر دوبارہ انہوں نے سینے سے لگ کر دبایا پھر میرے اوپر مشقت گزری یوں معلوم ہوا جیسے پسلیاں ٹوٹ جائیں گی، اس کے بعد الگ کر کے فرمایا اِقْرَاْ، تین دفعہ اِقْرَاْ فرمایا اور آپ نے تین دفعہ ہی فرمایا: مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن تیسری دفعہ دبانے کے بعد اِقْرَاْ کہا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ گویا سب سے پہلا اسلام کا حکم یہ تھا کہ پڑھو پڑھنے لکھنے کا حکم تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم سے تعلیم دی ہے ② یہ لکھنا تھا، تو پڑھنا اور لکھنا دو چیزوں کا حکم کیا گیا یہ دونوں بنیادیں ہیں قوموں کی ترقی کے لئے۔
مگر کونسا علم پڑھو ایک تو دنیوی علوم ہیں جن سے آدمی روٹی پکانا، مکان بنانا، کرسیاں بنانا، بہتر سامان بنانا سیکھ جائے، معاشرتی چیزیں ہیں، علم اس کا نام نہیں، اس کا نام تجربات، صنعت وحرفت اور دستکاری ہے۔ انبیاء علیہم السلام دستکاری یا صنعت وحرفت سکھلانے کے لئے نہیں آتے۔ یہ تو انسان کی طبعی صفت ہے دنیا میں کوئی نبی نہ آئے تب بھی انسان مکان بنا سکتا ہے روٹی پکا سکتا ہے کپڑا بنا سکتا ہے پہن سکتا ہے تو نبوت کا مقصد معاشرتی چیزوں کی تدابیر سکھلانا نہیں ہے، یہ تو انسان کی طبیعت ہے خود بخود کرتا ہے اور جتنا کرتا ہے بڑھتا چلا جاتا ہے بہتر سے بہتر چیز بننے لگتی ہے، خوشنما نمونے اور ڈیزائن اپنے تجربے اور طبیعت سے پیدا کرتا رہتا ہے اس کا نام علم نہیں اس کا نام صنعت وحرفت، دستکاری اور صناعی ہے اس کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے، اس کے ضروری ہونے سے انکار نہیں ہے۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱-۵۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص: ۱ رقم: ۳۔

علوم طبعیہ کمال انسان نہیں ......لیکن یہ چیزیں انسان کے طبعی علوم ہیں اور طبعیاتی علوم انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، ہر جاندار میں ہیں دنیا کا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو اپنے رہن سہن کا ڈھنگ نہ جانتا ہو۔ ایک چڑیا گھونسلہ بناتی ہے اس کا وہی مکان ہے، ایک درندہ بھٹ بنا کے رہے گا اس کا وہی مکان ہے۔ تو پرندے چرندے اور درندے سب ہی رہتے ہیں (تو اپنے لئے موزوں مکان ہر جاندار بنا ہی لیتا ہے) کھانا ہے ظاہر بات ہے کہ سب جانوروں میں مشترک ہے، ہر ایک نے اپنی اپنی غذا کو پہچان رکھا ہے، اپنی اپنی غذا استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے کمانے کو بھی جاتے ہیں۔ چڑیا اپنے گھونسلے سے نکل کر کھیتوں میں جاتی ہے، دانہ چگتی ہے اس کے دل میں اللہ کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے کچھ نہیں ملے گا، محنت کرنی پڑے گی تب چار دانے ہاتھ آئیں گے۔ شیر اپنے بھٹ سے نکلتا ہے اپنی غذا تلاش کرتا ہے اور خون پیتا ہے اس کے دل میں یہی الہام ہوتا ہے کہ تیری غذا بکری میں ہے یا ہرن میں ہے۔ تو کوئی جانور خون پیتا ہے، کوئی جانور گوشت کھاتا ہے کوئی دانہ چگتا ہے، ہر جانور کے دل میں اللہ نے ایک الہام ڈالا ہے اور اس کی طبیعت کے مناسب غذا مہیا کی ہے وہ جاتا ہے محنت کرتا ہے کھاتا ہے۔

اگر انسان بھی محنت کرے کھائے پئے تو زیادہ سے زیادہ اس نے حیوانیت کا حق ادا کر دیا۔ اگر اسی کا نام علم ہے تو پرندے بھی عالم، درندے چرندے بھی علماء، سب کے سب ان چیزوں کو جانتے ہیں، سب کے سب عالم ہوتے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو علم کہا جائے اور انسان یوں کہے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں اور میں عالم ہوں اور میرا علم یہ ہے۔ یہ علم تو جانوروں کے پاس بھی ہے، شہد کی مکھی کتنا عمدہ مکان بناتی ہے، ہر پہلو سوراخ بناتی ہے۔ آپ پرکار سے بھی مشکل سے بنا سکیں گے وہ اپنے منہ سے بے تکلف بناتی ہے کہ ہر ہر سوراخ برابر ہے۔

پھر اس میں تنظیم کیسی ہے کہ بعض خانوں میں شہد بھرا ہوا ہے، یہ گویا قوم کی غذا ہے، بعض میں بچے پرورش پا رہے ہیں، بعض میں ماں باپ رہتے ہیں۔ ان کا ایک امیر مقرر ہے جس کا نام یعسوب ہے، ساری مکھیاں اس کی اطاعت کرتی ہیں جہاں وہ بیٹھتا ہے وہیں بیٹھتی ہیں اور شہد کا چھتہ لگاتی ہیں غرض ان کے اندر سیاست اور تنظیم بھی ہے اور امیر کا انتخاب و تقرر بھی ہے، امیر کی اطاعت اور تقسیمِ عمل بھی ہے کہ اتنے حصے میں غذا، اتنے حصے میں قوم اور اولاد، اتنے حصہ میں ماں باپ رہیں گے۔ تو اگر آپ نے ملت کی تنظیم ہی کر لی ہے، اچھا گھر بنا لیا اور نظام عمل سے کھانے پینے کے تمام معاملات درست کر لئے تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ کام کر سکے جو شہد کی مکھی بھی کر لیتی ہے۔ اس کا نام نہ علم ہے نہ کمال ہے یہ تو ایک تجرباتی اور طبعی چیز ہے جو ہر انسان اور حیوان کرتا ہے تو حاصل یہ ہے کہ طبعیاتی علوم اپنے اپنے درجہ کے مطابق حیوانات میں بھی موجود ہیں اگر انسان میں بھی آ جائیں تو یہ ایسے بڑے کمال کی بات نہیں کہ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات کہے۔

حیوانات میں دفعیہ امراض کا شعور ...... آپ کہیں گے ہم بیمار ہوتے ہیں ہمارے پاس علم طب ہے، ہم مطلب کرتے ہیں، دوائیں تجویز کر کے علاج کرتے ہیں (یہ صرف انسان ہی کر سکتے ہیں ہر جاندار تو ایسا نہیں کر سکتا

اس لئے انسان اشرف المخلوقات ہوا) میں کہتا ہوں کہ حیوانات میں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق علم طب موجود ہے، اگر چہ حیوان ہے مگر بیمار ہوتا ہے اور دفعیہ کرتا ہے۔

بندروں کی چالاکی کا واقعہ...... مجھے یاد آیا کہ میں راجپوتانے گیا میرے بعض عزیز وہاں ملازم تھے ہندوؤں کی ریاست تھی۔ بندر چونکہ ان کے ہاں مقدس جانور سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کو مارنے کی ممانعت تھی۔ جانور یہ ایسا ہے کہ نقصان بہت زیادہ کرتا ہے، ہمارا مکان ذرا کھلا رہ جاتا تو کہیں کپڑا لے گیا کہیں برتن لے گیا۔ اور کمبخت یہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسمیں یہ نہیں ہے کہ کپڑا لے جاکے پھینک دے بلکہ مُنڈیر پر سامنے بیٹھ کر دکھا دکھا کے پھاڑے گا جیسے کسی کو چڑا رہا ہو، ایذاء رسانی بھی اس کے اندر عجیب ہے کہ طبیعت میں کوفت ہوتی تھی، جلن بھی پیدا ہوتی تھی مگر مارنے کی ممانعت تھی۔ چھپ چھپ کر ہم نے دس بیس بندر مار بھی دیئے، مگر وہ تو ہزاروں کا کنبہ تھا پہاڑی مقامات ہیں، ہزاروں بندر تھے تو ہم نے یہ ارادہ کیا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سو پچاس بندر یکدم مریں تا کہ ان کو کچھ تو عبرت ہو اور ہمارے نقصان میں کچھ کمی کریں۔ ہم نے کچھ پیسوں کا زہر سنکھیاں خریدا اور آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور ایک ٹوکرا بھر کے چھت کے اوپر روٹیوں کا پھیلا دیا اور خیال یہ تھا کہ بندر آتے ہی وہ روٹیاں کھانا شروع کریں گے اور زہر چڑھے گا تو مرتے جائیں گے اور ہم بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے انتقام لے لیا۔

مگر بڑا چالاک بہت ہی سیانا جانور ہے کچھ بندر آئے انہوں نے دیکھا کہ چھت کے اوپر روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں تو انہیں حیرت ہوئی کہ روٹیاں بکھری تو رہتی نہیں اس کے اندر کوئی بات ہے اور بجائے اس کے کہ وہ روٹیوں پر ٹوٹ پڑتے انہیں کھاتے...... وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر روٹیوں کو دیکھتے ہیں گویا زبانِ حال سے یہ سوال تھا کہ یہ بات کیا ہے؟ روٹیاں پھیلی ہوئی کیوں پڑی ہیں؟ یہ عادت کے خلاف ہے دو چار منٹ کے بعد تین چار بندر چلے گئے ہم سمجھے کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی انہوں نے جا کر اپنے قبیلے اور خاندان میں کوئی اطلاع کی ہوگی تو دس بیس بندر بہت موٹے موٹے آئے اور آکر بیٹھ گئے انہوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا روٹی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے ہم سمجھ گئے کہ ہماری تدبیر دھری رہ گئی۔ یہ کمبخت کچھ سمجھ گئے کہ ان روٹیوں میں کچھ ہے اس کے تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ سو ڈیڑھ سو کے قریب بندروں کی ایک قطار...... اسمیں بڑے موٹے موٹے بندر جیسے قوم کے چوہدری ہوتے ہیں وہ جمع ہوئے اور روٹیوں کے اردگرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے، گویا گول میز کانفرس منعقد ہوئی کہ اسمیں غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پڑی ہیں، اس میں بھید کیا ہے؟ یہ عادت کے خلاف ہے، ایک آگے بڑھا اس نے روٹی کو توڑا اور سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا اس نے بھی روٹی کو توڑا اور سونگھا چار پانچ نے اسی طرح کیا انہوں نے اشاروں میں کچھ کہا ہوگا تو وہ سمجھ گئے اور دوسرے سب بھی وہاں سے بھاگ گئے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی اور یہ سمجھ گئے ہیں تو ارادہ کیا کہ روٹیاں وہاں سے اٹھوالیں، وہ روٹیاں کسی کام کی بھی نہیں تھیں، ان میں تو زہر ملا ہوا تھا سوائے اس کے

کہ انہیں دفن کیا جاتا اس کے علاوہ وہ نہ کھانے کی نہ کھلانے کی تھی۔

اس کے بعد کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے تو دواڑھائی سو بندروں کی قطار دوڑی ہوئی چلی آرہی ہے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ہرے ہرے پتوں کی ایک ایک ٹہنی ہے، آئے آکر انہوں نے روٹیوں کے اردگرد بیٹھ کر روٹیوں کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنی بندروں کی تعداد تھی۔ روٹیاں پچاس تھیں بندر دو سو کے قریب تھے تو اتنے ٹکڑے کر دیئے کہ ہر ایک بندر کو ایک ٹکڑا آسکے۔ "بندر بانٹ" عرف میں مشہور ہے۔ سب نے مل کر ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے وہ پتے چبالئے اور دندناتے ہوتے چلے گئے، نہ کمبخت کوئی گرا، نہ مرا اور نہ بے ہوش ہوا۔

تو جنس کے اعتبار سے اگر آپ اطباء ہیں تو ان میں بھی اطباء ہیں، آپ جڑی بوٹی جاننے والے ہیں تو وہ بھی جاننے والے ہیں تو طبیب ہونا یا علم طب حاصل کرنا یہ بدن کی اصلاح کا علم ہے بدنی اصلاح جانور بھی کرتے ہیں یہ تو کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جائے۔

ایک شبہ کا جواب......اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! ہم تو بہت اعلیٰ اعلیٰ نہایت بہترین کپڑے پہنتے ہیں پچاس پچاس روپے گز کے، باریک میں باریک کپڑا اور موٹے میں موٹا کپڑا......تو میں کہتا ہوں کہ خدا نے جانوروں کے بدن پر ایسی کھالیں پیدا کر دی ہیں، شیر کو دیکھو وہ زرد رنگ کے بوٹوں کا کمبل اوڑھے ہوئے ہے، میلا بھی نہیں ہوتا، آپ کا کپڑا تو ہر دوسرے ہفتے میلا ہوگا، دھلنے جائے گا اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں تو پھر آپکے کپڑوں میں کیا کمال باقی رہ گیا! یہ بھی دیکھئے مکڑی جال بناتی ہے گویا سفید سا ایک خیمہ تانتی ہے، پھر اسمیں بیٹھتی ہے وہ اتنا چکنا ہوتا ہے کہ آپ کے مانچسٹر کی ململ اتنی صاف اور چکنی نہیں ہوتی جتنا اس کا خیمہ صاف ہوتا ہے۔ بُنتی کہاں سے ہے؟ کوئی مشین اس کے پاس نہیں ہے، محض اپنے منہ اور ہاتھ سے بُنتی ہے اور اتنا صاف بُنتی ہے کہ آپ اس سے بہتر بناوٹ نہیں کر سکتے اور خیمہ بنا کر اس میں رہتی ہے۔ تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم کپڑا بُننے والے ہیں، ہمارے پاس بہترین مشینیں ہیں، وہ بلا مشین کے بہترین بُن کر خیمہ لگا لیتی ہے۔ تو کوئی چیز طبعیاتی امور میں ایسی نہیں ہے جو جانوروں کے اندر نہ ہو۔ تو میرا مطلب یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام یہ علوم لیکر نہیں آئے، یہ علوم تو طبعیاتی ہیں، رہن سہن کھانے پینے، پہننے وغیرہ کے جتنے بھی علوم ہیں یہ اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر حیوان میں موجود ہیں، یہ انسان کی خصوصیت نہیں کہ وہ ان پر فخر کر سکے۔

باعث فخر علم کونسا ہے؟......پھر آخر خصوصیت کیا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کاہے کیلئے آتے ہیں؟ خیمہ بُننا بتلانا یا تعمیریں سکھلانا یہ ان کا کام نہیں ہے، ان کا کام روحوں کی اصلاح کرنا، مخلوق کو سچے راستہ پر ڈالنا اور بچھڑے ہوئے بندوں کو خدا سے ملانا ہے تاکہ علم آنے لگے اور ان کے اندر اخلاق ربانی پیدا ہوں، صحیح معنی میں انسانیت آئے۔ تو انبیاء علیہم السلام آدمی بنانے کیلئے آتے ہیں، اس کے لئے اس علم کی ضرورت ہے جس سے روح اور قلب درست ہو۔ جس سے بدن سنور جائے وہ علم تو حیوانات میں بھی ہے، اسمیں انبیاءؑ کی ضرورت نہیں ہے، انبیاء کے علم کا

موضوع وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جس سے انسان کی روح میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اللہ کی ذات وصفات کا علم، اس کے احکام کا علم، اس کی شریعتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا علم ہے جس سے آدمی آدمی بنتا ہے۔ یہی علم ہے جو انبیاء علیہم السلام لیکر آتے ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○﴾ ① کہ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ یہ قرآن پاک کی پہلی آیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرو جس میں رب کا نام پہلے آئے، رب کا تعارف ہو اگر آپ نے پہاڑوں کا، زمینوں کا، درختوں کا اور جانوروں کا تعارف حاصل کرلیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، تعارف تو اپنے خدا کا کرنا چاہیے کہ خدا کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، اس کی شانیں کیسی ہیں، اس کے احکام کیسے ہیں، اس کا دیا ہوا قانون کیسا ہے، یہ چیزیں جانوروں کو نہیں انسانوں کو دی گئی ہیں، اسی علم کی بناء پر اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ور اپنا نائب بنایا ہے کہ وہ میرا علم لے کر آرہا ہے محض علم نہیں بلکہ وہ علم عقلوں سے بھی بالاتر ہے اور عقلیں بھی اسی سے درست ہوتی ہیں، یہ علم دے کر انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ تو نبی آکر انسان کو انسان بناتے ہیں ان میں علم اور اخلاق پیدا کر کے انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عرب قوم پر علومِ ربانی کا اثر...... عرب کے لوگوں میں جتنی بداخلاقی اور جہالت پھیلی ہوئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطاب کے بعد جب قوم نے آپ کی بات پر لبیک کہا اور علم حاصل کرنا شروع کیا، قرآن کریم نور بن کر ان کے دلوں میں سما گیا اور انکے اخلاق کو اونچا بنا دیا اس وقت جوان کی حالت پلٹی ہے تو تیرہ برس کے اندر وہ کیفیت ہوئی کہ انہوں نے بڑے بڑے سلاطین کے تخت الٹ دیئے، دنیا میں انقلاب بپا کر دیئے، حکومتیں تہہ وبالا ہوگئیں ان کا عروج واقتدار پوری دنیا کے اندر پھیل گیا، آدھی دنیا پر ان کا پرچم لہرانے لگا، پچاس سال کے اندر نصف دنیا کے اوپر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، محض اس قرآن اور اخلاق کی بدولت اور محض ان علوم ربانی کی بدولت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیکر تشریف لائے تھے، آپ نے اس درجہ ان کے قلوب کو مصفّٰی کیا کہ وہ لوگ جو ایک ایک پیسے کے اوپر جان دیتے تھے لوگوں کا مال لوٹنے کیلئے ڈکیتیاں کرتے تھے، وہ اتنے غنی بنے کہ دنیا کے خزانے ان کے قدموں پر گرے، خود رکھنے کی بجائے وہ اسے لٹاتے تھے ان کا دل غنا سے بھر چکا تھا، تو وہ مال کو خادم جان کر استعمال کرتے تھے مال کو مخدوم نہیں جانتے تھے، انہوں نے مال و دولت کو قبلہ نہیں بنایا تھا دولت کو اپنا خادم جانتے تھے اتنا دلوں کے اندر غنا پیدا ہو چکا تھا۔

علی و جابر رضی اللہ عنہما کی دنیا سے بے رغبتی...... حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیت المال میں گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے فرمایا کہ یَادُنْیَا غِرِّیْ غَیْرِیْ ② اے دنیا دھوکہ کسی اور کو دیجیو، ہم تیرے دھوکے اور فریب میں آنے والے نہیں ہیں، ہم تجھے چاہنے والے نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۔ ② حلیۃ الاولیاء، علی بن ابی طالبؓ ج: ۱ ص: ۸۱۔ الشریعۃ للآجری، ج: ۳ ص: ۱۱۹۶۔

تقسیم شروع کردو، لاکھوں روپیہ رات بھر میں غرباء اور مساکین کو لٹایا گیا یہ تو بیت المال کا قصہ تھا۔

لیکن کیفیت یہ تھی کہ غالباً حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں یہ لکھ پتی صحابہ میں سے تھے، امراءِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہے ایک دن حضرت گھر تشریف لائے تو طبیعت اداس اور منقبض تھی بیوی نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے؟ فرمایا اداس اور بے چین ہو رہی ہے، بیوی نے کہا کیا بات ایسی پیش آئی؟ فرمایا خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے، طبیعت پر بوجھ بڑھ رہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں پریشانی ہو رہی ہے، ہمارا تو خزانہ خالی ہو تو تب پریشانی ہوتی ہے ان کا زیادہ بھر گیا تھا اس لئے پریشانی تھی۔ بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ پھر اس میں بے چین ہونے کی کونسی بات ہے، غرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیں، کہنے لگے بات تو ٹھیک ہے، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا تقسیم شروع کرو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا غریبوں، بیواؤں، یتیموں، مسافروں اور مسکینوں کو دیا گیا صبح کو جو حساب لگایا گیا تو چھ لاکھ روپیہ رات بھر میں تقسیم ہوا۔ صبح آ کے بیوی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کیسی عمدہ تدبیر بتلائی، میری طبیعت ہلکی ہو گئی یہ وہ لوگ تھے جو ایک ایک پیسے کے اوپر جان لیتے اور جان دیتے تھے آج ان میں یہ غناء پیدا ہوا کہ ایک آدمی ایک رات میں چھ چھ لاکھ روپیہ لٹاتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔ یہ غناء کہاں سے پیدا ہوا؟ اخلاق کے اندر یہ بلندی کیسے آئی؟ یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیضِ صحبت تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور قرآنی تعلیم کا اثر تھا جو روح بن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر رچ گیا تھا یہ کیفیت تو مردوں میں تھی۔

مال سے متعلق عورتوں کی فطری طبیعت ...... مردوں میں تو پھر بھی منہ دیکھے سخاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کو فطری اور طبعی طور پر دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس واسطے کہ عورت تو زیوروں کے جھنکار میں پرورش پاتی ہے، اسی میں اس کی زندگی گزرتی ہے، بچی ہوتی ہے تو پیدا ہوتے ہی چھ مہینے کے بعد اس کے کانوں میں سوراخ کر کے سونا ٹھونس دیا جاتا ہے، ناک میں سوراخ کیا اس میں (سونے کی) کیلیں ٹھونک دیں اور عورت ہے کہ خوش ہے۔ اگر اس کے بدن کو چھلنی کر دیا جائے اور وعدہ دیدیا جائے کہ سونے کی کیلیں ٹھونکیں گے تو بلاشبہ تیار ہو جائے گی کہ بدن چھلنی کر دیا جائے اور سونے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں۔ تو طبعی طور پر محبت ہوتی ہے اس لئے کہ بچپن سے زیورات کی جھنکار میں رہتی ہے جس کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ وہ تو زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے صبح و شام اس کو زیور کا شغل ہے تو سونے اور چاندی کی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاوند کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو خاوند تو حجت پیش کرتا ہے دلیلیں پیش کرتا ہے، وہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے بیان میں چل نہیں سکتی، اس لئے کہ جس قلب کے اندر سونا چاندی رچ جائے وہاں علم کا رہنا مشکل ہے تو بیان اور علم کے اندر کمزور ہوتی ہے۔

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

بہر حال عورتوں کے اندر مال، زیور اور سونے چاندی کی طمع زیادہ ہوتی ہے مردوں میں اتنی نہیں ہوتی، مرد تو عورتوں کے مبتلا کرنے سے مبتلا ہوتا ہے۔ شادی کرنے سے پہلے مرد کے وہ جذبات نہیں ہوتے جو شادی کرنے کے بعد ہوتے ہیں وہ آتی ہیں اور راستہ بدل دیتی ہیں مرد میں ایک قسم کا غناء ہوتا ہے مگر عورت میں نہیں ہوتا۔

کسی ساہوکار کا قصہ مشہور...... وہ کسی ساہوکار کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے بیوی سے یہ کہا کہ وہ ذرا سل کا بٹہ میرے پاس اٹھالا (سل کا بٹہ جس سے مصالحہ پیسا جاتا ہے) تو اس نے اپنی نزاکت دکھلائی کہ میرے سے کیسے اٹھے گا؟ میں نازک اندام ٹھہری اور یہ سل کا بھاری پتھر اتنے وزن کا، مجھ سے کیسے اٹھے گا؟ وہ ساہوکار بڑا گھبرایا کہ اس نزاکت کے ساتھ میرا گزر کیسے ہوگا، میں تو کسان آدمی ہوں میری بیوی تو ایسی ہونی چاہیے جو محنت مزدوری کر سکے، کچھ بوجھ اٹھا سکے، یہ دو سیر سل کا بٹہ اٹھانا اسے بھاری ہو رہا ہے میرے گھر میں اس کا کیسے گزر ہوگا؟ مگر تھا وہ بھی ہوشیار، شام کو وہ آیا اور چپکے سے سل کا بٹہ اٹھا کے لے گیا اور اس کے اوپر سونے کا پتر چڑھوا کے ایسا کرا دیا جیسے وہ سونے کا بنا ہوا ہے، گھر آیا اور بیوی سے کہا کہ میں اڑھائی سیر کا بڑا عمدہ زیور بنوا کر تیرے واسطے لایا ہوں اور مضبوط ایسا کہ دادا برتے، تو پوتا بھی برتے اس کے گھسنے کو کوئی صورت نہیں اور وہ میرے پاس ہے وہ اب شوق میں بے تاب ہے کہ جلدی سے اسے کھولے اور وہ ساہوکار ہے کہ شوق تو اسے دلا رہا ہے مگر کھولتا نہیں ہے کہنے لگا تو اسے پہنے گی؟ کہنے لگی یقیناً پہنوں گی، تھا تو وہ سل کا بٹہ لیکن اس پر پتر چڑھوایا اور سونے کی زنجیر بھی اس میں ڈلوا کے لایا تھا اس نے نکالا تو بڑی بے تابی سے اس نے گلے میں ڈالا اور دن بھر پہنے ہوئے پھر رہی ہے، کام کاج بھی کر رہی ہے، ساہوکار نے کہا کہ یہ زیور اچھا ہے؟ بوجھ تو نہیں لگتا؟ کہنے لگی کہ نہیں بالکل بوجھ نہیں لگتا، کہنے لگا کمبخت یہ وہی پتھر تو ہے جو تجھ سے کل نہیں اٹھتا تھا اور آج گلے میں ڈالے ہوئے پھر رہی ہے، محض اس لئے کہ اس پر سونے کا نام آ گیا ہے۔

تو سونے اور چاندی کی محبت میں عورت غرق ہوتی ہے اور وہ مرد کو بھی مبتلا کرتی ہے، مگر یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت تھا کہ عورتوں کو بھی آپ نے اتنا غنی بنا دیا تھا کہ ان کے قلوب سونے اور چاندی سے بالاتر ہو گئے تھے۔

عائشہؓ کی سخاوت...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مکہ مکرمہ کے حاکم بنائے گئے خزانے کی بوری بھر کر اسمیں سونا چاندی، اشرفیاں اور روپوں سے اچھی طرح بھر کے اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بطور ہدیہ بھیجی، صدیقہ عائشہؓ نے باندی سے فرمایا کہ میں اتنی دولت کیا کروں گی غریبوں میں تقسیم کر دو باندی نے تقسیم کرنی شروع کر دی۔ دن بھر میں وہ ساری بوری ختم ہو گئی لاکھوں روپے کا سونا چاندی تھا وہ سب ختم ہو گیا شام کو باندی نے کہا: ام المومنین تین دن سے آپکے اوپر فاقہ ہے آپ نے بھی اس میں سے کچھ روپے

رکھ لئے ہوتے! فرمایا: اری جا بے وقوف! پہلے سے نہ کہا کہ میں بھی دو چار روپے رکھ لیتی جب بوری ختم ہوگئی جب تونے کہا۔ تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر تین دن سے فاقہ ہے اسی کو یاد کر کے دو چار روپے رکھ لیتیں گویا اتنا استغناء قلب میں پیدا ہو چکا تھا کہ بوری رکھی ہے اور تین دن سے فاقہ ہے مگر دھیان نہیں جاتا کہ اسمیں سے کچھ اپنے لئے رکھ لیں۔ تو جب عورتوں کے قلوب ایسے بن گئے تھے تو اندازہ کیجئے مردوں کے قلوب کیسے ہوں گے!۔

نجومِ ہدایت کی دنیا و آخرت...... دنیا کی اقوام اگر نمونہ بھی پیش کرتی ہیں تو انہی بزرگوں کا نمونہ پیش کرتی ہیں آپ نے اخبارات میں دیکھا ہوگا غالباً جب ہندوستان میں کانگریس کی عارضی گورنمنٹ بنی ہے تو گاندھی جی نے اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا کہ اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان کا سر اونچا رہے تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ و عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں، جن کے قدموں میں دنیا کے خزانے ڈالے گئے، ملکوں کی دولتیں آئیں اس کے باوجود نہ ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ زیتون کا تیل چھوٹا، نہ ان کے ہاں بہت زیادہ مرغن کھانے تھے، نہ اعلیٰ ترین فرنیچر تھے، نہ لباس تھے تو اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ و عمر و فاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ صحبت کا ایسا اثر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ایسی معیاری زندگیاں بنادیں کہ دنیا کی دوسری اقوام بھی ان کو نمونہ بنا کر پیش کریں۔ یہ صرف تعلیم قرآن کا اور اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا اثر تھا تو علم اور اخلاق کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ جو قوم دنیا کی ساری قوموں میں پس ماندہ اور پست تھی وہ اتنی اونچی بنی کہ ساری دنیا کی قومیں ان کے سامنے نیچی بن گئیں وہی زمانہ تھا جس کو زمانۂ جاہلیت کہا جاتا تھا۔ وہی زمانہ ہے اس کو تعلیم قرآن کی بدولت خیر القرون کہا جانے لگا جن لوگوں کو جہلائے عرب کہا جاتا تھا ان کی بداخلاقیاں بیان کر کے لوگ ملامت کرتے تھے اب تعلیم قرآن کی بدولت جب صحابہ کا ذکر آتا ہے تو لوگ رضی اللہ عنہ و رضوا عنہ کہتے ہیں۔ یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم، تربیتِ اخلاق اور فیضِ صحبت کا ہی اثر تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو قوم کو اتنا اعلیٰ بنا دیا کہ جو قوم کی مشکلات تھیں سب ختم ہوگئیں، جو پس ماندگی تھی وہ ساری ختم ہوگئی، جس قصے میں قوم مبتلا تھی وہ قصہ سارے کا سارا ختم ہوگیا دنیا میں برسر اقتدار آگئی اور آخرت تو ان کی بنی ہوئی ہی تھی آخرت ان کی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرماتے ہیں: اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ① میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں

① مسند عبد بن حمید، احادیث ابن عمرؓ، ج:۲ ص:۴۰۲. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیهقی و اسنده الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "التلخیص الحبیر" میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الحبیر، باب ادب القضاء ج:۵ ص:۴۹۸.

جس ستارے کی روشنی میں چل پڑو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ جس صحابی کا دامن تھام لو گے ہدایت پا جاؤ گے تو ایک ایک صحابی معیار بن گیا یا تو وہ جہلائے عرب تھے یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنے۔ یا ان کا راستہ قابلِ نفرت تھا یا ایسا بنا کہ عالم کیلئے باعثِ ہدایت بن گیا۔ اور فرمایا: لَا تَسُبُّوا اَصْحَابِیْ ① میرے صحابہ کی شان میں کوئی گستاخی مت کرو، کوئی کلمۂ توہین مت کہو اس لئے کہ ان کا ایک (مُدّ) صدقہ کرنا تمہارے اس صدقے سے بہتر ہے جو جبلِ اُحد کے برابر سونا دو، وہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے، ان کا سیر ڈیڑھ سیر جو کا صدقہ کرنا تمہارے پہاڑ برابر سونا صدقہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

اس لئے کہ ان کے قلوب میں للّٰہیت و اخلاص ہے جو ان کے قلوب میں پیدا کیا گیا وہ بعد والوں کو میسر آنا مشکل ہے غرض سارے صحابہ کو ستاروں کے مانند فرمایا یہ تو صحابہ کرام ہیں خلفائے راشدین کے بارے میں فرمایا کہ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ ② میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنتوں کو لازم پکڑو۔ دس صحابہ کا نام لے کر مُبَشَّرٌ بِالْجَنَّةِ فرمایا اور جنت کی بشارتیں دیں فرمایا: اَبُوْبَكْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَعَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَغَیْرِ ذٰلِكَ۔ ③

تو دس صحابہ کرام کا نام لے کر نام بنام فرمایا کہ یہ جنتی ہیں تو آخرت ان کی یہ ہے اور دنیا کے لئے مقتداء اور نمونہ ہیں۔ دنیا میں جنت کی بشارت دے دی گئی اور دنیا کے اعتبار سے ان کی حکومت کا یہ عروج ہے کہ ان کا اقتدار قائم ہوا تو ان کا نام سن کر ان کی ہیبت اور ان کے رعب و جلال سے سلاطین دنیا کے پتے پانی ہوتے تھے۔

اس وقت آپ اور ہم جس حالت میں اب ہیں اسلام لانے سے پہلے وہ لوگ اس سے بدرجہا بری حالت میں تھے لیکن انہیں انقلاب بپا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر ان کی دین دنیا کی مشکلات کو ختم کر دیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ④ اس امت کے اخیر کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس چیز سے اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی تو امت کے اول طبقے کی اصلاح قرآن کریم، اس کی تعلیم اور اسی کے دیئے ہوئے اخلاق سے ہوئی تھی انہی چیزوں سے آج بھی امت کی اصلاح ہو سکتی ہے جس چیز سے امت کے اول حصہ کی مشکلات ختم ہوئیں تھیں اسی چیز سے امت کے آخر کی مشکلات بھی ختم ہو سکتی ہیں خواہ وہ کسی خطے کے رہنے والوں ہوں، ہند میں یا سندھ میں یا امریکہ و افریقہ اور ایشیا میں ہوں، جہاں مشکلات ہیں وہ ختم جبھی ہوں گی جب ان کا راستہ صحیح ہو جائے گا اور اسی لائن پر آجائیں گے جس لائن پر جناب

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذا خلیلاً......، ص: ۲۹۹ رقم: ۳۶۷۳. ② السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المهدیین ج: ۱ ص: ۴۹ رقم: ۴۲. ③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عبدالرحمن بن عوف رضی الله عنه ص: ۲۰۳۷ رقم: ۳۷۴۷. ④ شرح العقیدة الطحاویة، مقدمة ج: ۱ ص: ۹۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ڈالا تھا۔

پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ اعمال واحوال سرزد ہوتے ہیں...... تو انبیاء علیہم السلام، خصوصیت سے سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی مشکلات کو ختم کرنے کے لئے تشریف لائے اور اس کے لئے دو ہی طریقے اختیار فرمائے ایک تعلیم اور ایک تربیت، تعلیم کے ذریعہ علم پہنچایا تاکہ لوگوں کے دلوں میں روشنی پیدا ہو، اندھیرے ختم ہو جائیں اندھیروں میں کوئی قوم ترقی کی طرف نہیں چل سکتی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے علم کی روشنی بہم پہنچائی۔

دوسری چیز تھی قوتِ عمل، وہ اخلاق سے پیدا ہوتی ہے ان کے اخلاق درست کئے، قلب کے اندر جو مادے ہیں جب تک وہ درست نہیں ہوتے عمل درست نہیں ہوسکتا۔ ہر عمل پر قلب کے اندر ایک مادہ ہے اگر وہ مادہ سامنے نہ ہوتا وہ عمل سامنے نہ آتا مثلاً داد و دہش اور فقیر کو دینا ہے، جب تک قلب کے اندر سخاوت کا مادہ نہیں ہوگا داد و دہش کے افعال ظاہر نہیں ہوں گے۔ یہی حملہ آوری ہے دوسروں کے اوپر ہجوم کر کے جانا ہے جب تک شجاعت کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ مصائب کے اندر ضبط نفس ہے، واویلے سے بچنا، جب تک صبر کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ برائی کو دیکھ کر آدمی شرما کر بیٹھ جائے بُرائی کے پاس نہ جائے جب تک حیا کا مادہ اور خلق نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ تو قلب کے اندر اخلاق کی مثال ایسی ہے کہ جیسا بیج ہوتا ہے ویسی شاخ نکلتی ہے ویسا ہی پھل لگتا ہے تو جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اعمال ہوتے ہیں اور جیسے اعمال ہوتے ہیں پھر ویسے ہی احوال وانجام اور ثمرات بھی نکلتے ہیں اسلام سے پہلے چونکہ اخلاق بُرے تھے تو برے افعال سرزد ہوتے تھے بُرے احوال سامنے آتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر قلب کو درست کیا اخلاق کو صحیح کر دیا تو پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ افعال سرزد ہونے لگے، پاکیزہ اعمال سے پھر پاکیزہ نتائج اور ثمرات بھی سامنے آنے لگے۔

حصولِ منزل کیلئے شریعت وطریقت دونوں ضروری ہیں...... آدمی کے جب تک اخلاق درست نہ ہوں اعمال صحیح نہیں ہوسکتے، اور اخلاق درست ہوں لیکن علم نہ ہو تو عمل کا راستہ نظر نہیں آسکتا تو دونوں چیزیں لازمی ہیں کہ علم کا راستہ بھی سامنے ہو منزل بھی سامنے ہو اور چلنے کی طاقت بھی ہو جب تک دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی نہ آدمی چل سکے گا نہ منزل مقصود تک پہنچ سکے گا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ریل گاڑی دیکھی ہوگی کہ انجن کے پیچھے جب ڈبے جوڑ دیئے جاتے ہیں تو وہ انہیں لیکر چلتا ہے لیکن انجن چلتا کیوں ہے؟ دو باتیں ہیں جن سے وہ چلتا ہے اور منزل مقصود پہنچتا ہے۔ پہلی چیز تو اس کے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے اگر لائن نہیں ہوگی تو انجن چل ہی نہیں سکتا، تو سب سے پہلی چیز تو لوہے کی لائن ہے تاکہ وہ اس پر دوڑ کر چلے، دوسری چیز انجن کے اندر اسٹیم بھری ہوئی ہونی چاہیے اس کے اندر آگ پانی بھی ہو۔ آگ پانی نہ ہو تو کم سے کم کوئی بجلی پاور ہو جس سے اسٹیم اور گیس بنے تاکہ وہ چلے، تو ایک اندر اسٹیم اور آگ ہونی چاہیے اور دوسرے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے جب دونوں چیزیں جمع ہوں گی تو انجن

چلے گا اور اتنی زور سے چلے گا کہ مہینوں کی مسافت دنوں میں طے کریگا اور دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرے گا۔ نہ صرف خود چلتا ہے بلکہ اس کے پیچھے جتنی گاڑیاں جوڑ دی جائیں منوں وزن کا لوہا جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر لے جائے گا اور منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔ یہ کب؟ کہ لائن بھی ہے اور اسٹیم بھی ہے، لیکن اگر آپ لائن ہی نہ بچھائیں تو اگر چہ اندر اسٹیم بھر دیں اسے چھوڑ دیں گے تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا اور اگر اسٹیم بھری ہوئی نہ ہوا اور لائن بچھی ہوئی ہو تو دھکیل دھکیل کے آپ اس کو کہاں تک چلائیں گے قریب تک چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر ہزاروں آدمی دھکیلیں گے تھوڑا چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا تو منزل مقصود تک پہنچنے کی شرط یہی ہے کہ اندر آگ بھی بھری ہوئی ہو اور لائن بھی ہو وہ اندرونی طاقت ہے جس سے وہ دوڑتا ہے اور وہ سامنے راستہ ہے جس کے اوپر دوڑے گا۔ تو دونوں چیزیں ہونی چاہیے ایک راہ ہو، دوسرے چلنے کی قوت بھی ہو۔

ٹھیک اسی طرح ہر مؤمن و مسلم کو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک انجن کی مانند ہے اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے لائن بھی سیدھی ہو اور اندر آگ بھی پڑی ہوئی ہو۔ جو سیدھی لائن ہے اس کا نام شریعت ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ① سیدھا راستہ جو اللہ تک پہنچانے والا ہے، اخلاق ربانی اور اعمال صالحہ تک پہنچانے والا ہے، انجام درست کرنے والا ہے اسی کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یہ تو راستہ ہوا اور اندر عشق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آگ ہونی چاہیے، اللہ کی محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو کہ جس کے جذبے میں آدمی دوڑتا ہوا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو ایک مؤمن مسلم منزل مقصود تک پہنچے گا اگر اس کے سامنے شریعت کا راستہ ہی کھلا ہوا نہیں تو اللہ تک کیسے پہنچے گا؟ اور اگر راستہ سیدھا ہے مگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی نہیں ہے تو پھر چلے گا کیسے؟ اگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو اور راہِ شریعت سامنے نہ ہو تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا ہوا چلا جائے گا اور اگر اندر آگ نہ ہو اور شریعت کی لائن بچھی ہوئی ہے مگر چلنے کا جذبہ نہیں، عمل کا کوئی داعیہ نہیں ہے تو وعظ کہہ کہہ کر منت کر کر کے آپ کہاں تک چلائیں گے، آج کسی نے وعظ کہہ دیا نماز پڑھ لی پھر بیٹھ رہے برسوں کو پھر کسی نے تقریر کی دو تین دن نماز پڑھ لی پھر سست ہو گئے، اس طرح منزل مقصود تک تھوڑا ہی پہنچے گا وہ تو اندر داعیہ اور جذبہ ہونا چاہیے کہ ہزاروں روکنے والے ہوں پھر بھی نہ رُکے۔ تو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک سیدھی لائن وہ شریعت ہے اور ایک اندر آگ وہ اخلاق ہیں تو اخلاقی قوت چلنے پر آمادہ کرتی ہے اور راہ کی قوت سیدھے راستہ پر چلاتی ہے علم سیدھا راستہ ہے اور اخلاق یہ چلنے کی قوت ہے۔ محض علم منزل مقصود تک چلا سکتا تو بڑے سے بڑا عالم بن جائے مگر اندر اخلاق ہی درست نہ ہوں کبھی راہ شریعت پر نہیں چل سکتا اور اخلاق درست ہو جائیں مگر راستہ معلوم نہ ہو تو من گھڑت طریق پر چلے گا خود گمراہ ہوتا جائے گا اور لوگوں کو بھی گمراہی پہ ڈالتا جائے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳۔

گا اس لئے شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی ضرورت ہے شریعت راہ بتلائے گی اور طریقت اخلاق وقوت پیدا کرے گی۔

تعلیم وتربیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......اسی کیلئے اسلام میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں: ایک تعلیم جو علماء کرام مدارس میں بیٹھ کے سکھلاتے ہیں حلال وحرام یا جائز وناجائز بتلاتے ہیں۔ گویا راستہ دکھلاتے ہیں اور دوسرے تربیت جو صوفیائے کرام کرتے ہیں وہ قلب کے اندر قوت پیدا کرتے ہیں اور آگ لگاتے ہیں تا کہ اس کے زور سے آدمی آگے چلا جائے گویا قلب میں اتباع شریعت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

تو اگر آدمی نے پڑھ لکھ تو لیا مدرسہ میں جا کر تعلیم پائی مگر اخلاق درست نہ کئے، حرص وتکبر ایذ ارسانی اسمیں موجود ہے تو وہ علم اور زیادہ وبال بن جائے گا وہی علم مخلوق کو ستانے اور پریشان کرنیکا ذریعہ بنے گا۔ اور اگر اخلاق درست ہو گئے کہ نہ ایذاء رسانی کا جذبہ ہے نہ حرص وتکبر ہے، اچھے اخلاق ہیں مگر ان کو نمایاں کرنے کا راستہ سامنے نہیں ہے تو پھر بدعات میں گرفتار ہوگا، من گھڑت راہیں تجویز کرے گا، بناوٹی راہ ہوگی تو پھر بھی منزل مقصود تک نہ پہنچے گا۔ تو علم اور تصوف دونوں کی ضرورت ہے۔ شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی، تعلیم کی بھی ضرورت ہے اور تزکیۂ نفس کی بھی، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں چیزیں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے کیں، ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی آیات کی تعلیم دیتے تھے آیات کے مطالب بیان فرماتے تھے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال اور یہ حرام ہے اور دوسرے تربیت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال کی نگرانی کی کہ یہ کرتے کیا ہیں، راتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاگ جاگ کر دیکھتے تھے کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کیا عمل کر رہے ہیں دن کو دیکھتے تھے اور روک ٹوک ہوتی تھی۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگرانی شروع فرمائی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم عمل کیسے کرتے ہیں تو آپ نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں مگر اتنا آہستہ کہ کوئی کان لگا کے سنے تو مشکل سے سُننے میں آئے ورنہ تلاوت کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مکان میں زور زور سے تلاوت کر رہے ہیں، سارا محلہ ان کی آواز سے گونج رہا ہے۔ صبح کو جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ اتنا آہستہ قرآن شریف کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کر بھی مشکل سے سُنائی دیتا تھا؟ عرض کیا یارسول اللہ! میں تو اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب، ہر وقت حاضر وناظر ہے اور ہر وقت سننے والا ہے یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زیادہ شور مچانے کی کیا ضرورت تھی! میں غائب کو تھوڑا ہی سُنا رہا تھا میں تو شنوا اور دیدہ کو سنا رہا تھا، بہرے کو نہیں سنا رہا تھا تو مجھے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے عمر آپ اتنا چلا چلا کر قرآن کو کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا یَارَسُوْلَ اللہِ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ

الشَّیْـطَـانَ. میں اس لئے زور سے پڑھ رہا تھا کہ شیطان کو بھگا رہا تھا اور سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا کہ تم بھی قرآن شریف پڑھو اور نماز ادا کرو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ آواز کو کچھ اونچا کرو اور اے عمر! آپ آواز کو ذرا دھیما کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے ① تو یہ جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ قلب کی تربیت تھی اور قلب کا راستہ صحیح کرنا تھا کہ اعتدال کے ساتھ چلو تو جہاں آپ حلال وحرام بتلاتے تھے وہیں آپ قلوب کی راہ بھی درست فرماتے تھے تو جہاں آپ یہ فرماتے تھے کہ اس طرح نماز پڑھو، اس طرح روزہ رکھو، اس طرح حسن معاشرت سرانجام دو وہاں قلوب کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے وساوس کا علاج...... ان عملوں کے کرنے میں اگر وسوسے آنے لگیں اور اس سے عمل خراب ہونے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسوسوں کا علاج بھی فرماتے۔ حدیث میں ہے ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں اور اتنے آتے ہیں کہ بس انتہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا بیان کریں ایسے برے وسوسے آتے ہیں کہ زبان پر ہی لانے کو جی نہیں چاہتا! وسوسے یہ آتے ہیں کہ دل میں سوالات کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے دل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنایا آسمان کس نے بنایا؟ جواب دل سے یہ ملتا ہے کہ اللہ نے بنایا ہے چاند، سورج ستارے انسان اور حیوان کس نے بنائے؟ جواب ملتا ہے اللہ نے بنائے ہیں۔ ان سارے جوابات سے ہمارے ذہن میں ایک کلیہ بنتا ہے کہ ہر موجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے جو موجود ہوگا اس کا بنانے والا کوئی تو ضرور ہوگا۔ یہ سلسلہ جب دل میں آتا ہے تو دل میں یہ سوال بھی آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے اس کو کس نے بنایا؟ اللہ میاں کا خالق کون ہے؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ وہ بھی موجود ہے تو جب ہمارے دل میں یہ وسوسہ آگیا کہ اللہ کا خالق کون ہے؟ تو ہمارا ایمان کہاں رہا؟ اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل سے معطل ہوگئے، بعضوں نے عمل ترک کر دیا، کہ عمل کیا کریں جب ہمارے اندر ایمان ہی موجود نہیں، اس لئے کہ جب ہمیں یہ خیال آگیا کہ اللہ کا بھی کوئی بنانے والا ہے، خالق کا بھی کوئی خالق ہے، اب ایمان کہاں رہا؟ ایمان تو جب ہے جب یوں سمجھے کہ وہ سب کا خالق ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے وہ خود بخود ہے یہ ایک وسوسہ تھا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یا یہ سمجھے کہ ہمارے اندر ایمان نہیں رہا اور جب ایمان نہیں رہا تو عمل معطل ہوگیا تو عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو ایک روگ ہے کہ قلب کے اندر ایمان ہے ہی نہیں جب ایمان نہیں تو عمل بے کار ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلا دیا کہ ایمان موجود ہے اور اس کے موجود ہونے کی وجہ سے ہی تم وسوسوں کو برا جان رہے ہو۔ ②

---

① مسند احمد، ومن مسند علي بن ابي طالبؓ ج: ٢ ص: ٣٢٩ رقم: ٨٢٣.

② الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الوسوسة في الايمان، ج: ١ ص: ٣٢٥ ومسند احمد، مسند ابي هريرةؓ ج: ١٧ ص: ٦٨.

اگر ایمان نہ ہوتو ہزاروں وسوسے آتے ہیں آدمی کبھی ان کو برا نہیں سمجھتا بلکہ ان تخیلات کو یوں سمجھتا ہے کہ بڑی حکمت کی بات ہے جو میرے ذہن میں آئی، اس پر غرور اور گھمنڈ کرتا ہے کہ میرا خیال تو ایسا ہے کہ دنیا سے گزر کر خدا تک بھی پہنچ جاتا ہے آسمانوں تک بھی جاتا ہے تو وہ فخر کرتا ہے اس لئے کہ ایمان ندارد ہے مگر چونکہ ایمان ہے اس لئے تم ان وسوسوں کو برا جان رہے ہو یہ کیسے خیال گزرا کہ ایمان نہیں رہا یہ سن کر ایسا ہو گیا جیسے پردہ اٹھ جاتا ہے اور معلوم ہوا کہ ایمان ہے ہمارا خیال غلط تھا۔

لہٰذا ہمیں عمل کرنا چاہیے عملی زندگی پھر ویسی بن گئی جیسے پہلی تھی ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ تو دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی، دل کی راہ درست کردی وسوسے نکال کر آپ نے ایک سیدھی راہ دکھلادی۔ اصطلاحِ شریعت میں اسی کا نام "تزکیۂ نفس" ہے یعنی نفس کو مانجھ کر برے تخیلات اور برے وسوسوں سے صاف کرنا بعضے وسوسے ایمان کو کھودیتے ہیں بعضے آدمی کو اعمال سے بیکار بنادیتے ہیں بعضے نیکی سے ہٹادیتے ہیں ان وسوسوں کا قلب سے نکالنا یہ محض علم کا کام نہیں ہے کہ جائز وناجائز بتلادیا جائے بلکہ یہ تربیت کا کام ہے صرف ہمت کا کام ہے کہ دلوں کو صحیح راستوں کے اوپر لگانا، زبان سے، اعمال سے، دعا سے اور ہمتیں باندھنے سے۔ یہ چیز تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔

تعلیمِ خداوندی کے بغیر خدا تک رسائی ممکن نہیں ...... تو دو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھیں ایک تعلیم اور دوسرے تربیت، تعلیم سے علم پہنچایا، تربیت سے قلوب کے اندر قوت پیدا کی۔ اس قوت سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم چلتے تھے اور صحیح لائن پر چلتے تھے تو منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے اب ظاہر بات ہے کہ جب قوم میں علم نہ رہے تزکیہ نفس نہ رہے، تربیت اخلاق نہ رہے، علم کا نام بھی صفر ہو جائے کہ مسائل کا علم نہ ہو اخلاقی راہیں بھی بند ہو جائیں، یہ الگ چیز ہے کہ اپنی نیکی یا سلامت روی سے آدمی گناہوں میں مبتلا نہ ہو، مگر جب تک تعلیم نہ پائیں راستہ تو نہیں کھل سکتا، اور اللہ تک پہنچنے کا راستہ تو جب تک اللہ ہی کی طرف سے تعلیم نہ ہو جب تک انسان خدا تک کیسے پہنچے گا؟ اور جب اس راستہ پر چلنے کی قوت جو کہ اخلاقی قوت ہے وہی نہ ہو تو آدمی چلے گا کیسے؟ اگر ہر آدمی ایسا بن جائے دوسرے لفظوں میں قوم کی قوم ہی ایسی ہو جائے۔ تو اندازہ کیجئے کہ قوم کتنا گرے گی کتنا پست ہو گی اور اس پر اغیار کس طرح سے مسلط ہوں گے اور کس طرح سے وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو گی تو پریشانیوں کا ایک علاج تو مادی ہے جو کہ اسباب کے درجہ کی چیز ہے اس سے انکار نہیں وہ اپنی جگہ ہونا چاہیے وقتی تدبیریں ہونی چاہئیں انسان کرتا ہے لیکن بڑی تدبیر، ان چھوٹی تدبیروں کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ نگاہ خدا پر رہے، توکل اور بھروسہ اسی پر ہو تو پھر اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اگر انسان اپنے بل بوتے پر تدبیر کرے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہو تو مدد نہیں آئے گی فرمائیں گے حق تعالیٰ تو ذمہ دار ہے جو تیرا جی چاہے کرتا رہ لیکن اگر آدمی ساری تدابیر کرنے کے بعد اللہ پر معاملہ کو چھوڑ دے کہ اے اللہ! میرے کرنے کا کام اتنا تھا میں نے کرلیا اب آگے آپ

جائیں آپ کا کام جانے تو پھر غیب سے مدد شروع ہو گی کہ جتنا انسان کی استطاعت اور قدرت ہے وہ تدبیر کر کے بالآخر اللہ کی طرف رجوع کرے، تبھی حق تعالیٰ سے معاملہ صاف ہوتا ہے تدبیر تو اتنی ہی کرے گا جتنی اس کی قوت ہے لامحدود قوت تو نہیں ہے کہ ساری تدبیریں کر جائے جتنی بساط ہے اسی قدر تدبیر کر کے بالآخر اسے اللہ کے حوالہ کرے گا جس کی قوت لامحدود ہے اور اخیر تک کی بات کو جانتا ہے اس کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔

بساط کے مطابق جدو جہد ضروری ہے...... حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو بادشاہ وقت نے اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف (اور مرضی الٰہی کے مطابق) فتویٰ دیا تھا تو حکم دیا کہ شیخ کو جیل بھیج دو۔ جیل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ جہاں جمعہ کا دن آیا تو صبح سے غسل کی تیاری کرتے تھے غسل کیا اور جیل میں جو بھی ان کے کپڑے تھے خود دھو کے صاف کر لیتے اور جب جمعہ کی اذان ہوئی تو جمعہ کی نماز کیلئے چلتے، مگر جیل کا دروازہ بند ہے، دروازہ کے قریب پہنچ کے واپس آتے اور آ کے ظہر کی نماز پڑھ لیتے۔ ہر جمعہ کو حضرت شیخ کا یہی معمول تھا لوگوں نے عرض کیا جب آپ کو معلوم ہے کہ آپ باہر نکل نہیں سکتے آپ کی قید کی مدت ختم نہیں ہوئی تو آپ پر جمعہ واجب ہی نہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ جمعہ کی نیّت سے کپڑے بدلیں اور پھر جمعہ کے قصد سے چلیں دروازہ پر پہنچیں تالے کو ہاتھ لگا کے واپس آئیں اور آ کر ظہر پڑھیں آپ پہلے ہی نماز ظہر کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ فرمایا کہ میں بھی یہ جانتا ہوں کہ میں تالا نہیں کھول سکتا، جیل سے باہر جا کر جمعہ کی نماز ادا نہیں کر سکتا مگر جمعہ کی ادائیگی میں جتنا میرے امکان اور قوت میں ہے اتنا تو فعل ادا کر دوں، اور جہاں میری قوت سے خارج ہو میں اللہ کے حوالہ کر کے چلا آؤں اور یہ عرض کر دوں کہ یا اللہ جیل کے دروازے تک آ جانا تو میری قوت میں تھا وہ میں نے کر لیا اب آگے میری قوت سے خارج ہے آگے آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ آپ کر دیں میری نیت تو یہی ہے کہ میں آپکے حکم کی تعمیل کروں میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

شیخ الہندؒ کا جذبہ...... تو یہ صورت ہونی چاہیے کہ جتنی تدبیر بس میں ہو اتنی کر لینی چاہیے اس سے آگے اللہ پر چھوڑ دے کہ یہ آپ ہی کے قبضہ میں ہے آپ ہی کرنے والے ہیں۔ حضرت شیخ الھند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ مجھے یوں حکم دیں کہ! اے محمود حسن! تم آسمان پہ چلے آؤ تو ظاہر بات ہے کہ انسان تو آسمان پر نہیں پہنچ سکتا لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نہیں پہنچ سکتا میں کہوں گا حاضر ہو رہا ہوں اور آسمان پر پہنچنے کیلئے یہ تجویز کروں گا کہ جو دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہے اس پر جا کے چڑھوں، چاہے مجھے دس مہینے کا سفر کرنا پڑے، اور اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو سب سے اونچا درخت ہو گا اس پر چڑھوں گا اس کے اوپر چڑھ کے عرض کروں گا یہاں تک تو میرے قبضہ میں تھا آگے میرے بس میں نہیں اب آپ مجھے آسمان پر پہنچا دیں تو فرمایا کہ گھر بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ میں آسمان پر کیسے پہنچوں گا جتنا آدمی کے بس میں ہو اتنا کرے آگے اللہ کے حوالے کرے۔

تو یہی صورت دین اور دنیا کی تدبیروں میں ہوتی ہے کہ جتنا انسان کے بس میں ہے وہ تدبیر کرے اور اس کے

بعداللہ کے حوالہ کرے اپنے کو اپنا ذمہ دار نہ سمجھے کہ سارے کام میں اپنی تدبیر سے نکال لوں گا ہر جگہ انسان کی تدبیر نہیں چلتی جہاں چلتی ہے انجام دے لے۔ نماز کا حکم ہے فرض کیجئے آپ خدانخواستہ مسجد میں جانے سے معذور ہیں تو دروازے تک چلیں آگے چلنے سے معذوری کا اظہار کردیں کہ یا اللہ آگے نہیں چل سکتا تو جتنی قوت تھی وہ تو آپ نے صرف کردی لیکن اگر چارپائی پر بیٹھ کر ہی کہہ دیں کہ میں تو مسجد تک نہیں جاسکتا، یہ معتبر نہیں ہوگا۔ اپنی بساط کے مطابق جدوجہد ضروری ہے۔ تو دین کی پیچیدگیاں ہوں یا دنیا کی مشکلات جتنی جدوجہد اپنے سے بن پڑے اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر اسکو انجام دیا جائے ازاں بعد اللہ کو برتر سمجھا جائے اور ان کے سامنے عرض کردے کہ میں تو اتنا کرسکتا تھا، آگے آپکے بس میں ہے آپ کو قدرت ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سکھلایا جہاں تک ان کے بس میں تھا وہ جدوجہد کرتے تھے، جان تک دینے میں دریغ نہیں کرتے تھے غرض قوم جب بھی دینی اور دنیوی مشکلات میں مبتلا ہو تو سب سے پہلے قرآنی تعلیمات کی روشنی کی طرف رجوع کیا جائے قرآن حکیم ایسی مشکلات میں کیا حکم دیتا ہے؟ اس کو پڑھا جائے، پڑھنے والوں سے سنا جائے، ان کے سامنے معاملے کو رکھا جائے، دنیوی معاملہ ہو یا اخروی۔ آخر حضراتِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کس طرح کامیاب ہوئے؟ تو تدبیریں تو لکھی پڑی (موجود) ہیں وہی ہمیں حاصل کرنی چاہئیں، اگر دل کے اندر الجھن ہے عبادت کا راستہ اختیار کرے، اگر دنیا کی الجھن ہے صحیح معاشرت کا راستہ اختیار کرے، روحی الجھن ہے تو اخلاق کی پاکیزگی کا راستہ اختیار کرے مگر ہر ایک کی کچھ تدبیریں ہیں نہ گھر بیٹھے اخلاق درست ہوتے ہیں اس کیلئے بھی کچھ محنت کرنی پڑتی ہے نہ گھر بیٹھے عبادات ہوتی ہیں ان کے لئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں نہ گھر بیٹھے معاشرت درست ہوتی ہے اس کیلئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں تو ساری تدبیریں قرآن کریم میں بتلا دی گئی ہیں اور جامع تعلیم دی گئی ہے۔

غیر مسلم اقوام کا اعتراض...... اسلام پر تو دشمنوں کا الزام ہی یہ تھا کہ یہ بہت بڑا جامع مذہب ہے اسمیں ہر قسم کی ہدایت موجود ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر مکہ کے ایک مشرک نے طعن کیا اور کہا کہ تمہارا نبی تمھیں ہر قسم کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ ہگنا اور موتنا بھی سکھاتا ہے گویا تحقیر کے ساتھ کہا کہ دین میں تو بڑی بڑی باتیں ہونی چاہیے تمہارے دین میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں۔ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر تعجب کیا ہے بے شک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں ہر ہر چیز سکھلاتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب تک ہمیں بتلاتے ہیں جو بہت حقیر چیز ہے مگر اس کی بھی تعلیم دی ہے، **نَهَانَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ وَلَا بِبَوْلٍ** ① ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم استنجاء کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کر کے بیٹھیں **وَنَهَانَا اَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ** ② اور استنجاء کیلئے ہم تین ڈھیلے

① الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الاستطابة، ص: ۲۲۳ رقم: ۶۰۶. ② ايضاً.

لیں سنت طریق یہی ہے اس سے کم نہ لیں، جس ملک میں ڈھیلا نہ ہو انہیں جو چیز بھی استعمال میں آسکتی ہے وہی استعمال کی جائے، بعض جگہ کاغذ استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی زیر بحث ایک مسئلہ ہے کہ کاغذ سے استنجاء کیا جائے یا نہیں جائز ہے یا ناجائز منشاءِ سوال یہ ہے کہ کاغذ کے اوپر تو علم کی باتیں، قرآن اور حدیث بھی لکھا جاتا ہے، کیا اس کو آلودہ کیا جائے؟

کاغذ بھی مختلف طریقوں سے بنتے ہیں، بعض کاغذ بنائے ہی اس مقصد کیلئے جاتے ہیں کہ وہ استنجاء کرنے میں کام آئیں اور جن جگہوں یا مواقع پر پانی بھی موجود نہ ہو مٹی بھی موجود نہ ہو تو اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔ تو جو کاغذ ہی اسی کیلئے مخصوص ہوں انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کپڑے ہیں بعضے کپڑے پہننے کے ہیں، بعضے اوڑھنے کے لئے ہیں، بعض بچھانے کے لئے ہیں جو بچھانے کیلئے ہیں انہیں پہن نہیں سکتے ! جو پہننے کے لئے ہیں انہیں بچھا نہیں سکتے ،اپنے اپنے موقع پر انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے تو غرض سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا بے شک ہمارے نبی کریم ہمیں ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب بھی بتلاتے ہیں تو دین اسلام پر تو اعتراض ہی یہ تھا کہ وہ بڑا جامع مذہب ہے ہر چیز کی تعلیم اس میں موجود ہے تو ایسے جامع دین کی قوم ہو اور وہ عاجز آئی ہوئی ہو کہ ہم کیسے راستہ طے کریں حالانکہ سارے راستے بتا دیئے گئے ہیں، وجہ یہ ہے کہ تعلیم پاتے ہیں اور نہ علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اسلام کو مٹانے کے ذمہ دار مسلمان خود ہیں...... دنیا میں کوئی مذہب باقی نہیں رہ سکتا جب تک اس کی تعلیم باقی نہ رکھی جائے جس مذہب کی تعلیم مٹ جاتی ہے وہ مذہب بھی باقی نہیں رہتا یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اسلام کو ابدی مذہب بنایا ہے جو قیامت تک مٹنے والا نہیں ہے لیکن ہم نے اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس لئے کہ جب اسکی تعلیم کو سرے سے ختم کر دیا جائے اور مذہب کی بقاء تعلیم پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے ختم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ طبقات ایسے ضرور رہیں گے جو علم اور اخلاق کو محفوظ رکھیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَاذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللہِ** ① میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہیگا ایک جماعت حقہ رہے گی جو وہی کہتی رہے گی جو میں کہہ رہا ہوں، اور وہی کام کرے گی جو میں کر رہا ہوں، وہی عقیدہ رکھے گی جو میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ تو قیامت تک ایک جماعت ضرور قائم رہے گی جو امر حق کو پہچانتی رہے گی یہ بھی فرمایا کہ فرقے پیدا ہونگے اور اختلافات بھی پیدا ہونگے متعدد جماعتیں بھی ہوں گی، مگر ساتھ ساتھ ایک حق کا طبقہ بھی رہیگا تو دین نہیں مٹے گا اصلیت ہمیشہ قائم رہے گی جہاں گمراہ کرنیوالے ہوں گے وہاں ہدایت بخشنے والے بھی ہوں گے۔ تو یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دین ختم نہیں ہوگا مگر اسباب کے درجہ میں ہم نے اس کے ختم کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تو یہ ہماری کوتاہی ہے حق تعالیٰ شانہ نے جو وعدہ دیا ہے کہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی تو پھر ہمارا فرض ہے کہ اسی

① السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ما جاء في الأئمة المضلين ج: ٨ ص: ١٧٢.

جماعت حقہ کی پیروی میں ہم بھی قرآن وحدیث اور فقہ کی صحیح تعلیم حاصل کریں تا کہ امت مسلمہ اپنے مزاج کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

مسلم اقوام اپنے مزاج پر چل کر ترقی کر سکتی ہیں......دنیا کی ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہود ونصاریٰ کا ایک مزاج ہے، مشرکین کا ایک مزاج ہے، مسلمانوں کا بھی ایک مزاج ہے یہ جب بھی ترقی کریں گے اپنے مزاج کے مطابق چل کے کریں گے۔ اگر ایک قوم دوسری قوم کی نقالی کرنے لگے کہ جیسے آج کا مزاج ہے میں بھی اس طریق پہ چلوں وہ نہیں چل سکے گی، اس لئے کہ طبعی طور پر اس کا مزاج یہ نہیں ہے تو ہر ایک قوم کو اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اگر دوسرے کی بنیاد پر آپ نے تعمیر اٹھائی تو وہ کل کو کہہ سکتا ہے کہ اپنا ملبہ اٹھا کے لے جاؤ زمین میری ہے بنیاد میری ہے اس لئے اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اپنی قومی تعمیر اپنی ہی خصوصیات پر ہو جو اسلام نے بتلائی ہیں اور وہ بغیر علم کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ تو دنیا میں جامع ترین مذہب اسلام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں اس نے مکمل تعلیم دی ہے کھانے، پہننے اور سونے کے اس نے طریقے بتلائے ہیں رہن سہن کے ڈھنگ بتلائے ہیں، صلح وجنگ کے طریقے بتلائے ہیں، حکومت کرنے کے طریقے بتلائے ہیں، نظام ملت کے طریقے بتلائے ہیں مگر وہ جبھی تو سامنے آئیں گے جب آدمی علم حاصل کرے۔ حدیث کے ہزاروں ابواب ہیں، فقہ کے ہزاروں ابواب ہیں، ہر باب میں زندگی کے موڑوں کا تذکرہ ہے، عبادت معاشرت اور سیاست کے الگ الگ باب ہیں، مقدموں کے فیصلہ کرنے کا باب الگ ہے، جنگ وجہاد کا الگ ہے، کھیل کا باب الگ ہے جس باب کو آپ کھولیں گے اسمیں مفصل احکام نکلیں گے، تو جامعیت جبھی پیدا ہوگی، جب آدمی اس کی تعلیم پائے، تربیت حاصل کرے۔

حصول تعلیم وتربیت کا سہل طریقہ......اور تعلیم پانے کا طریقہ ظاہر بات ہے کہ علماء کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس عالم نہیں ہے تو آپ کہیں سے بلائیں اور اس سے تعلیم حاصل کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم میں سے چند افراد دوسری جگہ بھیجیں تا کہ وہ علم حاصل کر کے آئیں اور آ کر اپنی قوم کی اصلاح کریں تو خواہ باہر سے کوئی عالم آئے یا اپنے میں سے بھیج کر اسکو عالم بنوائیں دونوں صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ میں تو کہتا ہوں ہر خاندان اور گھر میں اگر پانچ بچے ہوں تو آپ چار کو دنیوی تعلیم پڑھوائیں اور کم از کم ایک کو دینی تعلیم کیلئے وقف کر دیں اگر گھر میں ایک بھی دین کا جاننے والا ہوگا وہ سب کی اصلاح کر دیگا اور راہ درست کر دے گا، لیکن اگر گھر کا گھر ہی غلط راستہ پر پڑ گیا تو پھر اصلاح کی توقع مشکل ہوگی، تو ایک کو کم از کم ایسا ضرور رکھیں جو دینی تعلیم کا حامل ہو یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر ہر شخص عالم بنے لیکن "ضروریات دین" کا علم حاصل کرنا تو ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، روزمرہ کے دینی اعمال، فرائض پنجگانہ، زکوٰۃ، حج اور روزہ یہ فرائض ہیں ان کا علم ہونا فرض ہے اسی طرح یہ کہ میں مسلمان کیوں ہوں؟ مسلمان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اسلام وایمان کے معنی کیا ہیں؟ نیکی اور اخلاق کے کیا معنی ہیں؟ یہ اجمالی باتیں تو ہر ایک پر فرض ہیں لیکن تفصیلی طور پر عالم

بنانا یہ ہر ایک پر فرض نہیں ہے یہ تو سو میں ایک بھی بن گیا تو انشاء اللہ وہ سب کی اصلاح کر دے گا پانچ سو میں سے ایک ہی ہو جائے تو کافی ہے ایک خاندان میں ایک عالم بھی ہو جائے تو سب کی اصلاح کر سکے گا۔

قومی مشکلات کا اجمالی حل......تو جناب رسول اللہ نے اپنا وظیفہ یہی بتلایا کہ ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور ''بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ'' میں اخلاق کی تکمیل کیلئے آیا ہوں۔ تو یہی فریضہ اُمت کا بھی ہونا چاہیے کہ امت معلم بنے، اپنے لئے بھی اور غیروں کے لئے بھی، مربیِ اخلاق بھی ہو، اپنے لئے بھی اور غیروں کیلئے بھی۔ اس کے ہاں مدارس بھی ہونے چاہئیں اور اس کے ہاں تربیت گاہیں بھی ہونی چاہئیں، مدارس کے ذریعہ سے علم پھیلے گا اور تربیت گاہوں کے ذریعہ اخلاق درست ہوں گے۔ تو پوری قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کرے جن کے ذریعہ دینی معلومات حاصل ہوں اور وہ پڑھیں اس انداز پر کہ قوم کے ایک ایک بچے کو ضروریاتِ دین کا علم ہو جائے برس دن میں ہو، چھ مہینے میں ہو، دو برس میں ہو مگر وہ لگیں اور اتنا علم ضرور حاصل کر لیں۔ اور بڑا علم حاصل کرنے کے لئے بڑے مدارس ہیں وہاں بھیج دیا جائے پوری بستی میں سے، پورے گاؤں میں سے ایک آدھ چلا جائے کافی ہے اور وہ یہاں آ کر اصلاح کرے، تو اسکے بغیر قوم کی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں، یہ گویا ایک اجمالی تدبیر ہے، تفصیلات تو اسکی زیادہ ہیں کہ مشکلات کی نوعیت کیا ہے اس کا علاج کیا ہونا چاہیے؟ جس قسم کی مشکل ہے تو اسی قسم کا علاج پوچھا جائے وہ تو ہے لمبا قصہ وہ تو جبھی ہو گا جب کوئی معلم و مربی سامنے ہو اور وہ مشکلات اس کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اس کا حل بتائے، جزوی طور پر بالا جمال یہی ہے کہ تعلیم سے علم ہو اور تربیت سے اخلاق ہوں تو قوم پلٹ جائے گی بہت سی مشکلات کا حل تعلیم سے ہوتا ہے بہت سی مشکلات کا حل نیکی تقویٰ اور نیک اخلاقی سے ہوتا ہے تو حل ہو جائے گا۔

تو میں نے اس لئے یہ دو حدیثیں پڑھی تھیں کہ انبیاء قوموں کی مشکلات رفع کرنے کے لئے آتے ہیں اور سید الانبیاء بھی اپنی قوم کی اور اپنی امت کی مشکلات ہی رفع کرنے کے لئے تشریف لائے، اور تشریف لانے کی غرض وغایت دو باتیں ظاہر کیں تعلیم دینا اور تربیت کرنا، اس سے خود بخود نکل آیا کہ مشکلات کا حل انہی دو چیزوں کے اندر ہے تعلیم و تربیت میں۔ آپ نے تعلیم و تربیت کی تو اس قوم کیلئے حل نکل آیا جو صدیوں سے مشکلات میں مبتلا تھی اور اس کے بعد بھی یہی ہوتا رہا کہ جب امت پر مصائب پڑے جبھی کوئی اہل علم کھڑا ہوا جبھی علم نے راہنمائی کی جبھی اخلاق نے راستہ دکھایا اور چلایا تو قوم کی مشکل حل ہو گئی آج بھی اسی طرح مشکل حل ہو گی۔

یہ چند باتیں تھیں جو اس وقت ذہن میں تھیں وہ میں نے عرض کیں ان دو حدیثوں کو پیش نظر رکھا جائے جتنا آپ سوچیں گے، انشاء اللہ اس میں سے مشکلات کا حل نکلے گا اللہ تعالیٰ ہماری ساری مشکلات کو رفع فرمائے اور حق تعالیٰ شانہ ہمارا راستہ درست فرمائے، علم و عمل کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے اخلاق درست فرمائے، آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

قرآن حکیم کی عملی تفسیر

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــا بَعْــــدُ!

جہانوں کا دستورِ حیات...... بزرگانِ محترم! سرکارِ دوعالم فخر بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری وباطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، وہ کسی شخص واحد کا دستورِ زندگی نہیں، بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا انسانی زندگی کی دشواری اور ہمواری کے لئے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نا معلوم کہاں تک جا پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین وآسمان اور فضاء وخلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اس کے تدین کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم واصلاح کے لئے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون واطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

ذاتِ نبوی میں علوم قرآنی کا ظہور...... اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ① کے بارے میں جب حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ علیہ السلام کی اس خلق عظیم کی سیرت واخلاق کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ ② آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق وسیرت قرآن ہی تو ہے اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحب سیرت علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ: وَلَا تَنْقَضِيْ

① پارہ: ۲۹، سورة: القلم، الآية: ۴. ② مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضى الله عنها ج: ۵۰ ص: ۱۱۶.

عَجَائِبُهٗ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ ① اس قرآن کے عجائبات (علوم ومعارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دل اکتا جائیں)۔

اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منتہی ہونے والے نہیں فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں لامحدود عجائبات علمی ہیں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں گویا ایک علمی قرآن ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے پر من وعن منطبق ہیں پس قرآن کا کہا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے، اس لئے قرآن حکیم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرتِ مقدسہ کے عملی پہلو ہیں۔ پس قرآن میں جو چیز ''قال'' ہے وہی ذات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ''حال'' ہے اور جو قرآن میں نقوش ودال ہیں وہی ذات اقدس میں سیرت واعمال ہیں، اسی لئے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس لئے قرآن حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ علیہ السلام کے عقائد ہیں۔ اور احکام کی آیتیں آپ علیہ السلام کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا استدلال ہیں۔ اور تشریع کی آیتیں آپ کا حال، قصص وامثال کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں۔ اور کبریائے حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی نیابت۔ اخلاق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی حسن معیشت ہیں۔ اور معاملات کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حسن معاشرت۔ توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلوت ہیں۔ اور تربیتِ خلق اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی جلوت۔ قہر وغضب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جلال ہیں۔ اور مہر ورحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جمال، تجلیات حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ اور ابتغاءِ وجہ اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مراقبہ۔ ترکِ دنیا آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ احوالِ محشر کی آیتیں آپ علیہ السلام کا محاسبہ۔ نفی غیر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی فنائیت ہیں۔ اور اثبات حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی بقائیت۔ انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں۔ اور ھُوَ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی غیوبت۔ نعیمِ جنت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا شوق۔ اور جحیم نار کی آیتیں آپ علیہ السلام کا ھم وغم۔ رحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کی رجاء ہیں۔ اور عذاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا خوف، انعام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا سکون وانس ہیں۔ اور انتقام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حزن، حدود وجہاد کی آیتیں آپ علیہ السلام کا بغض فی اللہ۔ نزول

① شعب الایمان للبیهقی، ج:۴، ص: ۴۹۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفیه مسلم بن ابراهیم الهجری وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۷ ص: ۱۶۴. امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه لصالح بن عمر دیکھئے: المستدرک للحاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن جملة ج:۵ ص: ۱۰۴.

وحی کی آیتیں آپ علیہ السلام کا عروج ہیں۔ اور تعلیم وتبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذِ اوامر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلافت ہیں۔ اور خطاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کی عبادت ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کسی بھی نوع کی آیت ہو وہ آپ علیہ السلام کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقامِ نبوت کی تعبیر ہے اور آپ علیہ السلام کی سیرت اس کی تفسیر، جس سے صدیقہؓ کے اس زریں مقولہ وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ ① سے قرآن اور ذاتِ اقدس کی کامل تطبیق اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے اگر قرآن کے علمی عجائبات بھی کبھی ختم نہیں ہوسکتے تو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اگر قرآن علمی طور پر تا قیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامع بھی تا یوم حشر اپنے شاخ در شاخ عملی اسوؤں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

سیرت کی بنیاد...... اس توجیہ واستدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے، جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اس لئے اگر قرآن حضور علیہ السلام کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لئے کتبِ حدیث کے ہزاروں ابواب وفصول درحقیقت سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب وفصول ہیں جن میں سے گزر کر ہی آدمی اقلیم سیرت میں داخل ہوسکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن وحدیث سیرتِ مقدسہ کی تعبیر ہیں۔ اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن وحدیث کے مضامین کی ترتیب میں اولیت ایمان وعقائد کو اور پھر عبادات کو دی گئی ہے۔ فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق، پھر اس کی ربوبیتِ عامہ، پھر رحمتِ عامہ، اور پھر مالکیتِ عامہ اور پھر عبادت واستقامت سے شروع کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کو لو تو اس کی ابتداء بھی ایمان بالغیب اور نماز وانفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے۔ بہر حال قرآن میں اولیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے اسی طرح عموماً کتب حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب وفصول کی ابتداء ہے کتاب الایمان، پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، اور کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف پھر مسائلِ معاش، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، ملازمت اور پھر ان معاملات کے نفاذ کے لئے قضا، تعزیرات وکفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لئے آخر میں خلافت وامارت اور جہاد وسیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب ہیں۔ لیکن اس ترتیبِ نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات

① مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضي الله عنها ج: ٥٠ ص: ١١٦.

نا ئبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ، شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَحَجِّ الْبَيْتِ اِنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ①

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر استطاعت ہو۔ جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرۃ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں اور انتظامی اور سیاسی ابواب اس کے محافظ ہیں جو بعدیت کا درجہ رکھتے ہیں کہ یہ بروتقویٰ اور دیارِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظامِ سیرتِ نبوی میں رخنہ ڈالنے کی جرآت نہ ہو۔ قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت ودیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اس کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی سلطنت دیدیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ دین ودیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد وجنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی...... دی گئی ورنہ نہیں دی گئی۔ حضور پاک علیہ السلام نے بھی اعلان نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تربیت دی، وہ یہی ایمان باللہ، مبداومعاد، توحید ورسالت اور سزاء وجزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کیلئے عبادت وریاضت اور زہد وتقوی کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

سیرتِ مقدسہ کا اساسی رنگ...... اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادات اور تقدس ہے اور وہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے یعنی اس کا طبعی رخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادت انجام دیں جن میں رضائے الٰہی ویادِ خداوندی کی روح کارفرما ہو وہ کچھ بھی کریں اللہ کے لئے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کی بجائے ربانی راہ اختیار کریں اور ان کا ہر عمل مجاہدہ وجہاد یعنی عبادت ہو، عادت نہ ہو جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب قول النبي ﷺ بني الاسلام علىٰ خمس، ص: ۲ رقم: ۷.

② پاره: ۱۷، سورة الحج، الآية: ۴۱.

اعلائے نفس نہ ہو، حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیل پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا: ﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُكِیۡ وَمَحۡيَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾ ① کہہ دو ابراہیم کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العٰلمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس کا امر کیا گیا ہے اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔ یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ علیہ السلام نے اپنی دعاء میں کھولا ہے، فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسۡلَمۡتُ وَبِكَ اٰمَنۡتُ وَعَلَيۡكَ تَوَكَّلۡتُ وَبِكَ خَاصَمۡتُ وَاِلَيۡكَ حَاكَمۡتُ وَاِلَيۡكَ اَنَبۡتُ وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ② اے اللہ میں تیرے ہی لئے اسلام لایا اور تیرے اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حَکَم مانا اور تیری ہی طرف میں جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا ہے تو تفویض کے عجیب عجیب عنوانات ان کی زبانوں پر جاری ہوتے ہیں حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے پھر وہی پڑھ کر سجدہ میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہ ہیں:۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ، نہ کونین توئی ۔۔۔ از بہر تو میرم واز برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہمہ وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکر الٰہی تفویض مطلق اور عبادات خداوندی کی روح تھی، گویا اسی کے لئے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا تھا کہ اس میں یہ ذکر وفکر کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کی پاک زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکر آخرت سے بھرپور تھا۔ ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ "كَانَ يَذۡكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحۡيَانِهٖ" ③ آپ علیہ السلام ہر لمحہ ذکرِ الٰہی میں لگے رہتے تھے اور فکرِ دائمی کے بارے میں ارشاد حدیث ہے کہ كَانَ دَائِمَ الۡفِكۡرَةِ حَزِيۡنًا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔ ④

سیرتِ طیبہ کی روح ...... پس آپ علیہ السلام کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ

---

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الجمعۃ، باب التہجد باللیل ص: ۸۷ رقم: ۱۱۲۰۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الرجل یذکر اللہ تعالیٰ علی غیر طہر ج: ۱ ص: ۲۷۔
④ الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ ﷺ متواصل الاحزان، ج: ۱ ص: ۲۵۵ رقم: ۲۲۳۔

غلبہ وقہر تھی نہ تسلط واستیلا، نہ تعیش تھی نہ تزئین، نہ آرائش تھی نہ زیبائش، نہ راحت طلبی وآسائش...... بلکہ سرافگندگی، نیاز کیشی، عبودیت اور طاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی کی نقل وحرکت تھی وہ اسی فکرِ دائمی اور ذکرِ دوامی کے رنگ میں تھی۔ قرآن حکیم نے اسی ذکر وفکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور ''اولوالالباب'' یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① (دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔

پس قرآن حکیم کی رو سے محض مفکر بھی دانش مند نہیں جب کہ وہ ذاکر نہ ہو اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جب کہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی عقل بھی ہو، اور عشق بھی ہو محبت بھی ہو اور ہوش بھی۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی، وہیں آپ علیہ السلام کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیفۂ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی کر رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصلہ فرما رہے ہیں، جہاد کے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کر رہے ہیں، حدود وقصاص کا اجراء بھی ہو رہا ہے، فتوحاتِ ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے، صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر صحنِ مسجد میں ذکر اللہ اور فکرِ آخرت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادت الٰہی کے رنگ میں تھا، ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اس میں کار فرما تھی اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسب حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان وعبادت اور ذکر وفکر تھا جس میں عقل وعشق، محبت وبصیرت، مادیت اور ملکیت، امارت ومسکنت، خلافت وعبادت کا کامل اجتماع اور امتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے فکر نہیں بنا سکتی تھی حتیٰ کہ آپ علیہ السلام غزوات اور جنگوں میں بہ نفسِ نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ قیادت بھی فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں ادا ہوتی تھی۔ عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ علیہ السلام لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جب کہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی۔

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۱.

آ گیا عین لڑائی میں گر وقت نماز ۔ قبلہ رو ہوکے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان وعبادت تھا جس کے لئے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی ہوتی تھی۔

سیرت جامعہ کا عجیب خلاصہ......اب اس سیرت جامع کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ یہ سیرتِ مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے ❶ تعلق مع اللہ ❷ تعلق مع الخلق ❸ تعلق مع النفس۔

تعلق مع النفس کے سلسلہ میں پاکدامنی وپاک نفسی، عفت وعصمت، حیاء وانکساری، غیرت وحمیت، ہمت وشجاعت، صبر وسماحت، حلم وضبط، اعتماد وتوکل، زہد وقناعت، مجاہدہ وریاضت، تحمل شدائد ومصائب اور خداترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاق حمیدہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فطرتِ صالحہ کا خمیرہ تھے۔

اور تعلق مع الخلق کے سلسلے میں خدمتِ خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت، اعانت، جود وسخا، ایثار وعفو، راحت رسانی اور کف اذیٰ (ایذاء رسانی سے بچنا)، عفو ودرگذر، محبت وشفقت وسوزی وہمدردی، تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

اور تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت وریاضت، مجاہدہ ومراقبہ، کسرِ شہوت ولذت، تقرب وانابت، توبہ واستغفار، تہجد وشب بیداری، ذکر وفکر وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔ لیکن ان تینوں تعلقات میں "تعلق مع اللہ" ہی دونوں تعلقات کی استواری کی روح تھی جو نفس وخلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے اگر نفس انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔

از روئے مشاہدہ سیرت طیبہ کی ضرورت......آج بھی جو اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں تو طرح طرح کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ وفساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔ آج یورپ میں عقل وفہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور ان کی تدابیر کی کمی نہیں حتیٰ کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لئے متحدہ کونسل یو، این، او (U.N.O) بھی قائم ہے جس میں رات دن ممالک کے باہمی معاملات زیر غور آتے رہتے ہیں، خانگی زندگی کے لئے تربیتوں کے بے انتہاء ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لئے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود انہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ ہی واضح ہوا ہے کہ گھر اور باہر سے سکھ اور چین مفقود ہے۔ یہی نفوس کہ جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، امن واطمینان کی ہوا تک سے کوسوں دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لئے نہیں کہ فقدانِ اسباب ہے۔ اسباب تو سب مہیا ہیں بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خداپرستی، خوفِ آخرت اور مالک

الملک کے سامنے جوابدہی کا فکر معدوم ہے۔ اعتقاداً یا عملاً جو ان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا جس سے ان نفوس میں یہ جذبۂ انقیاد واتباعِ حق کے بجائے خودرائی اور خودبینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں۔ مدارِ کار غرورِ نفس ہے، یقینِ حق نہیں جس کے تحت خودغرضیوں اور قومی، نسلی اور وطنی تعصبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی، سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وباءِ سکون وامن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا ان کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھارہی ہے لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات لئے ہوئے اور ان کی جبری قیادت کا جواء بھی سروں سے اتار پھینکنا چاہتی ہے یہ محبوبیت کا فقدان اسی خداپرستی کے نہ ہونے سے رونما ہوا جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے رہنا ممکن نہیں۔

اسی لئے حضرت صاحبِ سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطۂ حیات ارشاد فرمایا ہے کہ: مَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللهِ اَصْلَحَ اللهُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ ① جس نے اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ درست کرلیا اس کے درمیان اور خلق کے درمیان خود اللہ تعالیٰ معاملہ درست فرمادیتا ہے۔ اس لئے اگر آج ہم اس سیرتِ پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں تو اس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے ان کی روح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی کو بنانا ہوگا جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

سیرتِ طیبہ سے بیگانگی کا نتیجہ...... اب اگر ہم سیرت، عبادت واخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہو کر مثلاً محض قہر وسیاست اور اقتدار وغلبہ کی سیرت کو مطمع نظر بنالیں جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض ''کٹکھنی بادشاہی'' ہو کر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت ظلم وستم، زبردستی اور زبردستی آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہ عامہ کو مقصد زندگی ٹھہرالیں جس میں خداترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں تو وہ کوری خودغرضی، نمود ونمائش اور شہرت پسندی ہو کر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح وذم سے بالاتر ہو کر غنا واستغناء کی دولت نصیب نہ ہو سکے گی۔

پھر اس کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہو کر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاون باہمی کی ان تمام قوتوں سے محروم ہوجائیں گے جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت نہیں انجام پاسکتی جو سیرتِ پاک اور طبیعت اسلام کے تقاضے ہیں بلکہ اس قید تنہائی میں گلنے سے الگ ہو کر کسی وقت نفس وشیطان کی مکاری سے پناہ نہیں پاسکیں گے جنہوں نے خلوت گزیں اور راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

① کنز العمال ج: ۱۵ ص: ۷۹۸ (الدیلمی عن قدامة بن عبدالله بن عمار له صحبة).

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمت نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے، انقطائی عبادت بلا خدمت خلق رہبانیت ہے اور ریاست بلا عبادت ملوکیت واستبدادیت ہے اور ظاہر ہے کہ رہبانیت حضور علیہ السلام کی سیرت ہے نہ ملوکیت نہ نفسانیت اور نہ ہی انانیت آپ علیہ السلام کی سیرت ہے۔ کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتیں ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رونقشوں اور رسوم کے اجزائے سیرت بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کہ انہیں جزوی سیرت ہی کہا جاسکے البتہ جب اس خدمت خلق اور خدمت نفس کے خانوں میں اخلاق وعبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور سب اجزاء اپنے اپنے نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں تو پھر اس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اس کا کام کرنا چاہتے ہیں اب اسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی نقل وحرکت کا مرجع ومحور اپنے رب کو بنا لے گا۔

پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامع ترین سیرت ہے جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ اور محکوم کی الگ، اس میں دیانت بھی ہے خدمت بھی ہے اور عنایت بھی، اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرت صالحہ کا یہ حاصل نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر ان پر عقل کی حکومت ہو عقلی نظریات بھی ہوں مگر ان پر وحی الٰہی کی نگرانی ہو آزادیٔ ضمیر بھی ہو مگر اس میں حق کے ساتھ تقلید ہو۔ غرض نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز پامال نہ ہو سکے، سب کے تقاضے کارفرما ہیں مگر ہر ایک کی نقل وحرکت کا محور طاعت الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیٔ حق سے آزاد نہ ہوں پس اسی جامعیت اور اعتدال کامل کا نام سیرتِ مقدسہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

سیرتِ جامعہ کی عملی پیروی کی ضرورت ...... آج مگر ہم لوگ اپنے نونہالوں کے لئے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اونچے پیمانے کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں رواداری، بے قاعدگی بداعتقادی اور اصولِ آزادی نہ ہو، ان کی نگاہ خدا پر ہو اور اسی پر بھروسہ اور اعتقاد رکھتے ہوں اور دوسری طرف وہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات ومعاملات میں دیانت صداقت وراست گوئی وراست بازی ہو، شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد ان پر غالب ہو ایک طرف وہ مساجد و مدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں میں فروغ پا رہا ہو۔ ایک طرف ان کی خلوت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر ان کی عدل گستری سے معمور ہوں۔ ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال وخوش مال ہوں اور دوسری طرف اہلِ ملک ان کی طرف رجوع ہو کر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات ومعاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھے بلکہ ان کے مثالی معاملات سے بھی درس لیں۔

تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرت جامع کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انہیں دستیاب نہیں ہو سکتی، حق تعالیٰ شانہ اپنے پیغمبر کی سیرتِ مقدسہ اور اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے اور اس کے بھرپور اتباع کرنے کی توفیق نصیب فرماوے آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حیاتِ طیّبہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـا وَسَنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَاکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ ①

زندگی ایک مقدس امانت ...... بزرگانِ محترم !اس وقت قرآن شریف کی ایک آیت میں نے تلاوت کی ہے، جس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کی سعادت اوراس کی ترقی کا ایک بنیادی اصول ارشادفرمایاہے،جسکی کچھ تشریح اسوقت آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ پہلے آیت کا ترجمہ سن لیجئے.....حق تعالیٰ فرماتے ہیں"جس نے بھی نیکی کی اورعمل صالح اختیارکیا،مرد ہویا عورت،تو ہم اس کوایک نہایت ہی پاکیزہ زندگی عطاءفرمادیں گے جوحیات طیبہ ہوگی،صاف اوراعلیٰ ترین زندگی اوراس کی اس نیکی پرہم بہت اجروثواب بھی اس کوعطاءکریں گے"۔

نیکی کرنے پر دووعدے کئے گئے ہیں: ایک پاکیزہ زندگی کا اور ایک اجر کا۔اسے یوں سمجھئے کہ مستعار زندگی جو چنددن کی ہمیں دی گئی ہے،حقیقت میں ہمارے پاس ایک امانت ہے،اس امانت کواگر نباہنا ہےتوایمانداری کے ساتھ اس کو مالک کے سپرد کردینا ہے،اس لئے کہ اس زندگی کے ہم خود مالک نہیں ہیں،نہ ہم نے بنائی،نہ پیدا کی،نہ ازخود اس کوختم کرسکتے ہیں۔دینے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور لینے والے بھی وہی۔تو جس کے ہاتھ میں لینااوردینا ہے وہی مالک قراردیا جاسکتا ہے،ہمارے بلاارادہ زندگی آگئی،بلاارادہ ہم سے چھین لی جائے گی۔لائی حیات آئے،قضالے چلی چلے،اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے۔تو محض ایک مستعار زندگی کوہم کس طرح گزاریں۔

زندگی کا مادہ .....تو ہماری زندگی کا ایک مادہ ہے اور ایک اس کی صورت ہے۔زندگی کے مادے کو بھی سمجھ لیا جائے اوراس کی صورت کوبھی۔آگے اسی زندگی کے بارے میں بہت سی صورتیں آئیں گی مگر مادہ ایک ہی رہے گا

① پارہ:۱۴،سورۃ النحل،الآیۃ:۹۷.

اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی مثلاً گارا ایک ہے اسی گارے سے برتن بھی اور دیگر سب سامان بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب گارے کی شکلیں ہیں، مادہ مشترک رہے گا، اینٹ میں بھی گارا، بلڈنگ میں بھی گارا اور برتنوں میں بھی گارا، ایک ہی مادہ پر مختلف شکلیں آتی ہیں۔اسی طرح زندگی جو ہمارے لئے ترقی یا تنزل کا باعث ہوتی ہے اخیر تک اس میں ایک ہی مادہ موجود رہتا ہے اور یہ مادہ دو چار چیزیں ہیں سب سے پہلی چیز کھانا پینا ہے اسی سے مدارِ زندگی ہے اگر نہ کھائے پیئے تو اسے مردہ کہا جائے گا: ﴿جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ﴾ وہ بدن جو کھانا نہیں کھاتے......اس کے بعد پہننا اور اوڑھنا ہے پھر رہنا سہنا یعنی مکان بنانا ہے جس میں ہم اپنی زندگی اور اپنے رشتے کو محفوظ کر سکیں، اس کے بعد موانست اور انس باہمی سے زندگی بڑھانا ہے جس کو تمدن، تعاون، توالد اور تناسل کہیں گے یہی چار چیزیں کھانا پینا، اوڑھنا، رہنا سہنا اور باہم مل جل کر رہنا یہ بنیادی چیزیں ہیں، جن سے ہماری زندگی بنتی ہے اور یہی چار چیزیں آئندہ لوٹ پوٹ کر آتی ہیں اس میں کچھ اسباب اور وسائل ہیں اصل میں چار ہی چیزیں ہیں۔

کھانے پینے کیلئے غلہ کی کاشتکاری وغیرہ کی ضرورت ہے الغرض ایک لمبا دھندا ہے جس سے ہمیں چار دانے سپرد ہوتے ہیں، اس کے لئے بازار بنتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں یہ خرچ کرتا اور کماتا ہے۔تو کھانا پینا اصل تھا اس کی ضرورت سے بازار قائم کئے جائیں گے اور اسی کی خاطر پیشہ حاصل کیا جائے گا تو زمین، بازار، پیسہ، کھانے، پینے، رہنے سہنے کے اسباب میں سے ہوئے۔اسی طرح آپ امن وسکون قائم کریں، باہمی لین دین کریں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ باہمی لین دین سے زندگی کے اسباب آسانی سے حاصل کئے جاسکیں اور کھانے پینے، رہن سہن کی ضرورت میں سے آسمان بھی ہے جس سے پانی برسے، آفتاب بھی ہے جو گرمی پہنچائے، ہوا بھی ہے جو زندگی قائم رکھے۔تو یہ لمبا چوڑا کارخانہ اس لئے ہے کہ چار دانے چار کپڑے اور مکان ہمیں میسر آجائے، تو پورا عالم ہمارے لئے خدمت کر رہا ہے۔

انسانی زندگی کا دورِ اوّل حیوانیت......تو انسان کی زندگی کا پہلا دور یہ ہے کہ اس کا تمام تر مقصد کھانا پینا ہوتا ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کے لئے چلاتا ہے، جہاں ماں نے اس کے منہ میں دودھ ڈالا وہ چپکا ہو گیا، معلوم ہوا اس کا شور مچانا غذا کیلئے تھا اگر وہ نہ چلاتا تو ماں کو خبر نہ ہوتی، اگر بچہ نہ روتا تو ماں کی چھاتی میں دودھ جوش نہیں مارتا بچہ کا رونا ایک فریاد ہے، ماں کی مامتا اور محبت جوش میں آتی ہے اور جوش سے دودھ جوش میں آتا ہے اور دھاریں پھوٹتی ہیں تو سب سے پہلے پیدا ہوتے ہی نہ کپڑا مانگتا ہے نہ مکان۔پھر گرمی سردی ستاتی ہے تو چلاتا ہے اور ماں کپڑا اوڑھاتی ہے، معلوم ہوا کہ سردی گرمی ستا رہی تھی۔زیادہ کپڑے لاد دیئے پسینہ آ گیا تو چلانے لگا تو ماں کے دل میں الہام ہوتا ہے کہ اب اسے گرمی ستا رہی ہے یہ کپڑے اتار دیتی ہے اور پنکھا جھلنے لگتی ہے تو پہلی ضرورت تھی کھانے کی، دوسری لباس، تیسری گرمی اور سردی اور دھوپ سے بچنے کیلئے مکان کی اور ذرا بڑا ہو گیا، کچھ ہوش آ گیا تو اس میں انس ومحبت کا مادہ بھی آ گیا اب چھوٹے بچوں کو اپنے لئے تلاش کرتا ہے، کسی بچے کو

آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں بیٹھے گا یا وہ علماء وصلحاء کی مجلس کو تلاش کرے گا کہ وہاں جا کر بیٹھ جائے، نہیں بلکہ اپنے ہم عمروں سے کھیل میں لگے گا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے جوان جوانوں کی طرف، بوڑھا بوڑھوں کی طرف مائل ہوگا، معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اُنس موجود ہے، وہ جانوروں کی طرح بھٹوں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا، ایک آبادی بنا کر رہتا ہے، شہری زندگی قائم کرتا ہے تا کہ اُنس وموانست آتی رہے کیونکہ انسان اُنس سے مشتق ہے:

وَمَاسُمِّيَ الْإِنْسَانُ إِلَّا لِأُنْسِهٖ وَمَا الْقَلْبُ إِلَّا لِأَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

عربی کا شاعر کہتا ہے کہ انسان کا نام انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں اُنس ہے اور قلب کے معنی لوٹ پوٹ کے ہیں۔ قلب ہر وقت متحرک رہتا ہے اس میں خیالات الٹتے پلٹتے رہتے ہیں اس تَقَلُّبْ کی وجہ سے اسے قلب کہنے لگے، اگر بچے کو آپ تنہائی میں ڈالیں تو چلائے گا اور اس کے ساتھ کوئی بیٹھ گیا اور کسی سے بولنے لگا تو چپکا ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ اس میں اُنس کا جذبہ ہے وہ ابھر رہا تھا، اس کا علاج مل گیا تو خاموش ہو گیا۔

یہ چار چیزیں ہی زندگی کا مادہ ہیں اور لوگوں کا یہ مقصودِ زندگی ہے اس زندگی کا نام ہم حیوانی زندگی رکھیں گے یعنی حیوانیت کا تقاضا ہے کہ کھائے پیئے۔ آپ نے چوپایوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بھی آپ گائے بھینس کو دیکھیں گے چر رہی ہیں یا پھر تک رہی ہیں اور پھر کھانے لگی ہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں ۲۴ گھنٹے جانور کا کام کھانے کا ہے بھینس کو آپ پالیں گے تو ایک مستقل آدمی رکھنا پڑے گا کہ اس کی پرورش کرے رات بھر کھڑے کھائے گی کچھ آنکھ لگ گئی پھر جب جاگی تو کھانے لگی تو حیوان کا طبعی تقاضا کھانا پینا ہے، گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی حاصل کرنا یہ حیوانیت کا تقاضا ہے تو معلوم ہوا کہ انسان کی وہ زندگی جس میں کھانا پینا، رہنا سہنا ہی مقصد ہو وہ حیوانیت کی زندگی ہے۔ آپ جتنا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کھائیں گے، بہترین بلڈنگ بنائیں گے یہ سب حیوانیت کا تقاضا ہے۔ سانپ اپنے لئے بھٹ بنالیتا ہے، شیر اپنا ٹھکانہ اور چڑیا اپنا گھونسلہ بنالیتی ہے، چونٹیاں سوراخ تلاش کر لیتی ہیں، انسان بلڈنگ بنالیتا ہے کتنی اعلیٰ بلڈنگ کیوں نہ ہو حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکلے گا تو بچہ ابتداء سے ہی ان چیزوں کو چاہتا تھا، یہ حیوانی زندگی تھی۔

انسانی زندگی کا دورِ ثانی عقل وشعور...... اب ذرا شعور آیا، دس برس کے بعد اس میں عقل کے مادے نے آنا شروع کر دیا ابھی تک اس کی زندگی طبیعت کے نیچے تھی اور طبع بشری جو چاہتی تھی وہی ہم کرتے تھے تو ہماری طبیعت حاکم اور ہم اس کے غلام اور محکوم تھے۔ فلاسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور واقع ہوتی ہے، اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں شعور اور سمجھ نہیں ہوتی تو ایک جاہل بادشاہ طبیعت حکم دیتی ہے کہ کھاؤ، بھوک لگی ہم نے کھانا شروع کر دیا، چاہا پانی پینے کو ہم نے کہا: بہت اچھا، چاہا مکان بنالو ہم نے تعمیل شروع کر دی، تو ایک بے شعور حاکم کے

احکام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے کیوں کہ یہ سب طبیعت کے تقاضے تھے چودہ پندرہ برس بعد اب انسان کو شعور آنا شروع ہوا اور ہر چیز میں عقل سے غور کرنا شروع کیا اس میں سمجھ آئی۔ تو اس شعور وعقل کے بعد مادہ زندگی بدلتا رہے گا کل تک طبعی جذبہ سے کھا رہا تھا آج عقل نے اس میں لطافت پیدا کر دی۔

ایک اجتماعیت کا مادہ ہے اور ایک ظرافت کا جس کو ''جمال پسندی'' کہتے ہیں یعنی کھائے مگر ذرا خوشنما بنا کر کھائے، پہنے مگر ذرا عمدہ کر کے پہنے، رہے مگر ذرا بلڈنگ کو اچھا بنا کر رہے، اس کی طبیعت جب عقل کے نیچے آجائے تو عقل پورا زور لگا کر مکان بنائے گی، ڈیزائن بھی اچھا ہو، گویا فن انجینئری پیدا ہوگا۔ کہ عمدہ عمدہ نمونے بنائے جائیں، کھانا طبعی تقاضا تھا مگر عقل نے چاہا کہ برتن بھی خوشنما ہوں کھانے کا رنگ بھی ذرا عمدہ ہو، نگاہوں کا سینکنا بھی مقصود ہو جاتا ہے، آج نوع بنوع کھانے بنتے ہیں۔ یہ سب عقل کا تقاضا ہے، طبیعت اس کے اندر کام کرتی ہے، عقل اس کو ذرا درست کر لیتی ہے کہ اس کی شکل بھی عمدہ بنے۔ آپ کیک بنائیں گے تو اس کا مادہ ایک ہی ہے مگر شکل الگ الگ بناتے ہیں، کسی کی چڑیا کی شکل بنا دی، کسی کی پھول جیسی، اس میں رنگ بھر دیئے، موتی لگا دیئے کہ آنکھیں بھی دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔

اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو مزہ پھر بھی پیٹ کا وہی رہتا۔ اگر آپ نے سردی سے بچنے کے لئے ایک موٹا سا کمبل اوڑھ لیا تو طبیعت کا تقاضا پورا ہو جائے گا مگر عقل کہتی ہے کہ اس کا رنگ بھی عمدہ ہو، اون بھی ذرا ملائم ہو، ذرا قیمتی ہو کہ دیکھنے والا کہے کہ بڑا آدمی ہے تو محض طبع بشری کا تقاضا تو ڈھانپنا تھا مگر عقل کا تقاضا اسے خوشنما بنانا ہے تو آج دنیا میں جو ڈیزائنوں کی افراط ہے کہ آپ کوٹھیاں نئی نئی طرز کی بنائیں، چھت بھی ایسی ہو، دیواریں ایسی ہوں پلاستر اور دیگر آلات ایسے ہوں، یہ ظرافت پسندی اور جمال ہے جو انسان میں رکھی گئی ہے، آج جو کپڑوں کے ہم نمونے دیکھتے ہیں کوئی مادہ نہیں چھوڑا جس سے کپڑے نہیں بنائے، روئی کے کپڑے تو خیر ہیں ہی، اون اور درختوں کی چھال، گتوں اور کاغذ کے کپڑے بنتے ہیں اور اب کانچ کے کپڑے بنانے پر غور ہو رہا ہے، جتنی جڑی بوٹیاں جنگل میں ممکن ہیں انسان نے غور کر کے سب کے مطابق طرز اور نقش ونگار بنا لئے، جالدار کپڑے الگ، مشجر الگ، دنیا نے اتنے رنگ کے کپڑے کبھی نہیں دیکھے جتنے آج دیکھ رہے ہیں۔

یہ محض طبیعت کا تقاضا ہے جس میں عقل اور جمال پسندی کی آمیزش ہوگئی اگر نمونے کا حصہ چھوڑ دیا جائے تو گھونسلہ بنا کر جہاں چاہے رہ جائے، یہ سارے مسائل نمونہ کی خوشنمائی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں پینے کے لئے سوڈے کی دکان پر جائیں گے تو رنگ برنگ کا پانی دیکھیں گے کوئی سبز، کوئی سرخ، کوئی زرد، کوئی نارنجی، ذائقہ درست کرنے کے لئے تو سب ایک ہی ہیں مگر آدمی چاہتا ہے کہ جب میں پیوں تو آنکھوں کو بھی لذت ہو، ہاتھ کو بھی، زبان کو الگ لذت آجائے اور سارے ذائقے جمع ہو جائیں، یہ چیز انسان میں ہے جانوروں میں نہیں رکھی گئی۔ جانور تو کھا پی کر ہضم کرے گا پیٹ میں بوجھ کر دے گا۔

حضرت آدمؑ کے زمانے میں گائے جس طرح کھاتی تھی آج دس ہزار سال بعد اسی طرح کھاتی ہے، جس طرح پہلے قضائے حاجت کر رہی تھی ایسے ہی اب کرتی ہے یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، تو جانوروں میں یہ مادہ ظرافت اور جمال پسندی کا نہیں ہے، جنات میں بھی نہیں ہے ویرانے میں رہتے ہیں، آج تک انکی کوئی بلڈنگ نہیں دیکھی گئی، چڑیا جانور کسی میں یہ مادہ نہیں، کسی نے درخت کو ٹھکانہ بنالیا کسی نے زمین کھود کر ڈیرہ بسالیا مگر یہ انسان ہے جو جمال پسندی میں دنیا بھر کے مادے خرچ کرتا ہے، مکان، کپڑا، کھانے کی شکلیں بھی عمدہ عمدہ تجویز کرتا ہے۔

مغل شاہِ ہند کا ایرانی شہزادے پر کھانے کے ذریعہ رعب ڈالنا...... ایران سے بادشاہِ ہندوستان کے پاس شہزادہ آیا مغلوں کی سلطنت کا زمانہ تھا تو شاہی باورچی کو حکم دیا گیا کہ کوئی نئی قسم کی چیز تیار کرو، تو ناشتے کیلئے ایک چیز تیار کی اور ایک بہت عمدہ خوانچہ میں رکھ کر لے آیا تو بہت عزت کے ساتھ بلا کر اسے حکم دیا کہ اسے دربار میں کھولدو...... کھولا تو معلوم ہوا کہ بھینسے کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور تازہ خون بہہ رہا ہے شہزادے کو بڑا تکدر ہوا اور حیرت زدہ ہوا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے، بادشاہوں کے پاس بھینسے کا سر لے آیا ہے اس نے کہا کہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نے کبھی اچھی چیز نہیں کھائی، اسے ذرا اپنے بادشاہ کو رعب دکھانا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی مٹھائی تیار کی گئی تھی، بھینسے کا سر تھا مگر اس کے اندر زبان ایک عجیب ذائقے کی مٹھائی تھی، دانت اور ذائقے کی مٹھائی تھی، اس کی کھال میں اور ذائقہ تھا، جب اس شہزادے نے چکھا تو حیران رہ گیا کہ عجب چیز ہے تو باورچی کو یہ حجت تمام کرنی تھی کہ تمہارے فرشتوں نے بھی کبھی اس قسم کے کھانے نہیں کھائے جو ہندوستان میں بنتے ہیں۔ یہ جمال پسندی تھی محض مٹھائی لاکے رکھ دیتے شہزادہ کھا پی لیتا اس مصیبت کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو بھینسے کی صورت دی، اس کا گلا کٹا ہوا دکھایا کہ خون اس میں بہتا رہے فن کا کمال دکھانا تھا۔

ان فنی کمالات کیلئے آج دنیا میں مستقل کمپنیاں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ میزوں کو سجائیں، سینکڑوں روپے محض انکو سجانے کے لئے بطور اجرت دیئے جاتے ہیں۔ تو طبع بشری تو کھانا پینا چاہتی ہے، عقل بشری چاہتی ہی کہ اسکے اندر خوشنمائی پیدا کی جائے۔ طبع بشری چاہتی ہے کہ کوئی ہمجولی مل جائے تو اس سے انس ومحبت سے بات کی جائے اور عقل چاہتی ہے کہ بات کریں تو لہجہ بھی شائستہ ہو، کلام بھی مہذب ہو، بیٹھنے اٹھنے کا ڈھنگ بھی ذرا اچھا ہو۔

انسانی زندگی کا باشعور حکمران...... جب زندگی اس نوبت پر پہنچے اور کھانے پینے کو آپ عقل کے نیچے لے جائیں تو ہم اسے انسانی زندگی کہیں گے، کل تک یہ چیزیں طبیعت کے حکم میں تھیں آج وہ عقل کی محکوم بن گئیں، پہلے ایک جاہل بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا اور اب ایک باشعور حکمران کی حکمرانی کے نیچے آگئیں یعنی عقل کے، جس میں سوچ ہے اور سمجھ ہے۔

اس کے ساتھ ایک چیز اور بڑھ جاتی ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ خود غرض بچہ یہ چاہے گا کہ میں کھالوں میرے بھائی بند کھا رہے ہیں یا نہیں، مثلاً اس کی بلا سے ایک کتا آجائے گا آپ ہڈی ڈالدیں گے وہ

کھائے گا دوسرے کتے کو ملے یا نہ ملے آپ سے کیا بلکہ دوسرا کتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہوگا بلکہ سارے محلّہ کے کتوں سے لڑتا ہے، اسی طرح سے دیگر جانور بھی لڑتے ہیں کہ میری غذا دوسرے کے پاس نہ جائے۔ یہ حیوانیت کا تقاضا ہے کیونکہ طبع حیوانی بالطبع خودغرض واقع ہوتی ہے اپنا نفع چاہتی ہے دوسرے کا نفع نہیں لیکن جب عقل آجاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ عمدگی کے ساتھ میں بھی کھاؤں اور میرے بھائی بند بھی کھائیں تو عقل نے آکر اجتماعی زندگی سکھلادی۔ تو عقل نے دو باتوں کا اضافہ کیا ایک ظرافت یعنی جمال پسندی کا اور ایک اجتماعیت کا کہ جہاں ہمیں مل رہا ہے ہمارے بھائیوں کو بھی ملنا چاہیے، یہ بُری بات ہے کہ تنہا بیٹھ کر کھائیں اور دوسرے بھوکے رہیں۔ تو جب آدمی میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا تو کہا جائے گا کہ یہ انسانی زندگی کے اندر آگیا، مگر اس کا مادہ بھی وہی چیز ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہاں خودغرضی کیلئے استعمال ہوتی تھی عقل کے نیچے آکر اجتماعی شان کیلئے استعمال ہونے لگی، اور سارے بنی نوع کا فائدہ ہونے لگا۔

اب اسی حالت میں انسانی تمدن لین دین تجارت اور زراعت قائم کرتا ہے تو اجتماعیت کی شان جمال پسندی اور بنی نوع کے فائدے کے لئے دیکھنا اور سوچنا، یہ بھی عقل کا کام ہے تو مادہ وہی رہا مگر اس کی شکل بدل جاتی ہے کیونکہ حکام بدلتے جاتے ہیں، اگر حاکم خودغرض ہے تو محکوم بھی خودغرض ہوگا اور اگر حاکم کے اندر جماعت پسندی اور جمال پسندی ہو تو محکوموں میں بھی یہی چیز آئے گی۔ جب عقل نے دائرۂ حکومت سنبھالا تو سارے افراد بنی آدم کا فائدہ اس میں ہوگا یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ میں بھی راضی رہوں میرے بھائی بند بھی راضی رہیں۔ مثل مشہور ہے ''نہ تنہا ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے نہ روتا ہوا'' کسی جماعت کے ساتھ مل کر ہنستا ہے تو ہنسی ہے اور جماعت کیساتھ ہی روتا ہے تو رونا بھی ہے۔

انسانی زندگی کا تیسرا دور ایمان کی حکومت...... اب انسانی زندگی کو ذرا ایک قدم اور بڑھا دیجئے کہ طبع بشری کھانے پینے سے محض نفس کی رضا چاہتی تھی جب عقل آگئی تو اب بنی نوع کی رضا سامنے آگئی کہ میرے سارے بھائی بند بھی راضی ہوں اگر کسی کے اندر ان تمام افعال میں یہ چیز بھی پیش نظر ہو جائے کہ تنہا میں راضی نہ ہوں نہ تنہا میرے بھائی بند راضی ہوں بلکہ میرا خدا بھی راضی ہو تو اب یہ ایمانی زندگی شروع ہوگئی، وہی چیزیں اب ایمان کی حکومت کے نیچے آگئیں جو اب تک عقل اور طبیعت کی حکومت میں تھیں۔

عقل انسانی جماعت پسندی اور مفاد عامہ کی رہبری کرتی تھی لیکن جب ایمان کی روشنی آئی تو اب یہ فکر پڑی کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سوچے کہ کھانا اس طرح سے کھاؤں کہ میرا خدا بھی راضی ہو، لباس پہنوں تو اسے اس طرح سے پہنوں کہ میرا خدا بھی راضی رہے، ایسا لباس نہ پہنوں جو اس کی منشاء کے خلاف ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ ''بنی آدم میں مردوں کے لئے ریشم کا کپڑا پہننا حرام ہے'' ① ریشم کا کپڑا پہننے سے نفس اور بھائی بند تو راضی

① السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الحریر والذهب ج:٦ ص:٣٢٥.

ہوجائیں گے کہ بڑا عمدہ لباس پہنا ہے مگر اللہ میاں راضی نہیں۔ تو عقل اور نفس تو راضی ہو گئے مگر خدا راضی نہیں ہوئے۔ تو ایمان کی حکومت میں آ کر آدمی سوچتا ہے کہ کون سا لباس جائز ہے کون سا ناجائز! کون سا حلال اور کون سا حرام!...... حدیث میں فرمایا کہ سونے کا استعمال مردوں کیلئے حرام ہے کسی نے سونے کی انگوٹھی پہن لی تو قطعاً ناجائز ہے، حرام ہے، فرمایا: حِلْيَةُ اَهْلِ النَّارِ ① اہل جہنم کا زیور ہے، یہ آگ کی طرف لے جائے گا، البتہ سونے کے بٹن کے بارے میں شریعت نے اجازت دی ہے لیکن اس وجہ سے کہ اس کو لباس کے تابع سمجھا گیا ہے جیسے لباس پر زری کا کام کیا جائے تو بٹنوں کو کپڑوں کے حکم میں پھول بوٹوں کی شکل میں سمجھا گیا ہے، مگر بٹن کی بھی ایک مقدار ہے کہ وہ تین ماشے سے زیادہ نہ ہو بہت زیادہ وزنی پہنے گا تو یہ ہوسنا کی ہوگی اس کے ساتھ فقہاء یہ بھی قید لگاتے ہیں کہ اگر بٹن کا استعمال ہوتو بدن سے نہیں لگانا چاہیے بلکہ کسی کپڑے سے سی کر پہنا جائے تا کہ براہ راست سونا بدن سے مس بھی نہ کرے، لباس کے اوپر سلا ہوا ہو اتنی قیود کے ساتھ اجازت دی گئی ہے تو جب آدمی ایمانی زندگی اور ایمانی حکومت کے نیچے آئے گا تو ایک بٹن بھی سامنے آئے گا تو سوچے گا کہ کس طرح...... جائز ہے کس طرح نہیں؟ کتنا پہنوں کتنا نہ پہنوں؟ محض عقل تو اجازت دیدے گی کہ پانچ پانچ تولے کے بٹن پہن لو۔ چاہے تو ہار اور کنگن بھی پہن لو، عقل نہیں روکے گی اس لئے کہ عقل زیادہ سے زیادہ نفس کی رضا چاہتی ہے یا انسان کی رضا رہی خدا کی رضا! تو اس کا تعلق تو ایمانی زندگی سے ہے۔

اسی طرح کھانا کھانے کے لئے آدمی بیٹھے گا تو غور کریگا کہ یہ خنزیر تو نہیں جو حرام ہے یہ فلاں جانور کا گوشت نہیں ہونا چاہیے، حرام چیز سے اس طرح بھاگے گا جیسے سنکھیا سے بھاگتا ہے اس لئے کہ سنکھیا مادی موت کا سبب ہے اور حرام چیز کھانا روحانی موت کا سبب بن جاتا ہے لیکن محض عقل ....! وہ تو ممانعت نہیں کرے گی چاہے سانپ کھائے، خنزیر کھائے، لیکن ایمان اجازت نہیں دیگا۔ اس واسطے کہ ہر گوشت ہر پوست میں ایک خاصیت ہے تو جیسے اطباء بری خاصیت کی اشیاء کے کھانے سے ممانعت کرتے ہیں، اطبائے روحانی حضرات انبیاء علیہم السلام بھی بری اشیاء سے روکتے ہیں ہر گوشت کی ایک خاصیت ہے۔ خنزیر کی طبیعت میں بے حیائی اور بے غیرتی ہے نجاست خور ہے غلاظت خور ہے، ایک خنزیر دوسرے ہم جنسوں پر جست (مباشرت) کرتا ہے تو ویسی گندگی اور وہی صورت اس کے کھانے والوں میں بھی آئے گی۔ غلاظت، کدورت، بے حیائی اور بے غیرتی جیسے اوصاف پیدا ہوں گے۔ درندوں کا گوشت شیر، بھیڑیا وغیرہ کا حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ ان کے گوشت کے اندر درندگی کی خاصیت ہے تو ان چیزوں کا کھانے والا انسان اعلیٰ جانور بن جائے گا اور انسانیت ختم ہوجائے گی اس لئے شارع علیہ السلام نے ممانعت کردی........ اور ایسے جانوروں کی اجازت دی جو اعتدال کی شان رکھتے ہوں تا کہ عدل پیدا ہو یہ خاصیت اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس مخلوق کو کیسا بنایا اس کا حق ہے کہ وہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں

---

① السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی خاتم الحدید ج:٦ ص: ٤٣١.

جانور حلال کیا فلاں حرام کیا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ①

حرام کیا گیا تم پر خنزیر اور مردار جس کی روح نکل جانے پر اسمیں روحانیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالص مادیت رہ جاتی ہے اور خالص مادیت ایک تعفن ہے، گندی چیز ہے۔ روح آ کر اس سے گندگی دفع کرتی ہے تو حق تعالیٰ جو شریعتوں کے بھیجنے والے اور ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں نے کس چیز میں کیا خاصیت اور جو ہر رکھا ہے اور کیا نہیں، اسے حق ہے کہ وہ کہے فلاں چیز استعمال کرو فلاں مت کرو، تو جب آدمی ایمان (کی حکومت) کے نیچے آ جاتا ہے تو پھر اس میں کھانے، پینے، رہنے سہنے، اوڑھنے میں رضائے خداوندی پیشِ نظر رہتی ہے کہ اگر مالک اور محسن ناراض ہوتا ہے تو مجھے حق نہیں کہ کوئی ایسا کام کروں۔

اسی طرح نسل بڑھانے میں بھی یہی خیال رہے گا زنا سے بچے گا نکاح کی طرف آئے گا۔ اگر ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل محض میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی۔ اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح اور وہ سفاح! تو طبع بشری میں محض نفس کی رضا پیشِ نظر ہوتی ہے عقل آ جائے تو مفادِ عامہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لو اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالاتر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں سارے انسان ملکر بھی ناراض ہو جائیں تو یہ اُسے گوارا کرے گا اللہ کو ناراض کرنا گوارا نہیں کرے گا، پروردگار کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دیگا تو ایمانی زندگی کے اندر وہی تمام چیزیں ہیں جو اب تک استعمال میں آ رہی تھیں صرف شکل بدل گئی رضائے خداوندی کی شکل آ گئی کہ کس طرح مجھے میرے مالک نے حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ پانی پیو تو دائیں ہاتھ سے پیو، بائیں ہاتھ سے پیو گے تو شیطان شامل ہو جائے گا اور جب شیطان کا حصہ کھانے پینے میں آ گیا تو نفس پر شیطنت کے اثرات پڑیں گے۔ اگر دایاں ہاتھ کھانے سے آلودہ ہو اور مجبور ہے کہ گلاس بائیں ہاتھ میں لے تو کم سے کم دائیں ہاتھ کا کوئی حصہ لگا لیا جائے تا کہ دائیں ہاتھ سے پینا ثابت ہو جائے۔ اس واسطے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیاطین کا کام ہے اور دائیں ہاتھ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَامُنَ ② جناب نبی کریم کو ہر شریف اور بہتر کام میں دایاں ہاتھ پسند تھا۔ لباس پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ دائیں آستین میں ڈالتے، پاجامہ پہنتے تو پہلے دایاں پیر دائیں پائچے میں، کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب، دانت مانجھتے تو پہلے دائیں جانب۔ تو دائیں جانب سے ابتداء حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو پسند ہے بائیں جانب سے نہیں اور دائیں جانب شریف سمجھی جاتی

① پارہ: ۶، سورة المائدة، الآية: ۳.

② السنن للنسائي، كتاب الزينة، باب الترجل ص: ۲۴۲۳ رقم: ۵۲۴۲.

ہے۔تو کثافت اور ذلالت کے امور شیاطین کو پسندیدہ ہیں اور ہر چیز کی پاکی اور صفائی انبیاء کو پسند ہے۔اسی طرح ایمانی زندگی کی وجہ سے کھانے پینے میں غور کرے گا کہ کھانا حلال کا ہو حرام کا نہ ہو اس واسطے کہ دینی توفیق کا تعلق اکل حلال سے ہے، لقمہ حرام جب پیٹ میں پہنچتا ہے تو دینی جذبات کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، حلال پہنچتا ہے تو دین پر عمل اور محبت کے جذبات بھڑ کتے ہیں اس لئے کہ دین بہر حال صاف چیز ہے اگر کسی شخص کی طبیعت نہایت پاکیزہ اور ستھری ہے اس کے سامنے اگر غلیظ آدمی کو پیش کرو تو منہ پھیر لے گا اور اگر اس کی طبیعت گندی ہے تو جتنی غلیظ چیزیں سامنے آئیں گی اس کیلئے اتنا ہی خوشی کا موقع ہوگا۔

دکن کے بادشاہ کی نفاست کا حال...... دکن کے بادشاہ ''تاناشاہ'' تھے۔تاناشاہ تاناشاہی طبیعت کے تھے مشہور ہے طبیعت بہت زیادہ نفیس و نازک تھی۔جب دشمن نے دکن کے حملہ میں ان پر قبضہ کیا اور قیدی بنا کر فاتح کے سامنے پیش ہوئے تو تجویز ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہوں نے کہا کہ جب تم مجھے بہر حال واجب القتل سمجھتے ہو تو اس کیلئے تم زیادہ جدوجہدمت کرو میں آسان ترکیب بتائے دیتا ہوں، مزاج میں چونکہ حد درجہ لطافت تھی تو کہا کہ کسی غلیظ بھنگن عورت کو گندگی لیکر سامنے سے گزار دو تو میں ختم ہو جاؤں گا چنانچہ غلاظت کا ٹوکرا سامنے لایا گیا، بس وہیں دم نکل گیا تحمل نہیں کر سکے۔الغرض پاک وصاف اور نفیس طبیعت ستھری چیزوں سے خوش ہوتی ہے جو چیزیں پاخانہ میں پیدا ہوتی ہیں اگر انہیں باہر ڈال دو وہیں مر جائیں گی اس لئے کہ غلاظت ان کا طبعی تقاضا ہے اور صاف چیزوں پر ناپاک چیزوں سے مردنی چھا جاتی ہے تو ہر چیز میں اس کی طبیعت کے مناسب جو چیز ہے وہی آتی ہے اور جبھی وہ زندہ رہتی ہے۔اسی لئے ایمانی طبائع لقمہ حرام کو کبھی برداشت نہیں کرتی حتیٰ کہ مشتبہ لقمہ کو بھی۔

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا تقویٰ...... ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کا تقویٰ اور طہارت مشہور ہے، فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کا میرے ساتھ معاملہ ہے کہ اگر نادانستگی میں بھی کوئی مشتبہ لقمہ پیٹ میں چلا جائے تو فوراً قے آجاتی ہے تو انتہائی تقویٰ اور پاکیزگی بڑھتے بڑھتے حق تعالیٰ کا ایسا معاملہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ آدمی متقی بننے کی مشق کرے جب تقویٰ باطن نصیب ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ خود حفاظت فرماتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا تقویٰ...... حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنا ہی واقعہ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ اعظم گڑھ گیا، اس ضلع میں اسٹیشن سے چار میل چھوٹا سا گاؤں تھا، وہاں کے لوگوں نے مجھے بلایا، وہاں سے جب فارغ ہوا تو ریل رات کو گیارہ بجے جاتی تھی، سردی کا زمانہ تھا لوگوں نے کہا کہ سردی ہے اندھیری رات ہوگی بارشیں ہو رہی ہوں گی اس لئے رات کو جانے میں تکلیف ہوگی مناسب ہے کہ عصر کے وقت اسٹیشن پہنچا دیا جائے رات کو ٹرین آئے گی تو سوار ہو جائیں گے۔تو حضرت کو سوار کر کے اسٹیشن لائے جو بہت چھوٹا سا تھا، نہ ویٹنگ روم نہ مسافر خانہ۔دفتر کا ایک ہی کمرہ تھا اور اسی سے ملا ہوا مال گودام تھا، بوریاں وغیرہ وہاں بھرتے تھے۔اسٹیشن ماسٹر

تھا تو ہندو مگر بھلا آدمی تھا اس نے دو چار بوریاں ہٹائیں اور مصلی کی جگہ بنائی کچھ آرام کی جگہ ہوگئی۔

پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ آرام سے بیٹھیں۔ فرماتے تھے جب مغرب کا وقت ہوا تو میں نے نماز پڑھی اس کے بعد سنتیں اور اس کے بعد نفلوں کی نیت باندھ لی، وہ اسٹیشن ماسٹر ایک لیمپ لیکر آیا تا کہ روشنی ہو جائے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے معاً یہ خطرہ ہوا کہ مال گودام کیلئے گورنمنٹ نے کوئی لیمپ رکھا نہیں ہے، یہ محض ریلوے کا لیمپ میری وجہ سے لایا ہوگا تو میں گویا غاصب ٹھہرا، میرے لئے حق نہیں کہ اسے استعمال کروں، نماز میں ایک بے چینی شروع ہوگئی: کہ اے اللہ تو نے ہمیشہ مجھے مشتبہ چیزوں سے بچایا ہے۔ یہ مشتبہ چیز آرہی ہے جس کا مجھے حق نہیں، اس لئے تو ہی بچانے والا ہے، فرماتے تھے کہ بمشکل میں نے دو رکعتیں ختم کیں اور اس نے لیمپ رکھا نہیں بلکہ لئے ہوئے کھڑا رہا، جب میں نے سلام پھیرا تو اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں یہ لیمپ لیکر آیا ہوں اور یہ اسٹیشن کا نہیں میرا ذاتی ہے، لایا اس لئے کہ اندھیرے کی تکلیف نہ ہو..... فرماتے تھے کہ میں نے اتنی دعائیں کیں اس کے حق میں کہ اتنی رعایت ہے، اس لئے اس نے خود محسوس کیا کہ مجھے (ریلوے کی لالٹین کا) حق نہیں تو اپنے گھر سے لایا۔ تو طبیعت میں جب سلامتی ہو تو کافر کی بھی قدرت رہنمائی کرتی ہے بشرطیکہ مذہب کا جذبہ موجود ہو، اخلاقی قدریں اس کے اندر ہوں۔ الغرض متقی جب تقوی تک پہنچ جائے تو

می دہد یزداں مراد متقین

والا معاملہ ہوتا ہے حق تعالیٰ ایسے راستے پیدا فرما دیتے ہیں کہ مشتبہات سے بچ جائے مگر یہ جب ہی ہوتا ہے کہ تقویٰ باطنی کی عادت ڈالے، جو تقویٰ ظاہر کا ہے وہ تو یہ ہے کہ برا عمل نہ کرے، ناجائز نہ کرے ہر عمل جواز کی حد میں کرے اور ایک تقویٰ باطن ہے وہ زیادہ دقیق ہوتا ہے وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی، جب تک کہ اعلیٰ درجہ کا متقی نہ ہو۔

اپنی بیوی میں دوسری عورت کا خیال حرام ہے..... فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کوئی خوش رنگ شربت پینے بیٹھا ہے اور تصور یہ باندھا ہے کہ میں شراب پی رہا ہوں تو فرماتے ہیں کہ یہ گنہگار ہے اور اگر اس کی نیت کھل جائے تو حاکمِ وقت اسے سزا دے گا وہ شربت بھی اس کے حق میں مکروہِ تحریمی بن جاتا ہے، اس نے زبان سے اگر چہ شراب نہ پی مگر خیال سے پی لی، دل سے پی لی۔ اسی طرح فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اس کے ہاتھ تھامے ہوئے ہے اور دل میں دھیان ہے کہ فلاں اجنبیہ عورت جس سے مجھے عشق ہے یہ وہی اجنبیہ عورت ہے اس کا فقط تصور باندھ لیا تو فرماتے ہیں کہ یہ باطنی طور پر حکم میں زانی کے ہو جائے گا۔ اس کے حق میں تب جائز ہوگا کہ تصور بدل کر توبہ کرے۔ تو دل میں تصورات بھی غلط طرح کے نہ ہوں برا تصور آئے گا تو آگے عمل شروع ہوتا ہے، برے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں تو عمل بھی ناپاک ہو جائے گا اسے کہتے ہیں تقویٰ باطن کہ جذباتِ قلب بھی مصفی و مزکی ہوں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ

الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا...... ﴾ ① جولوگ تقویٰ کی عادت ڈالتے ہیں اگر ناگہانی طور پر کسی غلطی میں پڑ جاتے ہیں تو فوراً ان کی طبیعت میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور توبہ کر کے سنبھل جاتے ہیں، اس خیال سے بھی توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ خیال سے ہی تو عمل پیدا ہوتا ہے اگر خیالات نہ روکے اور اجازت دیدے کہ جیسی رَوْ آئے تو چلتے رہو تو آدمی بہت سی بدعملیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اب یہ کتنی دقیق بات ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اجنبیہ عورت کے بچے ہوئے پانی سے اجنبی مرد کے لئے وضو کرنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ اسے خیال آئے گا فلاں عورت کا بچا ہوا پانی ہے اگر یہ دھیان بڑھ گیا تو ممکن ہے آگے بہت سے فسادات پیدا ہوں۔ حدیث میں فرمایا گیا: اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ ② تقویٰ قلب کے اندر ہوتا ہے جب قلب کے اندر آ جائے گا تب عمل کے اندر پیدا ہوگا جب قلب میں ہی نہیں ہوگا تو قالب میں بھی نہیں ہے وہ کیسے متقی بن جائے گا! تو بہرحال جب ایمانی زندگی آ جاتی ہے تو خیالات پر بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے کہ خیالات بھی ایسے نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ جیسے آپ کے ہاتھ پیر کو دیکھتے ہیں ایسے ہی اللہ دلوں کو بھی دیکھتے ہیں ﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ③ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ ④ تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتا، دلوں کو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر نیت کیا ہے۔

قانونِ الٰہی کی منشاء...... تو دنیوی بادشاہوں کا قانون صرف بدن پر لاگو ہوتا ہے لیکن خدائی قانون تو قلب پر بھی لاگو ہوتا ہے دنیوی سلطنتیں بدعملی سے روک سکتی ہیں کہ چور نے چوری کی اسے جیل بھیج دیا۔ ڈکیت نے ڈکیتی کی اُسے جیل بھیج دیا لیکن قلب تو نہیں بدل سکتا وہ تو خدا کی حکومت سے بدلے گا دنیوی حکومتیں افعال سے روکتی ہیں اور خدائی حکومت و قانون ان برے افعال کی نفرت دل میں ڈالتی ہے تو جب تک اخلاقی حالت درست نہ ہو آدمی صحیح معنوں میں آدمی نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری اور لازمی چیز ہے کہ اخلاقی حیثیت سے اس کے اندر بدعملی سے نفرت پیدا ہو جائے۔ تو شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ برے افعال پر پابندی عائد کی جائے تاکہ لوگ بدعمل نہ بنیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اخلاق درست کئے جائیں تاکہ بدعملی سے لذت حاصل نہ ہو بلکہ نفرت پیدا ہو جائے۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھانا، پینا، وہی سونا جاگنا وہی اٹھنا بیٹھنا، وہی مکان بنانا ان افعال پر طبیعت حکومت کر رہی تھی تو حیوانی زندگی بنی جب عقل حکومت کرنے لگی تو انسانی زندگی بنی اور خدا کی وحی حکومت کرنے لگی تو ایمانی زندگی بنی۔ انسانی زندگی کا جو مادہ تھا انہی افعال کو شائستہ اور بہتر بنا دیا۔ تو شریعت اسلام آپ کو کھانے پینے، تجارت وزراعت سے نہیں روکتی، حکمرانی کو نہیں روکتی مگر ان ساری چیزوں کو شائستہ بنا کر

---

① پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآية: ۲۰۱. ② الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله ج: ۴ ص: ۱۹۸۶. ③ پاره: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۵۴. ④ الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله. ج: ۴ ص: ۱۹۸۶.

رضائے خداوندی کا ذریعہ بنادے گی، تاکہ آپ کے قلب میں شائستگی پیدا ہوجائے تو اسلام جامع مذہب ہے، فقط نماز روزہ نہیں سکھلاتا بلکہ اس کا تعلق تختِ سلطنت سے بھی ہے، گھریلو زندگی سے بھی، میدانی اور جنگی زندگی سے بھی، صلح سے بھی اور جنگ سے بھی۔ کام وہی کرے گا جو انسانی زندگی میں ہوں مگر اس کا رخ دین کی طرف بدل دیتا ہے، قلب کا رخ ذرا سیدھا کردو تو دین بن جائے گا۔

شیرِ خدا علیؓ کا اخلاص...... غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہنے ابوجہل کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، خنجر اٹھایا تو ابوجہل نے نیچے سے حضرت علی رضی اللہ عنہکے منہ پر تھوک دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً خنجر چھوڑ کر کھڑے ہوگئے ابوجہل نے کہا: اے علی! میں تو تجھے بڑا دانشمند سمجھتا تھا اب تم دشمن پر قابو پاچکے تھے اور دشمن بھی ایسا جو نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے پیغمبر اور دین کا بھی دشمن ہے تو جو تمہارے نزدیک بدترین دشمن تھا، تمنے اس پر قابو پاکر چھوڑ دیا، اس سے بڑھ کر غیر دانشمندی کیا ہوگی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہنے جواب دیا کہ میں تجھ سے خدا کیلئے لڑنے آیا تھا جذبات نفسانی کی وجہ سے نہیں، تو نے جب منہ پر تھوکا تو نفس میں غیظ پیدا ہوا اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبہ سے قتل کرتا اور میری عبادت تباہ ہوجاتی، میں تو اللہ کیلئے لڑتا ہوں کہ تو اللہ کے دین کا دشمن ہے، اس کے کلمہ کو نیچا دیکھنا چاہتا ہے اگر میں اپنی ذات کیلئے قتل کرتا تو نفسانیت کا قتل کرتا للّٰہیت باقی نہ ہوتی۔

تو قتل وہی تھا، طبعی جذبے سے قتل کرتے تو نفسانی جذبہ ہوتا اور یہ ہوتا کہ محفوظ ہوجاتے لیکن ایمانی جذبے سے قتل کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خدا راضی ہو اور مجھے آخرت میں اجر ملے۔ پس جو کام انسان کرتا ہے تو وہ ہر کوئی کرتا ہے کافر کھاتا پیتا ہے، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، وہ لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے یہ بھی لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے، فرق کیا ہے! وہ بحیثیت مؤمن کے ہر کام کرے گا، لوجہ اللہ کرے گا، کافر وہی کام اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کرے گا، مؤمن میں نفسانیت ختم ہوجاتی ہے وہ تو للہ فی اللہ کام کرتا ہے تو عمل میں فرق نہیں ہوتا نیت اور روح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کا رخ زمین کی طرف ہے اور دوسرے کا عرش کی طرف۔ تو ایمانی زندگی فقط رخ بدلتی ہے، اعمال کو تبدیلی نہیں کرتی، نفس مہذب ہوجائے، تہذیبِ نفس اصل ہے تو یہ ایمانی زندگی کہلاتی ہے۔ تو اگر ہم کھانے پینے میں لگے رہیں اوڑھنے پہننے اور سنوارنے میں لگے رہیں تو حیوانیت سے آگے نہیں بڑھیں گے اور اگر قومی خدمت اور مفادِ عامہ کیلئے کچھ کیا تو زیادہ سے زیادہ انسان بن گئے لیکن مؤمن نہیں بنیں گے اور جب مؤمن بنیں گے تو ان سب چیزوں کو لوجہ اللہ کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَـهٗ رَبُّـهٗۤ اَسْلِمْ﴾ ① اے ابراہیم مسلم بن جاؤ، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اب تک کفر میں تھے اب اسلام قبول کرلیں، وہ تو پیغمبر اور ایمان کا سرچشمہ ہیں تو مسلم بننے کے معنی ہیں گردن نہاد ہونے کے یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو کہ جو کام کرو اپنے نفس کی رضا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱.

کیلئے نہ کرو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میں مسلم بن گیا، فرمایا گیا مسلم بن گئے تو اعلان کرو: ﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَااَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ② کہہ دے ابراہیم کہ میری نماز اور حج میرا مرنا جینا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ تو میں ان اعمال میں کسی کو شریک نہیں کرتا محض اللہ کی رضا کیلئے کرتا ہوں۔ مسلم بننے کے معنی یہی ہیں کہ کھانا پینا مرنا جینا لوجہ اللہ بن جائے تو ایمان آ کر اور زندگی نہیں سکھلاتا اسی انسانی زندگی کو مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

عرفانی زندگی، منشاء خداوندی کی حکومت...... اور جب یہ مکمل ہو جاتی ہے تو اب اللہ کی رضا کیلئے لڑنا، مرنا اور جینا بھی ہے۔ اب جتنا بھی اللہ کے لئے کام کرے گا حق تعالیٰ کی معرفت اور پہچان بڑھ جائے گی اور جتنی پہچان بڑھتی جائے گی قرب خداوندی نصیب ہوتا ہو جائے گا، ایمانی زندگی میں فقط عقیدہ تھا کہ مالک الملک ایک ہے اور اللہ کی رضا کیلئے کام کرتے ہیں اب فقط علم نہیں رہے گا جان پہچان ہو جائیگی اور اب منشاء کی پابندی کرنے لگے گا، اب تک تو قانون کی پابندی کر رہا تھا حکم ہوا نماز پڑھ لے کہا بہت اچھا! حلال اختیار کرو حرام چھوڑ دو، کہا: بہت اچھا! رشوت مت لو، بہت اچھا! جھوٹ مت بولو، کہا: بہت اچھا! تو جتنے احکام تھے ان کی پابندی کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ خدا کے قانون کے نیچے زندگی بسر کرے۔ یہ ایمانی زندگی تھی لیکن ایک مرتبہ زندگی کا اس سے بھی اوپر تھا وہ یہ کہ...... قانون کی پابندی کرتے کرتے آخر میں قانون ساز کے منشاء کی پابندی کرنے لگتا ہے اور قانون سے بالاتر ہو کر عمل کرتا ہے۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ کسی محبوب نے حکم دیا کہ بھئی اپنے باغ سے ہمیں پھول دیدو اور تم نے انکو پھول پہنچا دیا اور قانون سے بالاتر منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا باغ ہی اس کے سپرد کر دیا کہ پھول کیا ہے سارا باغ ہی حاضر ہے! اللہ نے مانگا کہ جو روٹی کھاتے ہو اس میں سے تھوڑا حصہ اللہ کے نام پر بھی دیدو تو منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا کھانا ہی اٹھا کر اللہ کے نام پر دیدیا یا خود روزہ رکھ لیا تو انسان ایسا جب کرے گا جبکہ حاکم سامنے موجود ہو جب سامنے موجود ہوگا تو حکم کا انتظار نہ ہوگا بلکہ وہ تو اسکی نگاہ و آبرو کو پہچان کر عمل کرے گا، اس کی منشاء اسکی پیشانی سے معلوم ہو جائے گی کہ یہ چاہتا ہے یہ نہیں۔

شاہوں کی مزاج شناسی...... اورنگ زیب ؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ان کا جو کمانڈر انچیف تھا اس نے فوجی سامان اسلحہ کی تیاری شروع کر دی اور فوج کے کانوں میں پھونک دیا کہ دکن پر جانا ہے تیار رہو تو کسی نے کمانڈر سے کہا کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے؟ کہا نہیں، بلکہ ایک دفعہ اورنگ زیب تخت پر بیٹھے ہوئے تھے میں کھڑا تھا تو مجلس میں دکن کا جوذکر آیا تو بادشاہ نے نہایت تیز نگاہوں سے دکن کی طرف دیکھا! میں سمجھ گیا کہ دکن سے ان کے دل میں زنگ ہے تو ابھی تو حکم نہیں، ضابطہ میں تو پھر ہی ہوگا مگر میں نے اورنگ زیب کا منشاء پالیا تھا تو اگر یہ عالمگیر سے

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱. ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳-۱۶۴.

دور ہوتا تب تو انتظار کرتا کہ قانونی حکم پہنچے لیکن چونکہ سامنے کھڑا تھا تو اس کی نگاہ اور پیشانی سے پہچان گیا تو منشاء کی پابندی کرتا گویا پہچان پر عمل کرنا ہے اسکو معرفت اور عرفان کہتے ہیں۔ ایک علم اور اعتقاد ہے جو غائبانہ ہوتا ہے اور ایک یہ کہ اللہ کو رسول، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا اب قانون کا انتظار نہیں اب تو نگاہ و آبرو ہی مقصد بتلا دے گی، اس کو معرفت کی زندگی کہتے ہیں اور اس کا نام ہم عرفانی زندگی رکھیں گے۔

ایرانی شہزادے کا ایک واقعہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس بادشاہ ہندوستان مہمان ہوا، انہیں لیموں کی ضرورت پڑی شہزادہ ایران کے باغ میں کھٹے لیموں تھے، خادم اجازت لینے آیا وہ سن کر منقبض ہوئے اور ترشروئی سے دیکھا اس نے باہر آ کر کہا کہ اجازت مل گئی لیموں توڑو کہا کہ بے وقوف اجازت کہاں ملی وہ تو کچھ بولے ہی نہیں اس نے کہا کہ جب شہزادے نے ترش نگاہوں سے دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ کھٹے لیموں کی اجازت دیدی گئی ہے تو پاس رہنے والے منشاء اور طبیعت میں اتنا دخل پالیتے ہیں خواہ لفظ سامنے نہ ہوں۔

تو انبیاء علیہم السلام و اولیاء عظام جو معرفتِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں وہ اپنے ذوق سے ان چیزوں کو پالیتے ہیں، جو منشاء خداوندی ہوتی ہیں، حالانکہ حکم ابھی نہیں ہوتا اور بہت سے اہل اللہ اور اولیاء کاملین کے قلب پر جو واردات ہوتے ہیں ان واردات سے ان کو منشاءِ خداوندی معلوم ہو جاتا ہے وہ شریعت کا قانون نہیں ہوتا تو اسکی تبلیغ نہیں کرتے مگر وہ خود کرنے پر پابند ہیں کیونکہ انہوں نے منشاء کو دیکھ لیا۔

حاجی امداد اللہؒ کا ادبِ غلافِ کعبہ ...... حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جو دارالعلوم کی جماعت کے شیخ ہیں وہ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تو عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہ پہنا، لوگوں نے کہا کہ شرعاً ناجائز ہے؟ فرمایا نہیں، پوچھا کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا: بیت اللہ کا غلاف سیاہ رنگ کا ہے، مجھے بے ادبی معلوم ہوتی ہے کہ اس رنگ کو قدموں میں استعمال کیا جائے یہ محض ایک ذوق اور منشاء کی بات تھی تو ادبی ذوق کے اندر بعض دفعہ آدمی وہ چیزیں کرتا ہے کہ قانون میں نہیں ہوتیں مگر اس کا ذوق کہتا ہے کہ مجھے اس طرزِ عمل پر جانا ہے، اسکو عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ تو اولیاءِ کاملین کی زندگی عرفانی ہوتی ہے کہ محض جائز و ناجائز ہی نہیں بلکہ جائز کے اندر بھی دیکھتے ہیں کہ منشاء اگر یہ ہو کہ کم سے کم کھاؤں تو ایسا کروں اور اگر یہ ہو کہ بالکل نہ کھاؤں تو میں فاقہ کروں۔

حضراتِ اولیاء کے مزاج ...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرات اہل اللہ جو فقر و فاقہ کو پسند کرتے ہیں تو شریعت نے یہ حکم نہیں دیا مگر بہت سے اولیاء کی زندگی ہے، جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کہ ایک ایک ہفتہ فاقہ کا گزارتے تو یہ شرعی حکم نہیں تھا مگر شریعت بھیجنے والے کا منشاء ان کے حق میں یہی تھا کہ جب زیادہ سے زیادہ زہد بڑھ جائے تو زیادہ سے زیادہ درجات بلند ہوں گے۔ حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کو فاقہ سے بڑی محبت تھی اور دو دو ہفتے فاقے ہوتے تھے اور وہ ارادی فاقے ہوتے تھے یہ نہیں کہ مفلس اور تنگدست تھے، دولت تو ایسے لوگوں کے قدموں میں آ کر گرتی ہے۔ تو شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر اُن کے گھر آئے، شاہ صاحب موجود

نہیں تھے تو گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ ہمارے گھر کے جو بڑے ہیں شاہ ابوالمعالی ان کے شیخ کی کس طرح خاطر مدارات کریں۔ شیخ سمجھ گئے کہ نہ دانہ ہے، نہ پانی تو ایک روپے کا غلہ منگوایا اور ایک تعویذ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے غلہ میں ڈال دو اللہ برکت دے گا۔ شیخ ایک ہفتہ ٹھہرے اور روزانہ کھایا جب چلے گئے تو وہ غلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا دو تین ہفتے کے بعد شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو دیکھا کہ دو دو وقت روٹی پک رہی ہے انہیں فقر و فاقہ سے محبت تھی تو فرمایا کہ کیا بات ہے فاقہ نہیں ہوتا، ہمارے پاس تو کچھ تھا نہیں دو وقت کی روٹی کہاں سے آگئی تو بتلایا گیا کہ آپکے شیخ آئے تھے گھر میں فاقہ تھا تو انہوں نے خود ایک روپے کا غلہ منگوایا اور تعویذ لکھ اسمیں ڈالا، اس کی برکت ہے۔ کہا: اچھا تم بڑے گستاخ ہو میرے شیخ کے تعویذ کو غلہ میں ڈال دیا ہے، نکال کر لاؤ! میں اسے اپنے سر پر رکھوں اسے لیکر پگڑی میں باندھ لیا اور وہ غلہ اسی دن ختم ہو گیا۔ اب پھر فقر و فاقہ شروع ہو گیا۔

تو یہ کہیں شریعت کا حکم تھا کہ ہفتہ ہفتہ فاقہ کرو! مگر قانون بنانے والے کا منشاء محسوس کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی زندگی ہوتا کہ درجات بلند ہوں، روحانیت ترقی کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں آتا ہے کہ دو دو مہینے گزرتے تھے کہ بیتِ نبوت میں دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ (اسودین) کھانے کو ایک ٹکڑا کھجور اور پانی پر گذر ہوتی تھی۔ تو قرآن کریم میں تو یہ حکم موجود نہیں تھا کہ آپ دو مہینے بالکل فقر و فاقہ سے رہیں، مگر قانون سے بالاتر ہو کر قانون بھیجنے والے کا منشاء آپ کے قلب مبارک پر روشن تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لذاتِ دنیا کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ دیں، وہ توجہ کریں تو حق تعالیٰ کی ذات کی طرف، علم و عرفان کی طرف۔ تو قانون ساز کے منشاء کو پا کر عمل کرنا اسے معرفت یا عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ مگر اس عرفانی زندگی کا مادہ بھی وہی ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہی کھانا پینا، رہنا سہنا وہی سب کچھ اب منشاء خداوندی حاکم بن گیا۔ تو حیوانی زندگی میں طبیعت حاکم ہوتی ہے، جو ایک جاہل بادشاہ ہے جس کے تحت آدمی جانوروں کی طرح کھاتا پیتا ہے انسانی زندگی آتی ہے تو عقل حاکم ہو جاتی ہے اور عقل میں شعور ہوتا ہے تو ذرا سوچ سمجھ کے کھاتا پیتا ہے ایمانی زندگی آتی ہے تو وحی کی رہنمائی ہوتی ہے تو عفت اور پاکدامنی پیدا ہو جاتی ہے اور عرفانی زندگی جب آجاتی ہے تو منشاء الٰہی انسان کے اوپر حکومت کرتی ہے اس وقت انسان کی زندگی نہایت بلند و بالا ہوتی ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام، اولیائے کاملین اور علماءِ ربانیین کی زندگی جس کے اندر دنیا ساری موجود ہے مگر حظِ نفس کا کوئی گذر نہیں، نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں، للّٰہیت کے جذبات کام کرتے ہیں، عداوت اور دوستی سب کچھ اللہ کیلئے ہوتی ہے نفسانی جذبات سے کچھ نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ فِی اللّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔ ① جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے، ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے منشاءِ خداوندی اور اس کی

① السنن لابی داؤد، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ ج: ۱۲ ص: ۲۹۱۔

رضا حاصل کرنے کیلئے گھر بار لٹا دیا، قانون شریعت سے آگے ہوکر ساری چیزیں وقف کیں ورنہ حق تو صدقات واجبہ ادا کرنے سے بھی ادا ہو جاتا تو گویا عرفانی زندگی بسر کرنے والا اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے، اسے عرفانی زندگی بھی کہیں گے اور احسانی بھی: اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ① اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اس مقام تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے، یہ اکمل زندگی ہے۔

وحدانی زندگی مقامِ فنائیت ...... اور جب اتنا قریب ہو جائے کہ گویا تمام اعمال محبوب کو دیکھ کر کر رہا ہے تو اب یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف دیکھنے پر قناعت کرے، بلکہ چاہتا ہے کہ نہ صرف دیکھوں بلکہ معانقہ کروں، گلے لگوں۔ تو ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ اس معرفت واحسان کے بعد جی چاہتا ہے کہ مصافحہ کروں، حق تعالیٰ سے مل لوں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: لَا يَزَالُ يَتَقَرَّبُ عَبْدِيْ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى كُنْتُ سَمْعَهُ الَّتِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا ② بندہ نوافل پڑھتے پڑھتے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ یعنی ظاہری اعضاء اس کے ہوتے ہیں قوتیں میری کام کرتی ہیں یہ گویا وہ مقام ہے کہ اپنے نفس کو مٹا کر ختم کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کر دیا اور حق تعالیٰ کی ذات اور تجلیات کے اندر غرق ہو گیا لَا يَزَالُ يَتَقَرَّبُ عَبْدِيْ ...الخ جس کو یوں کہنا چاہئے، جو کسی شاعر نے کہا:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو میری جان بن گیا کہ میرے اندر سرایت کئے ہوئے، تُو میں بن گیا اور میں تو، وحدت پیدا ہو گئی تا کہ کہنے والا نہ کہے کہ میں کوئی اور ہوں اور تو کوئی اور، اس زندگی کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے کہ وحدت پیدا ہو گئی، اور یہ مطلب نہیں کہ بندہ خدا میں غرق ہو کر اس کا جز بن گیا، اللہ تعالیٰ جزئیت سے پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی نفسانی شہوات کو ختم کر کے مناسبت مع اللہ کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جو وہ کرتا ہے میں بھی کروں گا وہ جو چاہے گا میں بھی چاہوں گا۔ کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا: اس شخص کا کیا حال ہوسکتا ہے کہ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چلتے ہوں! تو پوچھنے والے نے کہا اچھا آپ اس درجہ کے ہیں؟ فرمایا: ہاں الحمدللہ! میں تو اس مقام پر ہوں۔ اس نے کہا آخر کس طرح؟ تو فرمایا: اس طرح کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چلتے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے جو وہ چاہتا ہے وہ میں چاہتا ہوں اگر کوئی پیدا ہوتا ہے تو کہتا ہوں کہ الحمدللہ یہی بہتر تھا، اگر کوئی مرتا ہے تو کہتا ہوں الحمدللہ یہی مناسب تھا۔ میں کون ہوں اللہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الايمان والاسلام والاحسان، ج: ١ ص: ٨٧ رقم: ٩.
② الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب التواضع، ص: ١٥٨ رقم: ٦٠٢١.

کے خلاف رائے دینے والا کہ وہ تو مارے میں کہوں یہ زندہ رہے! تو سارا عالم میری مرضی پر چلنے لگا۔

ایک بزرگ شاہ دولہ کی رضا بر قضائے الٰہی...... ضلع انبالہ کے ایک بزرگ شاہ دولہ گزرے ہیں سائیں توکل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں تھے گاؤں میں بارش ہوئی جمنا چڑھ گئی کنارے پر گاؤں پڑتا تھا۔طوفان آیا ایک دیوارتھی جس کی وجہ سے پانی کچھ رکا ہوا تھا اگر وہ دیوار نہ ہوتی تو سارا گاؤں غرق ہو جاتا،لوگ بیچارے پریشان ہوکر شاہ دولہ کی خدمت میں آئے کہ حضرت اللہ کے واسطے دعاء کریں طوفان سے گاؤں غرق ہورہا ہے فرمایا: اچھا طوفان آگیا چلو! پھاوڑا لیکر چلے، گاؤں والوں کا مجمع ساتھ تھا تو جو دیوار تھی (وقایہ یعنی محافظ) تھی شاہ دولہ نے وہ دیوار ڈھانا شروع کر دی۔اب تو لوگ چلانے لگے کہ حضرت سارا گاؤں غرق ہوگا۔فرمایا: ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' بھلا میں خدا سے مقابلہ کرنے آسکتا ہوں؟...... تو یہ مقام جب نصیب ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپکو اللہ کی رضا میں فنا کر دے: ﴿وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① بس جو اللہ چاہتا ہے، وہی تم بھی چاہو اس کے خلاف چاہ نہیں سکتے جس کو وہ مرضی اور پسندیدہ قرار دیں ہم بھی اُسے پسندیدہ قرار دیں تو کہا جائے گا کہ یہ شخص فنائیت کے مقام پر پہنچ گیا۔فانی فی اللہ ہو گیا یہ نہیں کہ ایک جز بن گیا، یہ جزئیت اور بعضیت سے اللہ کی ذات پاک ہے، فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے تقاضوں کو ختم کر دے، خدا کی مشیت میں اپنے آپ کو غرق کر دے کہ جو...... ان کا منشاء وہ میرا منشاء، ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' اس کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے۔

یہاں بھی زندگی کا مادہ وہی ہے کھانا پینا، چلنا پھرنا، اوڑھنا پہننا لیکن وہ اس درجہ پر آگیا کہ قانون سے بالاتر ہو کر محض منشاء کی پابندی میں غرق اور اس کی مرضی کے اندر فانی ہو جاتا ہے اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② غزوہ بدر کے اندر آپ نے کنکریاں پھینک کر ماریں تو جس کے دماغ پر کنکر پڑی وہ دماغ کو تو کیا پورے بدن کو، قلب وجگر کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی اور سارے بدن سے پار ہو کر گذرتی تھی تو کنکری میں اتنی طاقت تو نہیں ہوتی لیکن نبی کے اندر جذباتِ حق موجود ہیں ان کی طاقت سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، نبی آلہ کار ہوتا ہے اور خدائی قوتیں اس کے اندر کارفرما ہوتی ہیں۔اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ﴾ وہ تو اللہ میاں مار رہا تھا اور جیسے فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ③ ہمارا پیغمبر ہوائے نفس سے نہیں بولتا وحی سے بولتا ہے تو وحی تو کلام خداوندی ہے مطلب یہ ہے کہ زبان تمہاری کلام ہمارا ہوتا ہے، تمہارا ذاتی کلام بھی تمہارا نہیں زبان تمہاری روشنی ہماری ہے اور چراغ تمہارا ہے جس سے گھر روشن ہو جاتا ہے اور جیسے کہ دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ④ اے نبی! جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ تمہارے ہاتھ پر نہیں، اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

ہیں: ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب ہاتھوں کے اوپر ہے تو اس میں وحدت بیان کی گئی ہے، نبی کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہا، نبی کے کلام کو اپنا کلام کہا، نبی کے منشاء کو اپنا منشاء کہا یہ جب پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی زندگی آ جائے۔

اہل اللہ کی زندگی کی جھلک...... تو میں نے پانچ زندگیاں آپ کے سامنے پیش کیں، ایک حیوانی زندگی، ایک انسانی زندگی، ایک ایمانی زندگی، ایک عرفانی زندگی اور ایک وحدانی زندگی۔ مگر ان پانچ زندگیوں میں جو دو ابتدائی زندگیاں ہیں وہ مبادی اور سبب کے درجے میں ہیں اور آخر کی دو زندگی ثمرہ کے درجے میں ہے اور بیچ کی زندگی جس کو میں نے ایمانی زندگی کہا وہ اصل مقصود ہے۔ زندگی بنانے کے لئے حیوانی بھی ضروری ہے مگر یہ زندگی اصل مقصود نہیں۔ ان ساری زندگیوں سے مقصود یہ ہے کہ یہ سارے کام رضائے خداوندی کیلئے ہوں اور یہ جو احسانی زندگی ہے کہ منشاء کو پالیا اور وحدانی زندگی یعنی فانی فی اللہ ہو گیا، یہ ثمرات کے درجے ہیں اور نتیجہ ہے۔ تو بیچ کی زندگی کیلئے دو نتیجے اور دو سبب ہیں، مقصود اصل بیچ کی زندگی یعنی ایمانی زندگی ہے جس کا نام شریعت اور اتباع شریعت ہے۔ اور قانون شریعت کی پابندی نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی ہم میں نہ ہوں۔ اس واسطے اصل مقصود ایمانی زندگی رہ گئی کہ میرا مرنا جینا اللہ رب العزت کیلئے ہو اس قانون کے تحت ہی ہو اسکو قرآن نے حیاتِ طیبہ قرار دیا ہے کہ جو شخص ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا مرد ہو یا عورت اسے ہم پاکیزہ زندگی عطاء کریں گے، یہ کیا ہوگی! اکلِ حلال کا جذبہ پیدا ہوگا، حرام خوری سے بچے گا، جتنا اس سے بچے گا حق تلفی سے بچے گا جتنا حق تلفی سے بچے گا امن کا ذریعہ بنے گا، محبوب القلب بنے گا، مبغوض نہ ہوگا۔ اگر ایک شہر میں سب کے سب حرام چیزوں کو چھوڑ کر خالص اپنے حق پر آ جائیں غیر کی حق تلفی نہ کریں تو باہمی محبت اور حسن سلوک پیدا ہوگا اور شریعتِ اسلام کے اتباع ہی میں درحقیقت امن ہے جتنا اس سے ہٹو گے برائی پیدا ہوگی کیوں کہ حق تلفیوں سے نفرت اور برائی پیدا ہوتی ہے تو اصل بنیادی چیز جس سے کسی مملکت میں امن وسکون ہو وہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع ہے اور ان کی لائی ہوئی زندگی کی پیروی ہے ان کی سنتوں کا اتباع ہے۔ تو اس طرح اکلِ حلال کی عادت پیدا ہوگی پھر عبادت میں لذت پیدا ہوگی، محبت خداوندی کا ذائقہ انسان میں آ جائے گا اور اس میں سرشار ہو کر دنیا ومافیہا کی دولتیں ہیچ نظر آئیں گی، جب باطن کی دولت انسان کو میسر آ جائے تو سب دولتیں ہیچ بن جاتی ہیں۔

عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت...... حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے ایک ایک دن میں تین تین ہزار مہمان ہوتے تھے، بڑے بڑے ہال بھر جاتے تھے تو سنجر کے بادشاہ نے یہ پوچھا کہ شیخ کے ہاں مہمان داری زیادہ ہے، اس نے اپنے اوپر قیاس کیا حالانکہ وہ اللہ پر بھروسہ کر چکے تھے پریشانی کی کیا ضرورت تھی، تو ایک پورا صوبہ جسکا نام نیمروز تھا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نام وقف کیا، شیخ کی ملکیت قرار دیکر پیپل کے پتے پر لکھ دیا کہ پورا صوبہ نیمروز آپکے نام کرتا ہوں، جسکی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے ہوتی ہے۔ شیخ نے اس کا جواب فارسی کے دو شعر میں لکھا:

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد   در دل بود اگر ہوسے ملک سنجرے

سنجر کے بادشاہ کا جو چتر ہے اسی طرح میرا منہ سیاہ ہو جائے اور میں بد بخت بن جاؤں اگر اس میں ذرا بھی ہوس آ جائے، تو میں سیاہ بخت بن جاؤں گا مجھے تمہارے صوبے کی ضرورت نہیں کیوں آگے اس کی وجہ بیان کی:

زآنگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب   من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ آیا ہے یعنی آدھی رات کی عبادت اور نفلوں کی وہ لذت جو حق تعالیٰ کے جلال و جمال کے مشاہدے ہوتے ہیں تو نیمروز کے ملک کی جو کے برابر بھی وقعت نہیں رہی۔ تو اہل اللہ ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں، اہل اللہ کو یہ لذتیں ملتی ہیں تو وہ ان وقتی لذتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ①

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو حیوۃ طیبہ کی سعادت سے نوازے اور اتباع سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توفیق نصیب فرمائے اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین!)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

① یہ کیسٹ بھی یہاں آ کر ختم ہو گئی الحمد للہ اس تقریر جس پر مرتب معذرت خواہ ہے۔

فلسفۂ علم

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! مجھے واقعی شرم محسوس ہو رہی ہے کہ فضلاء علماء اور طلباء کے مجمع میں مجھ جیسا قلیل البضاعۃ آدمی کھڑے ہو کر خطاب کرے اور بیان کرے جہاں بحمد اللہ ایسے فضلاء موجود ہیں جن کو بلحاظ رتبے کے اپنے اساتذہ کرام کے درجے میں سمجھتا ہوں تو اس قسم کے مواقع پر لب کشائی کرنا کچھ بے ادبی معلوم ہوتی ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے لیکن امر مجبور بھی کرتا ہے تو میرا خطاب جس قدر بھی ہوگا وہ طلبہ سے ہوگا گو علم کے لحاظ سے آپ مجھ سے زیادہ ہیں آپ کا علم تازہ ہے تاہم ایک درجہ میں طالب علم ہونے کا نام ہے اور میں بھی طالب علم ہوں، اس واسطے خطاب کا حقیقی رخ طلباء کی طرف ہوگا اساتذہ کرام اس سے بالاتر ہیں۔ کس چیز میں خطاب ہوگا ظاہر ہے کہ خطاب کا موضوع خود ہی درس گاہ متعین کر دیتی ہے یہ دارالعلوم ہے علم کا مرکز ہے اس لئے علم وتعلیم ہی کے سلسلہ میں چند کلمات گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

طلبِ علم طبعی جذبہ ہے...... پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان میں علم کا ذوق اور جذبہ فطری ہے یعنی پیدا کرائے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ انسان علم کو طبعًا مطلوب سمجھے ہوئے ہے ہر وقت اس کا جی چاہتا ہے کہ میرا علم بڑھتا رہے، علم کی زیادتی سے کبھی بھی وہ تھکتا نہیں ہے ہر وقت آپ کا جی چاہتا رہتا ہے کہ اچھی سے اچھی چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے اور آپ دیکھیں...... یہ طلب علم نہیں تو اور کیا ہے! جی چاہتا ہے کہ اچھے سے اچھے کلمات کان میں پڑتے رہیں...... یہ علم کی طلب نہیں تو اور کیا ہے کسی کا اخبار دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو کسی کا رسالہ دیکھنے کو صبح اٹھتے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

ہی ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ دیکھے اخبار کیا لکھتا ہے، یہ علم ہی کی طلب ہے، بازار میں کوئی جھگڑا ہو جائے، ہر طرف سے لوگ سڑک پر جمع ہو جاتے ہیں، جھگڑے میں شریک ہونے کے لئے نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ کیا قصہ ہے، کیوں ہوا ہے، بہر حال علم کی طلب طبعی ہے اور طبعیات کیلئے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، انسان کو بھوک لگتی ہے تو دلیل کے زور سے نہیں لگتی کہ آپ استدلالی قوتوں سے بھوک لگائیں بلکہ جب لگی ہوئی ہو تو لاکھ استدلال کریں وہ کبھی نہیں مٹ سکتی، پیاس دلیل سے نہیں لگائی جاتی، طبعی طور پر لگتی ہے۔ انسان میں ایک جذبہ ہے اور اس جذبے کے اُبھرنے کے بعد اگر خلاف میں بھی دلائل قائم ہوں تو بھوک نہیں رکے گی.. تو علم کی طلب بھی انسان میں طبعی ہے اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے سر سے لیکر پیر تک مجسم علم کی طلب بنادیا، انسان کے ہر ہر ذرہ میں شعور موجود ہے پورے بشرے اور پوری جلد میں احساس موجود ہے، چھونے کی قوت موجود ہے جو سختی نرمی کا اور گرمی سردی کا علم حاصل کرتی ہے، تو سر سے پیر تک گویا انسان متعلم ہے، آنکھیں صورتوں کا علم حاصل کرتی ہیں، کان آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں، ناک خوشبو بدبو کا علم حاصل کرتی ہے، زبان ذائقوں کا علم حاصل کرتی ہے۔ تو مختلف قسم کے علوم اور مشاعرِ ادراک انسان کے اندر موجود ہیں اور وہ ہر وقت ان اشیاء کی تسکین کا طالب رہتا ہے، آنکھ والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ دیکھوں، کان والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ سُنوں، یہی طلب ہوگی کہ سنوں بھی، دیکھوں بھی اور چکھوں بھی، تو ہر وقت علم کی طلب انسان کے اندر موجود ہے۔

انسان میں طلبِ علم کے آلات جن کو نمایاں تر رکھا گیا ہے......اور علم حاصل کرنے کے آلات اس کے اندر موجود ہیں، قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاللهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ماں کے پیٹ سے تو آدمی ہنر لیکر نہیں آتا۔ استعدادیں لیکر آتا ہے جوان مشاعر ادراک سے بڑھتا رہتا ہے، استعداد ابھرتی رہتی ہے، فعلیت میں آتی رہتی ہے اور ایک وقت میں جاکے انسان کامل عالم بن جاتا ہے بہر حال انسان مختلف قسم کے علوم کا مجموعہ ہے لیکن ان علوم کے مشاعر اور ان ادراکات کے مخزن زیادہ تر چہرے کے اندر موجود ہیں بینائی کی قوت آنکھ میں ہے، سماعت کی قوت کان میں ہے، شم کی قوت ناک میں ہے گویا علم کے سب بڑے بڑے مشاعر چہرے کے اندر موجود ہیں صرف ''قوتِ حس'' چھونے کی قوت سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ اتنی یُعْبَأُ بِهٖ (قابل شمار) نہیں ہے جتنا کہ یہ دوسری طاقتیں ہیں.....یعنی چھونے کی قوت ایک تو بلید قوت (موٹی اور ظاہر) ہے وہ علم حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس ملموس (چھوئے جانے والی شیء) کو معلوم کر کے سر پر نہ دیا جائے، آپ جب تک کسی چیز کو چھو نہیں لیں گے اس کی سختی نرمی معلوم نہیں ہو سکے گی کیوں کہ اتنی بلید قوت ہے کہ دور سے علم نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ معلوم کو سر پر نہ چڑھا دیا جائے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

اسی لئے شاید حق تعالیٰ شانہ نے کفار کی بلادت کو ہدایت کے سلسلہ میں یوں واضح فرمایا ہے کہ ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ① اگر کاغذوں میں بھی کتاب لکھ کر دے دیں اور وہ ہاتھوں سے چھو بھی لیں تب بھی یہی کہیں گے کہ یہ سحر ہے یہ تو جادو ہے، پھر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یعنی ماسہ (چھونے والی) جیسی بلید قوت اس سے بھی یہ نابلد ہیں جاہل ہیں، اس سے بھی انہیں ادراک حاصل نہیں ہوتا جس کو قوت ماسہ سے بھی علم حاصل نہ ہو وہ باصرہ سے کیا علم حاصل کرے گا، وہ فؤاد (دل) سے کیا علم حاصل کرے گا! وہ سماعت سے کیا علم حاصل کرے گا تو سب سے زیادہ بلید قوت انسان کے اندر لمس ومس کی قوت ہے کہ جب تک معلوم سے ٹکرا نہ دیا جائے اس وقت تک اسے علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اُونچی قوتیں یہی دو تین نکلتی ہیں ایک سننے کی قوت، ایک دیکھنے کی، ایک سمجھنے کی۔ اسی واسطے قرآن کریم میں اکثر مواقع پر ان ہی تین قوّتوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَآ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ② جہنم کیلئے ہم نے تیار کر رکھے ہیں بہت سے لوگ، وہ کیسے ہیں! ان کیلئے دل ہیں مگر سمجھنے کی طاقت نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھنے کی ان میں ہمت نہیں کہ کلمہ حق کو اور کلامِ حق کو یا معاملۂ حق کو دیکھیں، کان ہیں مگر سن نہیں سکتے۔ تو تین چیزیں ذکر کیں ایک کان، ایک آنکھ اور ایک قلب تو گویا قابل شمار اور قابل اعتداد یہی تین قوتیں ہیں، یہاں ماسہ کا ذکر نہیں کیا سمع بصر اور فؤاد سننا دیکھنا اور سمجھنا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ تو سمع، بصر اور فواد کو جواب دہ قرار دیا گیا۔ یہ نہیں کہا کہ ہاتھ سے جواب طلب کیا جائے گا اگر طلب کیا بھی جائے گا تو ان کے واسطے سے۔ تو اکثر جگہ انہیں تین طاقتوں کو جمع کیا گیا ہے۔

اعضائے علم کی اعضائے عمل پر فضیلت ...... یہ تینوں چاروں طاقتیں انسان کے چہرے میں جمع ہیں اور چہرہ سب سے بلند اور بالا چیز ہے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ قوتِ علمیہ قوت عملیہ سے افضل ہے، جو علم کا مقام ہے وہ حسی طور پر بھی بلند رکھا گیا ہے، آنکھ کی طاقت پیروں میں نہیں رکھی گئی، سننے کی طاقت ہاتھ کی انگلیوں میں نہیں رکھی گئی، اللہ پاک قدرت دکھلانے کے لئے قیامت کے دن یہ ساری طاقتیں بدن میں بانٹ دیں گے مگر ان طاقتوں کا اصل موضوع چہرہ قرار دیا گیا ہے جو اتنا باعزت ہے کہ احترام کے وقت اسے چوما جاتا ہے، پیشانی چومتے ہیں، سامنے جھکتے ہیں، اسی لئے چہرے پر مارنے کی ممانعت ہے کہ چہرے پر مت مارو، حرمت کے خلاف ہے، بہرحال ایک معظم اور محترم ظرف ان کیلئے تجویز کیا گیا ہے، اس سے علم کی عظمت اور بزرگی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷. ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۶.

کہ جب علم عظمت والی چیز ہے تو عالم عظمت والی چیز کیوں نہ ہوگی! اس لئے آنکھ عالم ہے وہ اوپر رکھی گئی، کان عالم ہے تو اوپر رکھا گیا، ناک عالم ہے تو اوپر رکھی گئی گویا یہ چہرہ یوں سمجھئے علماء کی ایک بستی اور دارالعلوم ہے جس میں مختلف علوم رکھے ہوئے علماء جمع ہیں، کوئی صورتوں کا عالم، کوئی آوازوں کا عالم، کوئی ذائقے کا عالم، کوئی خوشبو کا عالم.....تو مختلف قسم کے علوم کے علماء جمع ہیں، جنہیں اوپر جگہ دی گئی ہے۔

انسان میں دوسرے اعضاء بھی ہیں مگر وہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں ہاتھ پیر سے علم کا تعلق نہیں عمل کا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ آخرت میں جب کوئی عذاب دیا جائے گا تو یہ کہا جائے گا: ذٰلِکَ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ. تو کسب اور عمل ہاتھوں پیروں کی طرف منسوب کیا گیا تو ہاتھ اور پیر یہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں، عالم قسم کے اعضاء نہیں گو مزدور میں بھی تھوڑا بہت علم تو ہوتا ہے بالکل پتھر تو وہ بھی نہیں ہوتا تو کچھ چھو لے وغیرہ (لمس) کا علم ان کے اندر ہے، ہاتھ چھو کر کچھ پتہ چلا لیتا ہے، پیر چھو کر پتہ چلا لیتے ہیں مگر ان کی قوت ایسی معتدبہ قوت نہیں کہ اسکو مستقل علم والا شمار کیا جائے، تو مزدور کو بلکہ ہر کس و ناکس کو تھوڑا بہت تو علم ہوتا ہی ہے۔ اعلیٰ ترین علم جو قابل اعتداد اور قابلِ شمار ہو وہ وہی علم ہے جس کے علماء چہرے میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تو مزدور طبقہ نیچے ہے اور عالم طبقہ اوپر، اس کو فضیلت دی گئی اور اس کو مفضول قرار دیا گیا تاکہ اہلِ علم یہ سمجھ لیں کہ ہمارے پاس جو چیز ہے وہ انتہائی شرف کی چیز ہے وہ انتہائی عزت کی چیز ہے۔

علم کی عزت استغناء میں ہے...... اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی عزت کریں اور جتنی علم کی عزت کریں گے اتنا عالم کی عزت ہوگی جتنا وہ اپنے علم کی بے حرمتی کرے گا خود عالم کی بے حرمتی پیدا ہوتی جائے گی۔ اگر ایک عالم خود اپنے علم کی عظمت نہ کرے تو دوسروں کو کیا مصیبت پڑی کہ اس کے علم کی عزت کریں۔ پہلے اسے اپنے وقار کو سنبھالنا ہے جب وہ اپنے وقار کو محسوس کرے گا تو دنیا اس کے وقار کے آگے جھکنے کے لئے مجبور ہوگی۔ اور اگر وہ خود ہی علم کو ذلیل کرے تو پھر اس کی عزت کرنیوالا کوئی نہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہارون الرشید نے فرمائش کی کہ امین اور مامون کو مؤطا پڑھا دی جائے اس کے لیے کب تشریف لائیں گے؟ فرمایا کہ علم کا یہ کام نہیں کہ وہ در بدر پھرے، علم کے طالب کا کام ہے کہ وہ اس کے پیچھے پھرے اور فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے، اگر تم ہی اس کا احترام نہیں کروگے تو دنیا میں کوئی اس کا احترام کرنے والا نہیں ہوگا۔

تو عالم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی عزت کو باقی رکھے اور وہ عزت استغناء ہے جتنا دوسروں کی طرف حاجت مندی اپنے اندر بڑھائے گا اتنا ہی علم کو بھی ذلیل کرے گا خود بھی ذلیل ہوگا اس کے اندر اگر طلب ہو تو صرف آخرت کی ہو دنیا کی نہ ہو۔

طالبِ دنیا کو دنیا بھی نہیں اور طالب دین کو دونوں ملتی ہیں...... دنیا طلب سے نہیں آتی بلکہ استغناء سے آتی ہے یہ سمجھ کا کھیل ہے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ جتنا طالب بنیں گے اتنی ہی دنیا آئے گی، اس کے اگر آپ

طالب بن گئے تو اس کے سامنے ذلیل ہو گئے دنیا آئی تو کیا ہوا آپ کو ذلیل کر کے آئی۔ عزت داری یہ ہے کہ استغناء ہو پھر دنیا آئے اَتَتِ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں پر آئے۔

مجھے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بانی دارالعلوم دیوبند ہیں کا واقعہ یاد آیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ چھتہ کی مسجد میں تشریف رکھتے تھے، شیخ الٰہی بخش صاحب میرٹھی جو لکھ پتی لوگوں میں سے تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد تھے ملنے کیلئے آئے۔ اور بہت بڑا ہدیہ لیکر آئے دو تھیلیاں جس میں اشرفیاں اور ہزاروں روپے کا مال تھا مگر دل میں یہ سوچتے ہوئے آئے کہ حضرت کو آج اتنا بڑا ہدیہ دوں گا کہ اب تک کسی نے نہیں دیا ہوگا۔ تو اپنے ہدیہ کے اوپر ایک فخر کی کیفیت موجود تھی:۔

مگر پیش اہل دل نگہ دارند دل   تانہ باشد از گماں بد خجل

اہل اللہ کے سامنے دل تھام کے جانا چاہیے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں احساس پیدا کر دیتا ہے کہ فلاں کے دل میں کیا چیزیں کھٹک رہی ہیں وہ علاج بھی کرنا جانتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اسکا ادراک ہوا کہ انکے دل میں فخر و ناز کی کیفیت ہے، یہ بڑی چیز سمجھ رہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوا رہے تھے اب وہ بیٹھ تو سکتے نہیں تھے، جب تک کہ حضرت اجازت نہ دیدیں تو کھڑے رہے اور ہاتھ میں دونوں تھیلیاں ہیں، ان میں وزن تھا، کھڑا ہوا نہیں جاتا اور کپکپا رہے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ تو حجامت بنواتے ہوئے چہرہ کو نیچے کر دیا، دیکھا ہی نہیں کون آیا! تجاہل عارفانہ کے طور پر، پھر دائیں طرف کو منہ پھیرا تو وہ پشت کی طرف سے چکر کھا کر دائیں طرف آئے تو آہستہ سے بائیں طرف منہ پھیر لیا، پھر وہ ادھر کو آئے تو ادھر کو منہ پھیر لیا۔ غرض انکو اسی طرح چکر دیئے یہاں تک کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت سے فارغ ہو گئے، تب ان کی طرف دیکھا، انہوں نے سلام عرض کیا حضرت نے معمولی جواب دیا، رسمی مزاج پرسی کے بعد بیٹھ گئے اور وہ ہدیہ پیش کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا حضرت آپ کو ضرورت نہیں، ہمیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر حضرت قبول نہ فرمائیں یا حاجت مند نہ ہوں تو طلبہ کو تقسیم کر دیں۔ فرمایا: کہ الحمد للہ! میری آمدنی ساڑھے سات روپے مہینے کی ہے اور میرے گھر کی ساری ضروریات اس میں پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی روپیہ آٹھ آنہ بچ جاتا ہے تو میں پریشان رہتا ہوں کہ کہاں رکھوں گا، کس طرح حفاظت کروں گا، کسے بانٹوں گا! میں حاجت مند نہیں ہوں آپ واپس لے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت طلباء کو تقسیم کر دیں، فرمایا کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں طلبہ کو بانٹوں! آپ ہی جا کر تقسیم کر دیں۔ غرض انہوں نے مختلف عنوانوں سے چاہا کہ قبول فرمالیں مگر حضرت نے قبول نہیں فرمایا...... لیکن اس زمانے کے رئیس غیرت دار تھے تو یہ غیرت آئی کہ یہ مال پھر اپنے گھر کو واپس کیسے لے جاؤں! تو وہاں سے اٹھے، مسجد کی سیڑھیوں پر حضرت کی جوتیاں پڑی ہوئی تھیں ان

① السنن لابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الھم بالدنیا، ص: ۱۲۸، رقم: ۴۰۹۵.

جوتیوں میں وہ روپیہ بھر کر روانہ ہو گئے۔ (غالباً جوتیوں کے اوپر نیچے روپے ڈال دیئے ہوں گے) حضرت اٹھے اور جوتیوں کی تلاش ہوئی، جوتے نہیں ملتے ادھر ادھر سب جگہ دیکھا، حافظ انوار الحق صاحب حضرت کے خادم تھے انہوں نے دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت جوتیاں تو روپیوں میں دبی ہوئی یہاں پڑی ہیں۔ فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ! آئے اور آکر ان جوتیوں کو جھاڑا جیسے مٹی جھاڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد جوتے پہن کر روانہ ہو گئے۔ وہ روپیہ مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا رہا۔ حافظ انوار الحق مرحوم ساتھ ساتھ تھے تھوڑی دور آگے جا کر مسکرا کر دیکھا تو حافظ جی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا حافظ جی دیکھا آپ نے! دنیا ہم بھی کماتے ہیں دنیا دار بھی کماتے ہیں فرق اتنا ہے کہ دنیا ہماری جوتیوں میں آکر گرتی ہے، ہم ٹھوکریں مارتے ہیں اور دنیا دار دنیا کی جوتیوں میں جا کے سر گڑتے ہیں، وہ ان کو ٹھوکریں مارتی ہے۔ تو کماتے ہم بھی ہیں دنیا دار بھی، فرق اگر ہے تو عزت اور ذلت کا فرق ہے، ''غناء'' اور ''احتیاج'' کا فرق ہے۔

دُنیا استغناء اور توکل علی اللہ سے ملتی ہے...... میں تو اس سے بھی زیادہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دنیا طلب کرے تو طالب نہ بنے تارک بن جائے تو دنیا آئے گی، طالب کے پاس مشکل سے آتی ہے بلکہ اس کو اور زیادہ ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو آدمی مستغنی ہو تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی، محتاج بنے گا تو خود ذلیل ہوگا۔ تو علم جیسی دولت ملنے کے بعد بھی اگر آدمی جھکے اور یہ خیال کرے کہ کل کیا کماؤں گا؟ کہاں سے آئے گا؟ کیا صورت ہوگی؟ تو اس نے تو انتہائی طور پر اپنے علم کو ذلیل کر دیا۔ اللہ نے دو کام رکھے ہیں: ایک اپنے ذمہ لیا ہے اور ایک آپ کے ذمہ ڈالا ہے، فرمایا کہ: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾ ① آپ کے ذمہ یہ کام ہے کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا امر کرو اور تم خود بھی اس کے اوپر جم جاؤ اور ہمارے ذمہ یہ ہے کہ تمہیں روٹی دیں گے محتاج نہیں رکھیں گے۔ عزت وشرف بھی دیں گے رزق میں ہر چیز آجاتی ہے، ہر چیز تمہیں دیں گے۔ تو ایک کام اپنے ذمہ لیا اور ایک آپکے ذمہ کیا، آپ نے تو اپنی ذمہ داری کی چیز چھوڑ دی اور اللہ نے جو اپنے ذمہ لی تھی اسے اختیار کر لیا کہ روٹی کہاں سے کھائیں گے، عزت کہاں سے ملے گی، تو اپنا فریضہ تو چھوڑ دیا اس سے تو یوں محروم ہوئے اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا اسے اختیار کر لیا۔ اللہ کے کام کو آپ نبھا نہیں سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ وہ چیز رہی اور نہ یہ چیز رہی۔ تو طالب علم کے ساتھ اگر آدمی طالب دنیا بھی ہو تو نہ علم رہتا ہے نہ دنیا آتی ہے اور اگر علم محض کا طالب بن جائے تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی۔ آپ کے سامنے آپ کے سینکڑوں بزرگوں کی نظیریں موجود ہیں۔

دار العلوم دیوبند کا مشکل وقت اور توکل علی اللہ...... دار العلوم دیوبند قائم ہوا کس شان سے! ایک پائی ہاتھ میں نہیں۔ اہل اللہ کے قلب میں دیانۃً ایک جذبہ پیدا ہوا کہ دار العلوم قائم کیا جائے۔ وہیں چھتے کی مسجد میں ہی

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۳۲.

بیٹھے بیٹھے مدرسہ قائم ہوگیا۔انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد بیٹھے ہوئے تھے،تو وہ مدرسہ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہوا تھا آج بڑھتے بڑھتے اس میں ڈیڑھ ہزار طلبہ رہتے ہیں، پچاس ساٹھ استاذ رہتے ہیں،اصول میں یہ شرط رکھی ہے کہ مدرسہ کی مستقل آمدنی نہ بنائی جائے۔ نیز گورنمنٹ سے بھی امداد نہ لی جائے۔امداد کی طرف رجوع نہ کیا جائے، جب کہ ساڑھے چھ سات لاکھ روپے کا سالانہ خرچ ہے،حکومت کے اکاؤنٹنٹ دارالعلوم آئے،انہوں نے پوچھا کہ دارالعلوم کا کیا خرچ ہے؟ میں نے کہا پچاس ہزار روپے ماہوار۔کہا کہ:خزانے میں کتنا ہے؟اس وقت کل پندرہ ہزار تھا میں نے بتایا:تو کہنے لگے اس ماہ کا خرچ کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ کیسے چلے گا: یہ بتا سکتا ہوں کہ ضرور چلے گا۔اس نے کہا: یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو کوئی اصول کی بات نہیں؟ میں نے کہا: یہ تو اصول سے بالاتر بات ہے،اصول کی بات نہیں۔اب اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے کہا:اسے ہمارے یہاں توکّل کہتے ہیں، کہنے لگے توکّل کیا چیز ہے؟ تجارت ہے کوئی زراعت ہے؟ میں نے کہا: توکّل یہ ہے کہ اللہ میاں دلوں کو مجبور کردیتے ہیں کہ تم فلاں جگہ دو،میرا کام ہورہا ہے تمہیں دینا پڑے گا۔وہ جھک ماریں گے اور آکے دیں گے،ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم خوشامد کرتے پھریں تو مال عزت سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور ذلت سے بھی۔ایک فقیر اگر بھیک مانگنے جائے،اسے آپ ذلیل سمجھیں گے کہ میرے پاس سے مال لیتا ہے۔اور ایک بادشاہ بھی قوم کے پاس سے مال لیتا ہے،لیکن اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔وہ بھی تو چندہ ہی لیتا ہے اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔اس لئے کہ وہ استغناء کے ساتھ لیتا ہے،یہ احتیاج کے ساتھ لیتا ہے خود حضرات انبیاء علیہم السلام تبلیغی کاموں اور خیر میں ترغیب سے چندہ لیتے اور خرچ کرتے ہیں لیکن ان کی عزت اور شرف میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ حالانکہ (بظاہر وہ بھی) قوم سے مانگتے ہیں تو مانگنا مانگنا بھی برابر نہیں ایک حاجت مند اور ذلیل بن کر مانگنا ہے ایک غنی بن کر اور اپنے نفس کو بالاتر کر کے مانگنا اس میں بڑا فرق ہوجاتا ہے۔

رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے بندہ پر نہیں ......تو حق تعالیٰ نے علم کی عزت اور شرف کو قائم رکھنے کے لئے ایک حسی صورت اختیار فرمائی کہ علماء کی بستی چہرے کو بنایا جو سب سے اونچی ہے تا کہ اہل علم کا شرف واضح ہوجائے جو علم کی طرف منسوب ہیں وہ بالاتر ہیں،ان کا کام جھکنا نہیں ہے۔اور اس کے امر کی یہ صورت اختیار فرمائی: ﴿وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ الخ﴾ ① ہمارے ذمہ ہے ہم رزق دیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ تم علم کے طالب بنے رہو علم کے اندر لگے رہو۔تو میں نے دارالعلوم دیوبند کی نظیر پیش کی تھی تو آپ کا یہ مدرسہ (عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی ۵) بھی تو اسی کی نظیر ہے مولانا محمد یوسف بنوری (نوراللہ مرقدہٗ) کھڑے ہوئے، وہ کوئی جاگیردار نہیں ہیں۔ان کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی اسی طرح آکے بیٹھ گئے ایک پائی ہاتھ میں نہیں ہے، رہنے کو حجرہ نہیں، کتاب رکھنے کو جگہ نہیں لیکن بیٹھ گئے محض خدا کے بھروسہ پر، دنیا پر بھروسہ نہیں کیا تو اَتَتِ الدُّنيَا وَهِيَ

① پارہ:۱۶،سورۃ طٰہٰ،الآیۃ:۱۳۲۔

رَاغِمَةً ① تو ناک رگڑتی ہوئی دنیا آنی شروع ہوئی۔ آج لاکھوں کی عمارتیں بھی کھڑی ہیں، کتب خانہ بھی بن گیا کیا کہیں جا کے بھیک مانگی! انہیں اللہ سے بھیک مانگی، اللہ میاں نے اپنی مخلوق کو متوجہ کر دیا۔ انہوں نے مجبور ہو کر جھک مار کر دیا...... اور دینا پڑے گا۔

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شکایت کی گئی کہ یہ خانقاہ گنگوہ میں بغاوت کا مرکز ہے اور یہ مولوی خانقاہ میں جمع ہو کر حکومتِ برطانیہ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور افغانی حکومت کو ہندوستان پر چڑھانا چاہتے ہیں تا کہ برطانیہ حکومت کا تختہ الٹ جائے۔ سی، آئی، ڈی کا انسپکٹر مقرر ہوا اور وہ بھی ہندو مقرر کیا گیا تا کہ وہ بے لاگ بات کرے۔ وہ آیا اس نے خانقاہ کو دیکھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، ان لوگوں کو سازش سے کیا کام! انہیں مکر و فریب سے کیا کام! یہ تو رات دن اللہ کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ مخبر نے یہ رپورٹ کیسے کی کہ یہ سازشی لوگ ہیں کیونکہ یہاں چوبیس گھنٹے سوائے ذکر اللہ کے کوئی کام نہیں، بہر حال وہ دیکھتا رہا سوچتا رہا، آخر کار ظاہر ہوا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آ کر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے! فرمایا بھائی! دیکھ لو ہمارے ہاں کوئی چھپی ہوئی بات تو ہے نہیں، کوئی سازش نہیں جو بھی ہے وہ تمہارے سامنے ہے، اس پر اس نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے؟ فرمایا: توکل! اس نے کہا: توکل کیا چیز ہے؟ فرمایا: توکل یہ چیز ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، وہ خدمت کرتے ہیں تو یہ خانقاہ کا کام چل رہا ہے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیسے چل رہا ہے، کوئی جاگیر نہیں، کوئی وقف نہیں، کوئی تجارت نہیں، آخر یہ چل کیسے رہا ہے، محض یہ خیال کر کے بیٹھ گئے کہ لوگوں کے دلوں میں آئے گا تو کام چلے گا لوگوں کے دلوں میں نہ آئے تو کیا ہو گا! غرض اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ توکل کیا چیز ہے ایک ہفتہ کے بعد جب وہ جانے لگا تو نہایت عقیدت مندی سے آ کر اس نے حضرت سے دعائیں چاہیں اور دس روپے نکال کر ہدیہ کے طور پر پیش کئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرا دل مجبور کر رہا ہے آپ اسے واپس نہ کریں۔ اگر آپ واپس کریں گے تو میرا دل دُکھے گا۔ میری نیاز مندی کا تقاضا ہے کہ آپ قبول فرمالیں! فرمایا: آخر آپ سے کس نے کہا؟ کہنے لگا: کہا تو کسی نے نہیں، بس دل میں یہ آیا، فرمایا: یہی ہے وہ توکل جو کل تک آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو توکل سب سے بڑی جاگیر ہے۔ مگر اسکا حاصل یہ ہے کہ احتیاج صرف اللہ کی طرف ہو۔ غیر اللہ کی طرف نہ ہو تو غیر اللہ خود بخود آ کے جھکے گا۔

علم کی ناقدری کرنیوالے سے اسلام کا شرف بھی چھن سکتا ہے...... ایک طالب علم کے ذہن میں یہ آنا کل کیا کریں گے، علم پڑھ کر ہم روٹی کہاں سے کمائیں گے پیسہ کہاں سے ملے گا؟ یہ انتہائی احتیاج مندی اور ذلت نفس کی بات ہے جس کو اللہ علم کی دولت دے اور اس کی سوچ یہ ہو کہ روٹی کہاں سے آئے گی۔ ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

﴿الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ ① کا مصداق ہے کہ اعلیٰ اور شرف کی چیز پاس ہے پھر ادنیٰ کی طرف توجہ کر رہا ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دنیا ملے گی۔ لیکن اگر وعدہ نہ ہوتا اور نہ کبھی ملتی صرف علم مل جاتا تو دنیا وما فیہا کی دولت میسر آ گئی تھی، کسی دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انتہائی ناقدر انسان ہے کہ اللہ اعظم ترین شرف دے اور پھر وہ ارذل ترین چیز کو اس کے مقابلہ میں چاہے یہ تو یہود کا سا قصہ ہو گیا کہ اللہ نے ''من وسلویٰ'' دیا انہوں نے کہا کہ ہمیں تو لعبل و پیاز چاہیے اس کے مقابلہ میں ذلیل چیزیں چاہئیں.....ایک عالم یا مطیع یا طالب حق کی یہ شان نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تو اس کے اوپر شرف وکمال خالص کرے اور وہ اس کے مقابلہ میں نقص وعیب اور بری اور گندی چیزوں کا طالب بن جائے.....یہ انتہائی بے قدری ہوتی ہے اس میں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مسلم کا شرف بھی نہ چھن جائے۔ اس لئے کہ علم پاک چیز ہے پاک ہی ظرف میں بھرا جائے گا۔ جس ظرف کے اندر گندگی موجود ہو اور وہ غیر اللہ اور دنیا کا طالب بنا ہوا ہے تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے سونے کے ظرف میں نجاست بھر دی ہو.....تو محبت صرف ایک چیز کی رہے دنیا استعمال کی چیز ہے محبت کی چیز نہیں استعمال جتنا چاہے کرو محبت ایک ذات سے رہنی چاہیے جس کا آدمی طالب ہے تو علم کے شرف کے بعد کسی غیر علم کی طلب کرنا ایسا ہے جیسے ایک عالم طلب کرے کہ میں تو جاہل بن جاؤں تو بہتر ہے یہ کوئی دانش ہوگی؟ خدا علم دے اور وہ جہالت کو چاہے۔

تو بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اس چہرے کے اندر مشاعر ادراک رکھکر گویا اس طرف ایماء (اشارہ) کیا ہے کہ علم اونچی چیز ہے اور جو علم کی طرف منسوب ہوں وہ بھی اونچے بن کر رہیں (اور ان کے اونچے ہونے کا راز استغناء میں ہے دنیا طلبی میں نہیں) وہ نیچے بن کر نہیں رہ سکتے اس لئے کہ اللہ نے ان کو یہ شرف دیا ہے اور پھر علم، عمل سے کہیں زیادہ افضل ہے اسی لئے جو عملی اعضاء ہیں ان کو پست رکھا گیا یعنی ہاتھ کا رخ نیچے کی طرف ہے پیر کا رخ نیچے کی طرف ہے اور ناک کان کا رخ اوپر کی طرف جاتا ہے تو عمل والی چیزوں کو حسی طور پر بھی پست رکھا گیا۔ اور ان کی وضع بھی ایسی جیسے وہ پستی کی طرف جا رہے ہوں اور کان ناک آنکھ کو اونچا بنایا۔ کیوں کہ یہ علم کی طرف منسوب ہیں۔

اعضائے عمل اعضائے دولت سے افضل اور نمایاں ہیں......اور عمل سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ کی چیز مال ہے یعنی علم عمل سے افضل ہے عمل دولت سے افضل ہے تو دولت سب سے زیادہ گری ہوئی چیز ہے اس واسطے کچھ اعضاء ایسے ہیں جو دولت کو جمع کرتے ہیں......وہ معدہ اور جگر ہیں وہاں نجاست بھری رہتی ہے تو گویا ایک اعضاء ہیں اور ایک اعضائے عمل، یہ پھر بھی بہ نسبت معدے امعا (انتڑیاں) اور بنسبت مثانے وغیرہ کے عزت دار ہیں کیوں کہ معدے وغیرہ کے اندر تو نجاست اور گندگی بھری ہوئی ہوتی ہے اور یہ ان کے لئے لازمی ہے اگر یہ اعضاء (دولت) بھرے ہوئے نہ ہوں تو زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اگر معدے کے اندر سے یہ سب کچھ نکال لیا جائے تو آدمی ختم ہو جائیگا اس کی بھی (بقائے حیات کی خاطر) ضرورت ہے لیکن حق تعالیٰ نے اس کو مخفی رکھا۔ کیوں کہ گندی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٦١.

چیز ہے لوگوں کے سامنے نہ آنی چاہیے، اس کو اندر رکھا۔

اعضائے دولت انکی حقیقت اور انکو مخفی رکھنے کی حکمت...... ہاں البتہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ناک، کان اور آنکھ تو علماء ہیں اور ہاتھ پیر مزدور ہیں۔ اور وہ سرمایہ دار ہیں جو اندر چھپے ہوئے ہیں بحیثیت سرمایہ دار کے..... اللہ کسی اور سبب سے سرمایہ دار کو عزت دے وہ اور چیز ہے لیکن "مِنْ حَیْثُ اَنَّہٗ" (صرف اسی بنیاد پر کہ) سرمایہ دار بحیثیت سرمایہ دار ہونے کے وہ نجاست کا محل ہے گندگی کا محل ہے کوئی بڑی چیز نہیں ہے باقی طہارت کا طریقہ بتلا دیا گیا کہ خود بھی پاک بنو اس مال کو بھی پاک کرو مثلاً زکوٰۃ رکھدی۔ صدقات رکھدیئے کہ مال کو پاک بناؤ... تو معدے میں سب کچھ بھرا ہوا ہے لیکن فضلات نکالے جاتے ہیں۔ اب اگر فضلات نہ نکلیں تو معدہ بھی بگڑ جائے گا۔ تو اگر مال میں سے کچھ نہیں نکلے گا اور صرف سرمایہ دار کے پاس رہ جائے گا گویا وہ نجاست معدے میں ہی بھری رہے گی۔ تو معدہ بھی گیا انسان بھی گیا، سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس میں سے کچھ فضلات بھی نکلتے رہیں...... (یعنی ایک معینہ مدت کے اندر جو علامت صحت ہے۔ بصورۃ دیگر علامت مرض) تاکہ اس کے اندر پاکی پیدا ہو۔ یہ نہیں ہوگا تو سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ چھڑ جائے گی۔ معدہ الگ لڑے گا اور ہاتھ پاؤں الگ لڑیں گے (اور دماغ بھی، تو علماء علم بھی اس سرمایہ دار کی حرکت "دولت کا ناجائز اجتماع" کے الگ خلاف ہوں گے) اس لئے کہ جب فضلات کو نہیں نکالے گا تو بیماریاں پیدا ہوں گی تو ہاتھ بھی، پاؤں بھی اور دماغ بھی سب ہی چیزیں بیماری کا شکار ہوں گے۔ اس لئے ہاتھ بھی چاہتا کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے، پیر بھی چاہتا ہے کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے تو گویا یہ ایسی مثال ہے کہ زکوٰۃ دے دی گئی تو میل کچیل نکال دیا گیا، مال پاک ہو گیا۔

تو تین قسم کے اعضاء رکھے گئے۔ ایک اعضاء العلم، ایک اعضاء العمل اور ایک اعضاء الدولۃ، یا اعضاء المال، جن کے اندر سرمایہ جمع رہتا ہے سرمایہ دار کا کام یہ ہے کہ وہ زائد حصہ نکالتا رہے اور باقی حصہ جمع کرتا رہے۔ مزید زیادہ نکال دے تو طبیعت ہلکی رہے گی، لیکن فرض اتنا کیا گیا کہ موقع بموقع نکالے، ایک حد اعتدال کے اندر خارج کرے بالکل معدہ خالی کر دیا تو خالی خولی ہو کے کہیں ختم نہ ہو جائے۔ لیکن اگر تمہارے اندر کوئی دوسری قوت بھر دی جائے تو بے شک سب کچھ نکال دو وہ الگ چیز ہے کہ آدمی روحانی قوت سے زندہ رہنے لگے اور کھانا پینا ترک کر دے مگر یہ چیزیں ہیں۔

اصول اور قاعدے کی بات یہی ہے کہ بقدر ضرورت جمع رہے بقدر ضرورت نکلتا رہے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے جب یہ بند ہو جائے گا تو معدہ بگڑ جائے گا خلو محض ہوگا تو فنا طاری ہوگی، تو کچھ جمع رہے کچھ خلا رہے، دونوں چیزیں ہوں تب ہی صحت برقرار رہ سکتی ہے تو اعضاء العلم کو اونچا رکھا گیا اعضاء العمل کو پست رکھا گیا۔ اور اعضاء المال کو مخفی رکھا گیا کیونکہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو نمایاں کیا جائے۔

''علم'' اللہ کی اور ''مال'' معدے کی صفت ہے......اب اگر ایک عالم کی آنکھ گندگی کو پسند کرنے لگے تو کیا یہ دانش کی بات ہوگی؟ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ آنکھ یوں چاہے کہ میں معدہ بن جاؤں میرے اندر نجاست بھر دی جائے۔ تو اللہ نے اس کو لطافت دی اور اس کو کمال دیا۔ اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر عیب بھر جائے میرے اندر نقص بھر جائے......تو اللہ نے پاکی بھری ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر گندگی بھر جائے۔ یہ تو عقل و دانش کے خلاف اور علم کے بھی خلاف ہے مودت کے بھی خلاف ہے اخلاقی طور پر بھی بری چیز ہے اور علمی طور پر تو ہے ہی۔

بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اہل علم کو عزت و عظمت بخشی ہے.....اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ''علم'' اللہ کی صفت ہے اور مال معدے کی صفت ہے تو اللہ کی ذات عالی اور صفات کمال......ظاہر ہے کہ ان سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوسکتی ساری بھلائیاں انہی کیلئے ہیں اور مال و دولت یہ معدے کی صفت ہے یہ روا زنہ متغیر ہونیوالی چیزیں ہیں۔ نہ ان کیلئے بقاء ہے اور نہ ان کیلئے دوام ہے یہ ہمہ وقت علیٰ شرف السقوط اور علیٰ شرف الزوال رہتی ہیں ہر وقت افتاد کا شکار ہونے والی ہیں۔

اگر اللہ کی صفت کسی بندے کے اندر آئے گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنا نمائندہ بناتے ہیں کہ تو میری صفت کا حامل ہے اس کو دنیا کے اندر پھیلا اور وہ کہے کہ میں تو معدے کی صفت کا حامل بننا چاہتا ہوں میں تو گندگی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اسے ہی پھیلانا چاہتا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ یہ عقل کا کھوٹ ہوگا اور یہ گویا اس منصب کو بٹا لگانے کا باعث ہوگا کہ جس منصب کے لئے اللہ نے اسے دار العلوم میں جمع کیا کہ یہ طالب علم ہے اس کی سعادت اس کو کھینچ کر لائی ہے کہ ایک مرکز علم میں اس کو پہنچا دیا، کیا اس کے لئے یہ شکر کا مقام نہیں ہے کہ اسے کسی سینما کا ملازم نہیں بنایا کسی تھیٹر کا کارکن نہیں بنایا، اپنی صفت اور اپنی اونچی صفات میں بھی جو اونچی صفت تھی یعنی علم کی صفت اس کا حامل بنا کر ایسی فکیٹری میں لاکر بیٹھا دیا۔ جہاں علم کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ علم ہی کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کتنا بڑا شکر کا مقام ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنے (علم کے) لئے منتخب کرلیا۔ اور ان کاموں کے لئے منتخب نہیں کیا جو گندگی کے کام ہیں۔ پاک کام کیلئے منتخب کیا۔ اس لئے اس شرف پر انسان جتنا بھی ناز کرے، شکر کرے اتنا ہی کم ہے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا. اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ ، وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِى الطُّغْيَانِ''. (1)

''تو ایک علم ہے جو رضائے رحمٰن کی طرف لے جاتا ہے اور ایک مال ہے جو طغیان کی طرف لے جاتا ہے''

---

(1) المعجم الكبير للطبراني، باب العين، عبدالله بن مسعود الهدبى ج: ۹ ص: ۲۶. علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ امام بیہقی نے یہ روایت حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے: انه موقوف منقطع اور پھر حضرت انسؓ سے مرفوعاً یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: منهومان لايشبعان منهوم فى العلم لايشبع منه ومنهوم فى الدنيا لايشبع منها دیکھئے: المقاصد الحسنة حرف الميم ج: ۱ ص: ۲۲۷:

حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ دو چیزیں ہیں جنہوں نے ایک چھاتی سے دودھ پیا ہے کہ ایک سے دوسری جدا نہیں ہوسکتی اور وہ کونسی چیزیں ہیں ایک حکمت اور تقویٰ۔ اس لئے جب علم آئے گا تو خشیۃ اللہ بھی آئے گا خوف خداوندی بھی آئے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ علم ہو اور اللہ کا خوف نہ ہو تو علم آیا اس کے ساتھ تقویٰ بھی آیا۔ تقویٰ آیا تو اس کے ساتھ علم ہونا لازمی ہے اور فرمایا کہ مال و دولت اور طغیان یہ بھی ایک وطن کے دو باشندے ہیں جب دولت آئے گی تو سرکشی بھی بڑھے گی۔ بغاوت بھی بڑھے گی۔ الا یہ کہ آدمی مال کو شرعی طریق پر کمائے حلال طریق پر کمائے اور حلال طریق پر خرچ کرے، اس کے اندر سے انفاق فی سبیل اللہ کرتا رہے تو وہ تمرد اور طغیانی سے بچ جائے گا اس طریق پر بچ جائے تو بچ جائے لیکن مال میں اپنی ذات کے لحاظ سے تو طغیان و تمرد ہی ہے باقی شریعت نے ایسے اصول بتلا دیئے ہیں کہ عوارض کے طور پر اس میں پاکی پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی جب کوئی پاک کرنا چاہے ......تو ایک اونچی چیز ہے ایک پست چیز ہے اللہ نے جس قوم کو اونچی چیز کیلئے منتخب کیا اسے تو اپنی قسمت کے اوپر ناز کرنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی صفت کے لئے اور اپنے کمال کے پھیلانے کے لئے ہمیں منتخب کرلیا۔

تحصیل علم اعجاز قرآن کے سبب سے اور طالب علم آلات خداوندی ہیں ...... یہ بھی درحقیقت قرآن کا اعجاز اور معجزہ ہے قرآن کریم کی شانیں بھی درحقیقت معجزہ ہیں یعنی اس کی حفاظت کے طریقے بھی معجزہ نما ہیں۔ اعجازی شانوں سے اس کی حفاظت کی جارہی ہے آج دنیا میں اس علم دین کے اوپر کوئی وعدہ نہیں نہ دولت کا نہ عزت کا، نہ کسی مرتبہ اور عزت و جاہ کا۔ اگر قرآن و حدیث کا بڑے سے بڑا عالم ہو تو کوئی وعدہ نہیں کہ اُسے ملک کا گورنر بنا دیا جائے گا یا پریزیڈنٹ بنا دیا جائے گا۔ بلکہ لوگ اس کو عیب لگاتے ہیں کیوں کہ اس علم کے پڑھے ہوئے نہ اس قابل ہیں کہ وہ ''مسٹر'' بنیں نہ ہی کسی اور دنیوی صنعت و حرفت کا کام انہیں آئے۔ یہ انہیں (بطور طعنہ) کہا جاتا ہے یہ غلط ہو یا صحیح ہو یہ تو بات الگ ہے مگر کہا جاتا ہے تو اس علم کی تحصیل پر کوئی دنیوی وعدہ نہیں......بلکہ اگر وعدہ ہے تو اس کا ہے کہ عزت کی بجائے کچھ لوگ طعن کریں گے۔ آپ کے اوپر مذاق کریں گے اگر وعدہ ہے تو اسکا تو ہے کہ آپ دولتمند ہونے کی بجائے کہیں مفلس نہ ہو جائیں اس کا تھوڑا بہت خطرہ ہے تو کسی دنیوی انعام کا خدائی وعدہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہاں آئے۔

تو کیوں تشریف لائے جبکہ کوئی وعدہ بھی نہیں۔ تو یہ آپ کو حفاظت قرآن کی سعادت کھینچ کر لائی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ ① ''ہم نے قرآن اتارا، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ جاؤ اور جا کر پڑھو چاہے دنیا نہ ملے تو دنیا نہ ملنا اس کی طرف التفات نہیں ہے ملنے کی چیز تو وہ ہے جس کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی کہ ہم اس کی

حفاظت کریں گے تو آپ لوگ (طلباءِ کرام) گویا جارحہ حق ہیں۔ اور حق تعالٰی شانہ کے گویا آلات کار ہیں آپ کے واسطے سے ان کے کلام کی دنیا میں حفاظت ہو رہی ہے یہ بھی درحقیقت (قرآن کریم کا) معجزہ ہی ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور پھر بھی (بے لوث فوج درفوج) لوگ چلے آرہے ہیں تو قرآن بھی معجزہ ہے اور اس کی حفاظت کے طرق بھی (ہمہ پہلو) معجزہ ہیں۔

اشاعت قرآن بغیر وسائل زیادہ ہوتی ہے...... بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اسلامی حکومتوں کا بعض اوقات ختم ہونا یہ قرآن حکیم کی حفاظت کی دلیل ہے اگر مسلسل اور مستمر اسلامی دولتیں قائم رہتیں اور قرآن حکیم محفوظ رہتا تو لوگ طعن کر سکتے تھے کہ یہ سلطنت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ شوکت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ تلواروں کے زور سے قائم ہوا ہے لیکن عجب بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں تلواریں نہیں ہوتیں تو اسلام زیادہ پھیلتا ہے اور جب تلوار آجاتی ہے تو کم پھیلنے لگتا ہے اس سے یہ بتلانا منظور ہے کہ اسکی اشاعت، اسکی حفاظت نہ تلوار پر موقوف ہے نہ حکومت پر موقوف نہ جاہ وعزت پر موقوف یہ ہماری حفاظت پر موقوف ہے چاہے عزت کے ذریعے حفاظت کرائیں چاہے دولت مندی کے ذریعے سے حفاظت کرائیں دولت کا یہ خاصہ نہیں کہ وہ قرآن کی حفاظت کرے۔

یہ تو ہماری حفاظت کا اثر ہے اس حفاظت کیلئے جس قوم کو ذریعہ بنا دیا جائے وسیلہ بنا دیا جائے (جس کے حصہ میں یہ سعادت بغیر زور بازو آئے تو) اُسے اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے مگر ناز کے معنی فخر کے نہیں ناز کے معنی شکر کرنے کے ہیں کہ جتنا بھی شکر کرے کم ہے باقی فخر کی تو ممانعت کی گئی ہے اس لئے کہ فخر تو اپنی ذاتی چیز پر آدمی کر سکتا ہے تو یہ ہماری ذاتی ملک تھوڑا ہی ہے ہم تو خادم اور غلام بنائے گئے ہیں، تو امین کیلئے فخر زیبا نہیں ہے نہ تکبر انکے لئے سزاوار ہے ہم تو امانت دار بنائے گئے ہیں۔ فقط مالک ہی کیلئے فخر زیبا ہے، اگر خزانچی کو کروڑوں اور لاکھوں روپیہ پر بٹھلا دیا جائے تو وہ کبھی فخر نہیں کریگا اسلئے کہ یہ اسکا تھوڑا ہی ہے الغرض فخر کرنے کی اجازت نہیں ہے بڑی سے بڑی دولت دنیوی ہو یا دینی...... یعنی ایمان سے بڑھکر کوئی دولت نہیں مگر اس پر بھی فخر کی اجازت نہیں، اسلام سے بڑھکر کوئی دولت نہیں، مگر تفاخر کی اس پر بھی اجازت نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے کہ ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① بہر حال اس کی اجازت نہیں کہ آپ اسلام وایمان پر فخر کریں۔ اللہ میاں پر احسان رکھیں کہ ہم آپ کے قرآن کی حفاظت کر رہے ہیں اللہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے حفاظت کیلئے آپ کو ذریعہ بنا دیا۔ اس کے پاس کروڑوں ذرائع موجود ہیں۔ ان میں آپ کو منتخب کیا تو شکر کا مقام ہے فخر کا موقع نہیں۔

تو بہر حال میں یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جس علم کو آپ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں وہ علم فی نفسہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۷۔

شرف کی چیز ہے لیکن میں ابھی تک جتنی بات عرض کر سکا ہوں کہ یہ علم آنکھ کا ہو، یا کان کا ہو یا ناک کا ہو یا زبان کا ہو یہ سب محسوسات کے علم ہیں اس کو بھی اللہ نے عزت دی ہے لیکن محسوسات کا علم پھر بیچ ہے اس کے اوپر ایک اور علم ہے (جس کو علم الٰہی کہا جاتا ہے جس طرح قلب محسوسات کا ادراک کرتا ہے اسی طرح علوم الٰہیہ کا بھی ادراک کرتا ہے)

قلب علوم حسیہ اور غیبیہ دونوں کا مدرک ہے......تو قلب فی الحقیقت علوم الٰہیہ غیبیہ اور حسیہ دونوں کا حامل ہے آنکھ، ناک کان یہ حسی علوم کے علماء ہیں۔ اور قلب میں دونوں شانیں رکھی گئی ہیں محسوسات کو بھی جانتا ہے اور مغیبات کو بھی جانتا ہے اس میں ایک دریچہ عالم غیب کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے (علوم غیبیہ) اخذ کرتا ہے اور ایک دریچہ عالم شاہد کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے بھی اخذ کرتا ہے تو قلب ایک جامع ترین چیز ہے محسوسات کا بھی عالم ہے اور مغیبات کا بھی بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان محسوسات کے علم میں بھی اصل قلب ہے یعنی آنکھ ناک کان حقیقتاً عالم نہیں ہیں ان چیزوں کا عالم بھی قلب ہی ہے یہ سب آلات کار ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ آپ بازار میں چلے جارہے ہیں اور بڑے کھیل تماشے نکل رہے ہوں جب گھر آئے تو دوسرے شخص نے آپ سے کہا کہ آج تو بڑے بڑے تماشے بازار سے گزرے، آپ نے کہا کیسے تماشے؟ اس نے کہا میاں وہ ڈھول ڈھمکے بجتے جارہے تھے جلوس نکل رہا تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کوئی خبر نہیں کہ بندۂ خدا تمہاری آنکھ کھلی ہوئی تھی یا نہیں؟ آپ کہتے ہیں اُفّو! میں اپنے فلاں دھیان میں مشغول تھا مجھے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا تماشہ نکل رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آنکھ نہیں دیکھتی بلکہ دھیان دیکھتا ہے اگر دھیان متوجہ نہیں ہے تو آنکھ کھلی ہوگی تب بھی کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اور دھیان یہ قوت خیالیہ ہے یہی قوت متخیلہ وہ اندرونی قوت ہے جس کا حاصل یہ کہ اگر قلب دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا تو آنکھیں دیکھیں گی۔ وہ متوجہ نہیں ہے تو کھلی رہیں گی لیکن کچھ نہیں دیکھ سکیں گی بعض اوقات آپ کسی مسئلہ کے اندر مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں اور گھنٹہ بج جائے۔ گھنٹہ بھی گزر گیا۔ آپ کو خبر ہی نہیں کہ گھنٹہ بجا دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ بھائی گھنٹہ بج گیا ہے سبق کا وقت آگیا ہے تو آپ جلدی سے اٹھتے ہیں کہ اچھا گھنٹہ بج گیا کہ جی ہاں اُفّو! میں اس وقت اس مسئلہ میں منہمک تھا مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ گھنٹہ بجا بھی ہے یا نہیں کوئی کان روئی تو نہیں دی ہوئی تھی مگر نہیں آواز اس لئے نہیں آئی کہ قلب ادھر متوجہ نہیں تھا۔

تو سننے والی چیز کان نہیں ہے بلکہ قلب ہے دیکھنے والی چیز آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے اسی واسطے قرآن کریم میں کفار کی نسبت ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ ① انکی آنکھیں اندھی نہیں ہیں۔ بلکہ انکے دل مسخ ہو چکے ہیں، انکے دلوں کے اندر بوجھنے کی طاقت نہیں رہی ہے تو آنکھ تو کھلی ہوئی ہے پھر نہیں دیکھتی کان کھلے ہیں پھر نہیں سُنتے اسلئے کہ وہ قلب کو متوجہ ہی نہیں کرتے ،تو محسوسات کا عالم بھی فی الحقیقت قلب ہے مگر شرف اسمیں یہ ہے کہ جیسے وہ محسوسات کا عالم ہے ویسے ہی مغیبات

① پارہ: ۱۷، سورۃالحج، الآیۃ: ۴۶۔

کا بھی عالم ہے ویسے ہی الٰہیات کا بھی عالم ہے جیسے وہ فرش کی چیزیں لیتا ہے ویسے ہی وہ عرش کی چیزیں بھی لیتا ہے جیسے وہ شہود سے اخذ کرتا ہے ویسے ہی وہ غیب سے بھی اخذ کرتا ہے۔

قلب ''صفت کن'' کا بھی حامل ہے......تو جامع ترین عالم انسان کے اندر قلب ہے اس کو اللہ نے ساری کائنات کا بادشاہ بنایا۔ یہ ہاتھ اور پیر یہ سب اس کے خدام اور لشکر ہیں خدام کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اگر ہے تو قلب کے اندر ہے اگر قلب یہ چاہتا ہے کہ میں فلاں جگہ چلوں۔ دل کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پیرو چلو! بس قلب میں آیا اور پیروں نے حرکت کرنی شروع کردی قلب اگر چاہتا ہے کہ میں کسی چیز کو دیکھو تو امر کرنے کی ضرورت نہیں قلب نے دیکھنے کا ارادہ کیا ملک اٹھ جاتی ہے اور آنکھ دیکھنا شروع کر دیتی ہے تو آنکھ، کان، ناک اس درجہ تابع فرمان ہیں کہ قلب میں تخیل پیدا ہوا اور انہوں نے اپنا کام شروع کردیا گویا قلب کے اندر ''کن فیکون'' کی طاقت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہو جا وہ ہوگئی کہنے کی ضرورت نہیں محض منشاء ہوا کہ ہو جائیں دیکھنے لگوں بس آنکھوں نے دیکھنا شروع کر دیا۔ تو اس درجہ تابع فرمان بنائے گئے ہیں۔

نظام دنیا کو فساد سے بچانا ہے تو علماء محسوسات کیلئے علماء مغیبات کا اتباع ضروری ہے......اس سے ایک نتیجہ یہ نکل آیا کہ علماء محسوسات جب تک علماء مغیبات کے تابع ہو کر نہیں رہیں گے دنیا کا نظام نہیں چل سکتا۔ اگر محض کان آنکھ ناک کو حاکم مطلق بنا دیا جائے اور قلب کو ان سے منقطع کرلیں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لئے آنکھ کان کا علم جب ہی صحیح اور برقرار رہے گا کہ قلب کا علم آگے آگے ہو اور قلب کی حکومت ہو تو جو علماء غیبی علوم کے عالم ہیں جو علماء الہامات ربانی کے عالم ہیں اور جو علماء شرائع خداوندی کے عالم ہیں ان کو علماء محسوس کے اوپر حکومت کا مقام دیا جائے۔ تب ہی یہ علماء محسوس صحیح طور پر چل سکتے ہیں اس واسطے کہ محسوسات اسی قلب کے تابع ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے اگر آپ کو منتخب کیا تو مبصرات کے علم کیلئے نہیں کیا، مسموعات کے علم کے لئے منتخب نہیں کیا بلکہ علوم خداوندی اور قلبی علم کے لئے منتخب کیا جو تمام علوم کا حاکم ہے اور سب کے اوپر سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر قلب یہ چاہنے لگے کہ میں آنکھ بن جاؤں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ حاکم یہ چاہتا ہے کہ میں محکوم بن جاؤں۔ مخدوم یہ چاہتا ہے کہ میں خادم بن جاؤں۔ یہ تو قلب موضوع ہے معاملہ برعکس ہو گیا اس کو منصب تو اونچا دیا گیا اور وہ نیچا بننے لگا۔ اس کا کام یہ ہے کہ اونچائی کو برقرار رکھے۔

تو اللہ نے آپ کو قلب بنایا ہے تو قلب کا جو مقام ہے اس کو جب تک آپ محفوظ نہیں رکھیں گے کام نہیں چل سکتا۔ اگر آپ نے اس مقام کو محفوظ رکھا تو کان ناک آنکھ سب آپ کے تابع ہو کر چلیں گے اور اگر آپ کے دل میں یہ لالچ ہوا کہ میں آنکھ بن جاؤں تو آنکھ فرمانبرداری چھوڑ دے گی وہ کہے گی کہ میں خود مستقل ہوں کہ قلب میری طرف جھکنے لگا غلام محتاج بن کے میری طرف متوجہ ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ اصل میں ہوں۔ تو علماء مغیبات اور علماء شرائع اگر ان علوم اور ان علماء کے سامنے جو محض محسوسات کے عالم ہیں جھکنے لگیں۔ خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ خواہ مبصرات

ہوں یا مسموعات ہوں خواہ وہ نئی نئی ایجادات کی چیزیں ہوں مگر لالچ کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں تو انہوں نے علم دین کو بٹا لگا دیا کہ اسی علم کا تو فیض ہے کہ محسوسات سامنے آ رہی ہیں اگر مغیبات کا علم منقطع ہو جائے تو محسوسات دنیا سے منقطع ہو جائیں یہ باقی نہیں رہ سکتیں۔ اس لئے اہل علم کو ناز بھی کرنا چاہیے اور شکر بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منتخب کیا اول تو علم کے دائرے میں لے آئے مزدور نہیں بنایا کہ ہم ٹوکری اٹھائیں، معدہ نہیں بنایا کہ نجاست جمع کریں بلکہ عالم بنایا کہ ہم دیکھیں، سنیں اور چکھیں اور محسوسات کے علم آگے بڑھائیں۔ اس سے بڑھکر ہمیں ان علماء میں داخل کیا جو الٰہیات کے عالم ہیں۔ خود محسوسات کے اوپر حاکم ہیں تو جو انتہائی مقام ہے وہ آپ کو مل گیا۔

اہل علم کی اصلاح کے بغیر عوام الناس کی اصلاح ممکن نہیں...... اس کائنات بدن میں انتہائی مقام قلب کا ہے اور اس کائنات آفاق میں اہل علم کا ہے گویا وہ بمنزلہ قلب کے ہیں تو قلب اگر فاسد ہو جائے تو ساری کائنات فاسد ہو جاتی ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ''۔ ① تو قلب اگر ٹھیک رہے گا تو تمام اعضاء ٹھیک رہیں گے اگر قلب میں فساد آ گیا۔ تمام اعضاء میں فساد آ جائے گا..... تو اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ فساد سے دور بھاگنے کی کوشش کریں۔ ان کا کام صلح پھیلانا ہے اور پھیلا کر دنیا کو رشد و ہدایت اور بھلائی کی طرف اور بزرگی کی طرف لانا ہے اگر وہ بھی عوام الناس کی طرح چند چیزوں، چند ٹھیکروں یا چند محسوس چیزوں کے طالب بننے لگیں تو انہوں نے اپنے وقار کو کھو دیا اور (انہوں نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں) ان کا کام یہ ہے کہ وہ قلب کے مقام کو باقی رکھیں اور سمجھیں کہ ہم کائنات کے قلب ہیں۔ اس لئے اپنے کو فساد سے بچائیں اور اپنے کو صالح بنائیں۔ ان کو دنیا کا امام بنایا گیا ہے اگر سارے مقتدی وضو کر آئیں اور امام کا وضو نہ ہو یا ٹوٹ جائے، کسی کی نماز نہ ہوگی۔ سب کی نماز جبھی ہوگی جب امام بھی طاہر ہو۔ امام پارسا اور پاک ہو۔ جب اس کی پاکی ختم ہوگی تو دوسرے پاک بھی رہیں گے تو بھی ناپاک بن جائیں گے۔ ان کی پاکی نامقبول ہوگی۔

آپ اس کائنات کے قلب ہیں۔ اگر اسمیں طہارۃ ہے تو دنیا میں طہارۃ موجو ہے اگر اس میں خباثت آ گئی تو دنیا میں خباثت پھیل جائے گی۔ دنیا میں نجاست عام ہو جائے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بچہ کو دیکھا کہ دوڑتا جا رہا ہے آپ نے فرمایا کہ: میاں آہستہ چلو گر جاؤ گے۔ تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ: آپ آہستہ (اور دیکھ کر) چلیں، اس لئے کہ اگر آپ گر گئے تو ساری قوم گر جائے گی۔ میرے گرنے سے تو صرف میں ہی گروں گا۔

تو یہاں عوام سے خوف نہیں خواص سے خوف ہے کہ ان کے فساد پر عوام کا فساد اور انکی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اس واسطے اگر یہ صالح اور ٹھیک ہیں تو عوام بھی ٹھیک ہیں جب کبھی فتنہ پھیلا ہے عوام سے کبھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرألدینہ ج: ۱ ص: ۵۔

نہیں پھیلا۔ عوام تو بیچارے متبع ہیں۔ ان کے سامنے اللہ ورسول کا نام لوگے تو گردن جھکادیں گے۔ اب نام لینے والا ہی خیانت کرے کہ اللہ ورسول کے نام سے اپنے ہی تخیلات پیش کرنے لگے۔ اس پردے میں اپنے دل کی اغراض پیش کرنے لگے تو یہ بیچارے عوام کا قصور نہیں اگر چہ ان کی تباہی کا وبال اس شخص کی گردن پر ہوگا۔

تو خواص کی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اور خواص میں ناک کان آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے تو جب اللہ نے آپ کو قلب بنایا آپ کو عالم کی اصلاح وفساد کا مدار ٹھہرایا تو بڑی ہی ناقص بات ہوگی کہ آپ ہی فساد کی طرف آنے لگیں۔ اور فساد کی طرف آنا یہی ہے کہ ایک عالی چیز کو چھوڑ کر سافل چیز کی طرف آپ کا ذہن جانے لگے۔ کہ پیسہ کس طرح آئے؟ راحت کس طرح ملے؟ یہ تو خود بخو ملے گی وعدۂ خداوندی ہے، کچھ تو اپنے اللہ کے وعدے پر اعتماد کرو۔ اس مقام پر بھی آ کر اگر آپ ایسا آدمی اللہ کے وعدوں پر بھروسہ نہ کرے تو عوام الناس سے کیا امید رکھی جائے کہ وہ اللہ کی ذات عالی کے فرسودہ وعدوں پر بھروسہ کریں۔

توکل علی اللہ سے ہر چیز ملتی ہے...... تو آپ کا سب سے بڑا کام توکل اور استغناء ہے اسی میں سب کچھ ہے۔ آپ کے لئے دین بھی ہے دنیا بھی چاہے تھوڑی ملے مگر ضرور ملے گی، ممکن ہے کہ آپ لکھ پتی یا کروڑ پتی نہ ہو سکیں لیکن سینکڑوں کروڑ پتی آپ کے قدموں کے سامنے سر جھکائیں گے۔ اگر چہ آپ کروڑ پتی نہیں تو کروڑ پتی بن جانا کوئی کمال کی چیز بھی تو نہیں کروڑ پتی کو اپنے سامنے جھکانا یہ کمال کی چیز ہے، اگر آپ کے پاس کار نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ساری دنیا کی کاریں آپ کی کاریں ہیں۔ جہاں گئے کار حاضر ہے پھر ہمیں کار کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جب ساری دنیا کی کاریں ہماری، ساری دنیا کی دولت ہماری، جہاں ضرورت ہے اللہ خود پوری کرتے ہیں۔ اس واسطے اس مقام پہ آ کے تو آدمی اللہ پر بھروسہ کرے، اس مقام پر آ کے بھی بھروسہ نہ کیا تو پھر اللہ پر بھروسہ کرنے مقام کون سا آئے گا؟

تو یہ مقام مقتضی ہے کہ اللہ پر پورا اعتماد کرے حق تعالیٰ کے اوپر پورا بھروسہ کرے، اور اپنے کو سونپ دے، کہ جب آپ نے مجھے اپنے کام میں لگا دیا ہے تو میرا نفس آپ کے حوالے ہے۔ ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ (1) تو اللہ تعالیٰ اس لئے بندے کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اگر دنیا میں بھی آپ اپنے کو کسی شخص کے حوالے کردیں کہ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں بس میں آپکے حوالے ہوں جو آپ کا جی چاہے کریں، سیاہ وسفید کے آپ مالک ہیں۔ تو اس شخص کو کبھی جرأت نہیں ہوگی۔ کہ آپ کے معاملہ میں خیانت کرے، مثل مشہور ہے کہ ''قدموں میں آ کے گرے ہوئے سانپ کو بھی آدمی نہیں مارتا'' جب وہ آ کے جھک جائے جو اتنا جھکنے والا ہو اس کے ساتھ احسان کرے، تو اللہ کے سامنے آپ جھکیں گے۔ اور وہ ضائع کردیں یہ کبھی ممکن نہیں۔

---

(1) پارہ: ۲۴، سورۃ المؤمن، الآیۃ: ۴۴.

یہی تو وہ چیز ہے جس کو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس وقت فرمایا تھا جب وحی آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ'' مجھے کمبل اوڑھا دو، ''اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ'' مجھے اپنے نفس کے اوپر ہلاک ہو جانے کا ڈر ہے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ''کَلَّا وَاللہِ لَا یُخْزِیْکَ اللہُ اَبَدًا، اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ'' ① اس قسم کے جملے فرمائے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ اس وقت تک تو اسلام بھی پورا سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر سلامتی فطرت سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسا آدمی ضائع ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوسکتا۔ تو آپ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں اور اللہ آپ کو ضائع کردے یہ کیسے ممکن ہے؟ نہیں ہوسکتا۔ ہاں کوئی بھروسہ نہ کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں تو یہ بھروسہ اور اعتماد کا مقام ہے کہ جب اس لائن میں پڑ گئے تو پھر خدا پر بھروسہ کیجئے۔ غناءِ نفس پیدا کیجئے، ذلتِ نفس اس مقام کا خاصہ نہیں ہے ذلیل النفس وہ ہوتا ہے جس کے پاس عزت کی چیز نہ ہو۔ جس کے پاس علم جیسی عزت کی چیز ہے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوسکتا۔

علم مع العبدیت کا خاصہ ارتقا ہے..... تو علم بلند ہونے کیلئے ہے پست ہونے کے لئے نہیں۔ آدمی میں علم کی ہوا بھری ہوئی ہو پھر پست ہو جائے یہ ناممکن ہے اگر لطیف چیز کثیف میں بھر دی جائے تو وہ پست نہیں ہوتی آپ گیند کے اندر ہوا بھر دیجئے پھر زمین پر دے ماریئے تو زمین سے کتنا زیادہ اوپر جائے گی۔ اور اگر ہوا نکال کر زمین پر ماریں گے تو وہ بیچاری پھس کر کے رہ جائے گی۔ اس کے اندر اٹھنے کی جرأت نہیں معلوم ہوا لطیف چیز کی طاقت ہوتی ہے تو طاقت تو علم ہے یہ جب بھری ہوئی ہو اور پھر آدمی زمین کی طرف جائے اور پچھاڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے یا تو وہ علم نہیں ہے یا وہ علم کو سمجھا ہوا نہیں اگر علم نہیں تو بے شک پچھا جائے گا اور اگر علم ہے تو وہ اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا۔ نہ اس کے استعمال کو جانتا ہے نہ اس کی عزت و آبرو کی۔ اس کو قدر و منزلت ہے ..... اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو وہ علم پست ہونے کے لئے نہیں ہوسکتا۔

علم کا خاصہ ترقی، اونچائی اور بڑھائی ہے بلکہ اسی وجہ سے انسان کے لئے عبدیت لازم کی گئی ہے اس لئے کہ محض علم اسے متکبر بنا دے گا علم نیچا دیکھنا نہیں چاہتا۔ تو ہوسکتا ہے کہ ایک عالم میں غرور بھی آ جائے، تکبر بھی آ جائے۔ بڑائی بھی آ جائے اس لئے اس کا علاج عبدیت میں رکھا گیا ہے۔ اور عبدیت کسی مردِ کامل کے سامنے خود کو پامال کئے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ تو عبدیت ضروری ہوئی تاکہ علم کا غرور یا استکبار نہ رہے وقار کے درجہ میں علم رہ جائے اور عبدیت کے مواقع پر آ کے تواضع للہ پیدا ہو جائے۔ تو کبر کا علاج تواضع سے کیا گیا ہے اور ذلتِ نفس کا علاج وقار اور خودداری سے کیا گیا ہے۔ تو جب علم کے ساتھ عبدیت جمع ہوتی ہے تو علم کے آثار میں استکبار کے بجائے وقار پیدا ہوتا ہے اور عبدیت سے ذلتِ نفس کے بجائے تواضع للہ پیدا ہو جاتی ہے تو عالمِ حقیقی وہ ہے جو متکبر نہ ہو بلکہ باوقار

① الصحيح للبخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ص: ١ رقم: ٣.

ہو۔ جو ذلیل النفس نہ ہو بلکہ متواضع ہو ایک طرف تواضع للہ ہو تو علم کے اندر توازن قائم ہو جائے گا اور اگر عالم کے اندر استکبار ہے تو عالم کیلئے فساد ہے اور اگر اسمیں تواضع کے بجائے ذلت نفس ہے تو بھی عالم کیلئے فساد ہے صاحب ہدایہ نے ایک موقع پر (جس کا ترجمہ یہ ہے) لکھا ہے کہ وہ عالم جس میں غرور نفس ہو متکبر ہو وہ عالم کیلئے فتنہ ہے اگر وہ اس علم سے جاہل رہتا تو بہتر رہتا۔ لیکن علم آیا اور اس کے ساتھ کبر ہے تو اس نے علم کو بٹہ لگایا۔ علم عالم میں فساد پھیلانے کا ذریعہ بن جائے گا اور اگر وہ جاہل ہے عامل بے علم ہے وہ بدعات ومنکرات میں مبتلا ہوگا۔ وہ بھی فساد کبیر ہے تو علم کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج عبدیت میں ہے اور عبدیت کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج علم ہے جب تک یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں کام نہیں چلتا۔

علم بلا عبدیت اور عبدیت بلا علم کا نتیجہ...... اس کی نظیر دو امتیں موجود ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے اللہ نے دو امتیں پیدا کیں۔ ایک یہود اور ایک نصاریٰ یہود کو علم دیا گیا۔ علم بھی تفصیلی۔ تورات کی شان بیان فرمائی گئی ہے کہ ﴿تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ﴾ ① ''اسمیں ہر چیز کی تفصیل ہے'' نہایت واضح شریعت ہے نہایت مفصل شریعت ہے تو تفصیلی شریعت دی گئی یعنی علم تفصیلی دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ لازم کیا گیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کے آگے جھکتے رہنا۔ ان سے تمسک کرتے رہنا یہود نے کہا کہ: ''نَحۡنُ رِجَالٌ وَّھُمۡ رِجَالٌ'' یہ انبیاء بھی انسان ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کی اتباع کریں ہم میں تورات بھی موجود ہے عقل بھی موجود ہے۔ اپنی عقل کے ذریعہ تورات سے اخذ کریں گے اتباع کی ضرورت نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ جب عبدیت نکل گئی جو شخصیتوں کے آگے جھکنے سے پیدا ہوتی ہے تو خالص علم رہا تو اس سے کبر اور غرور پیدا ہوگیا، کبر اور غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظنون اور اوہام کا مجموعہ ہو کر رہ گئے علم قطعی باقی نہیں رہا۔ تو یہود علم کے فتنے میں گرفتار ہوئے جن میں تکبر پیدا ہوا جس کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَاِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِھَا وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوۡا عَنۡھَا غٰفِلِیۡنَ﴾ ②

تو یہود علمی فتنے میں مبتلا ہوئے تو شکوک وشبہات میں ان کا علم رہ گیا۔ ان کا فہم درحقیقت وہم ہے جس کا نام انہوں نے فہم رکھ لیا۔ اس جہل کا نام انہوں نے علم رکھ لیا۔ اس لئے کہ منافع علم جب ان سے منقطع ہوگئے تو علم کہاں سے آتا۔ ﴿بَلۡ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ﴾ ③ علم تو اہل علم کے سینوں سے نکل کر ملتا ہے کاغذوں اور اوراق میں تو رسوم اور دوال ہوتے ہیں، ان رسوم اور دوال کے مدلولات اہل علم کے سینوں میں ہوتے ہیں جب وہ نفع بھی ان سے ختم ہوگیا تو علم کی صورت رہ گئی، اور محض صورت جس سے روح نکل جائے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۵۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔

③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔

وہ لاشئی ہے چند دن کے بعد وہ گلتی ہے، پھٹتی ہے سڑتی ہے، نہ صورت رہتی ہے نہ حقیقت رہتی ہے تو یہود استکبار کے فتنے میں تباہ ہوئے ہیں ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ ① جو داور استکبار ان کی شان رہ گئی... لہٰذا تباہ و برباد ہوئے۔

نصاریٰ عملی اُمت تھی۔ ان کو انجیل کے اندر عمل کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ تصوف کے زیادہ تر احکام تھے ترکِ لذت، زہد کامل وہ تصوف کی کتاب ہے وہ اس کتاب پر چلے، تو تصوف کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی شخصیتوں کی طرف جھکتا ہے تو نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام، احبار اور رہبان کی طرف جھکے اور اتنا جھکے کہ انہوں نے انجیل سے قطع نظر کر کے کہا کہ کتاب ناطق تو یہ بزرگانِ دین ہیں۔ اس کتاب ساکت کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں کے افعال و اعمال ان کے حق میں گویا شریعت بن گئے کتاب خداوندی سے منقطع ہو گئے اور ان لوگوں کے آگے اتنا جھکے تو اضع نہیں بلکہ ذلت نفس میں مبتلا ہو گئے اور جب ان لوگوں کے اعمال کو ہی شریعت سمجھا تو طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو گئے، منکرات میں مبتلا ہو گئے کوئی مغلوب الحال ہو تو اس کے عمل کو بھی شریعت سمجھا جو مغلوب عن الحال ہو اس کو بھی شریعت سمجھا۔ تو ان کیلئے غیر شریعت شریعت بن گئی۔ اور منکر و بدعت کا حاصل غیر شریعت کو شریعت بنانا ہی ہے تو نصاریٰ کی امت گویا بدعتی امت ہے حق تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ② تو وہ رہبانیت کا شکار ہو کر بدعات میں مبتلا ہوئے اور یہود علمی فتنہ کا شکار ہو کر استکبار میں مبتلا ہوئے تو ایک امت جو داور استکبار میں ماری گئی اور ایک امت ذلت نفس میں ماری گئی۔

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ ③ تو یہ عملی فتنے میں گرفتار ہوئے اور وہ علمی فتنے میں مارے گئے۔

اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سابقہ اُمتوں کے اتباع کا جذبہ اور اس کے نتائج...... حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: تم یہود و نصاریٰ کی ہو بہو پیروی کرو گے چھوٹی بات میں اور بڑی سے بڑی بات میں، ④ عقائد میں، عمل میں، معاشرت اور معیشت میں حتیٰ کہ اگر وہ کوئی فعل منکر بھی کریں گے اور عبث کام کریں گے۔ اس میں بھی ان کا ساتھ دو گے۔ تو نصاریٰ اور یہود اہل کتاب کے یہ جو دو طبقے ہیں انمیں بھی فساد ہونا لازمی ہے تو امت میں دو طبقے پیدا ہو گئے، ایک طبقہ ہمارے اندر وہ ہے جو غرور نفس اور غرور علم میں مبتلا ہے اس کو اپنے علم کے اوپر گھمنڈ ہے وہ کہتا ہے ”سلف کا اتباع کریں“ اس کی ضرورت نہیں ہے قرآن و حدیث موجود ہے ہمارے اندر عقل بھی موجود ہے بلکہ ایک قدم اس سے بھی آگے کہ حدیث کی بھی ضرورت نہیں کہ بالآخر

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۷۔ ③ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ج: ۱۱ ص: ۲۷۲۔

وہ ایک انسان کا ہی قول ہے، بس خدا کا قول ہمارے سامنے ہو اور ہماری عقل سامنے ہو (ہدایت کیلئے کافی ہے) یہ طبقہ یہود کے نقشِ قدم پر چل پڑا تو جمود واستکبار اور غرورِ نفس میں مبتلا ہوا۔ ان کا علم وہم کے درجے میں ہے ظنون اوہام اور تخیلات فاسدہ کا نام انہوں علم رکھ لیا (وہ اسی پر خوش ہیں) اور ایک جماعت وہ ہے جو یہ کہتی ہے کہ یہ بزرگان دین شیخ جنید رحمۃ اللہ علیہ وشبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی کتاب ناطق ہیں۔ اب کتاب ساکت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت، اس قسم کے لوگ اکثر وبیشتر بدعات میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ اہل اللہ کے بہت سے اعمال غلبہ حال میں سرزد ہوتے ہیں جو خلاف شرع تو نہیں ہوتے لیکن وہ دقیق ہوتے ہیں جن کا رابطہ شریعت سے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے وہ سطح کو دیکھ کر عمل کرتا ہے تو بدعات کا شکار ہوتا ہے اسی واسطے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَآئِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِنَ الْيَهُوْدِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِنَ النَّصَارٰی'' ① علماء میں بگاڑ آتا ہے تو وہ یہود کے نقش قدم پر جاتے ہیں۔ جمود واستکبار میں مبتلا ہوتے ہیں اور عبّاد وزہاد میں بگاڑ آتا ہے تو وہ نصاری کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو وہ بدعات اور منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اہل حق کی پہچان...... اہل حق کون ہیں؟ وہ ہیں جو نہ متکبر ہیں نہ ذلیل النفس ہیں۔ بلکہ وقور النفس اور متواضع النفس ہیں۔ وہ درمیان میں ہیں۔ جو کہ اہل سنت والجماعت ہیں جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ کا دامن ہے اور ایک ہاتھ میں اہل اللہ کا دامن ہے، نہ وہ کتاب اللہ کو تھام کر اہل اللہ سے مستغنی بنتے ہیں اور نہ اہل اللہ کا دامن سنبھال کر کتاب اللہ سے مستغنی بنتے ہیں علم وہاں سے حاصل کرتے ہیں، عمل اور عمل کے نمونے یہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ ٹھیک صراط مستقیم پر قائم ہیں نہ افراط میں مبتلا ہیں نہ تفریط میں۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قلب سلیم وہ ہے جو نہ افراط میں ہو نہ تفریط میں قلب سلیم وہ ہے جس میں نہ غرور ہو نہ ذلت نفس ہو۔ وہ قلب صحیح معنوں میں بدن کے اوپر حکومت کریگا اور تمام اعضاء کو سیدھا چلائے گا۔ تو آپ جب کہ پورے عالم کا قلب ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے آپکو علم بھی دیا ہے اور علم کے ساتھ تواضع بھی دی ہے نیک مزاج شخصیتیں بھی دیں کہ آپ ان کا دامن پکڑیں۔ اپنی پاک کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہ اس کا دامن سنبھالیں تو اس دولت عظیم کے آجانے کے بعد پھر غیر کی دولت کی طرف متوجہ ہو کر آپ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہمارے پاس یہ نہیں ہمارے پاس وہ نہیں، کل کو کیا کریں گے یہ علم کی انتہائی توہین ہے مقام علم کی بھی انتہائی توہین ہے۔ آپ کو اپنا مقام سمجھ لینا چاہیے اور یہ بھی کہ آپکی حیثیت دنیا میں ہاتھ پیر کی نہیں اور نہ ہی آپ دنیا کے کان، ناک آنکھ ہیں بلکہ پورے عالم کے قلب ہیں۔

تھوڑا علم ''عبدیت کے'' ساتھ دوگنا اور مقبول ہو جاتا ہے...... اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ پورے وقار

① فیض القدیر، ج: ۵ ص: ۳۳۳.

کے ساتھ پوری ریاضت کے ساتھ اور پوری محنت کے ساتھ اپنے علم کے اندر متوجہ رہیں پورے ادب کیساتھ اپنے علم کو سیکھیں، اس واسطے کہ بے ادب آدمی کو علم حاصل نہیں ہوتا، طالب کو علم حاصل ہوتا ہے جو استاذ کی شان میں گستاخ ہوگا ہمیشہ علم سے محروم رہے گا جو متواضع رہے گا اگر چہ محنت بھی نہ کرے، محروم نہیں جا سکتا۔ دارالعلوم میں بہت سی نظیریں ہمارے سامنے ہیں۔ خود ہمارے ہم جماعت ہیں کوئی محنت نہیں کی ہمیشہ امتحانات میں فیل رہے مگر عقیدت و نیازمندی سے اساتذہ کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے اچھے ذی استعداد طالب علم وہ کام نہیں کر رہے جو وہ قلیل الاستعداد مخلوق کی اصلاح کر رہے ہیں۔ کچھ دعائیں ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کچھ برکتیں ساتھ ہو جاتی ہیں تھوڑا علم بھی بہت ہو جاتا ہے تو عبدیت کے ساتھ وہ دگنا نظر آتا ہے اس کا کام دگنا ہو جاتا ہے اس سے نفع زیادہ ہو جاتا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کام قابلیت سے نہیں چلتا بلکہ مقبولیت سے چلتا ہے آپ اگر سرے سے قابلیت کے پیچھے لگ جائیں اور مقبولیت کے اسباب ترک کر دیں گے کبھی دنیا میں نتیجہ خیز کام نہیں کریں گے، قابلیت زیادہ سے زیادہ کتابیں دیکھنے سے آجائے گی اور مقبولیت اخلاق کی اصلاح اعمال کی اصلاح توجہ الی اللہ اور انابت الی اللہ سے پیدا ہوگی اور مقبول بن کر آدمی جو کام کریگا وہ مقبول بنے گا جو نقل و حرکت کرے گا مقبول ہوگی۔ خاصان حق کی سب چیزیں مقبول ہوتی ہیں اور وہ ہزاروں برکات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

مقربین کی لغزش بھی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ ہوتی ہے...... حضرت آدم علیہ السلام کو آپ کہتے ہیں کہ ذراسی لغزش ہوگئی مگر وہ لغزش اور وہی غلطی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ بن گئی تو۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر

اہل اللہ کی غلطی اور لغزش بھی ہماری ہزاروں طاعات سے کہیں بہتر اور افضل ہوتی ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لیلۃ التعریس میں آنکھ نہ کھلی اور نماز قضا ہوگئی تو نظر بظاہر ادا کے مقابلہ میں قضاء لغزش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہ نہ سرزد ہوتی تو قضا کے سینکڑوں علوم واحکام اور قضاء کی برکات مخفی رہ جاتے ہمارے سامنے کوئی اسوہ نہ آتا۔ تو بہر حال اہل اللہ کاملین مقبولین بارگاہ خداوندی ہیں ان کی اگر لغزش بھی ہو۔ وہ بھی ہزاروں برکتوں کا پیش خیمہ ہے تو آدمی خود مقبول بن جائے، ایک ایک فعل کو مقبول بنانیکی کوشش نہ کرے، خود مقبول بننے کی کوشش کرے۔

اسباب مقبولیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے...... تو زیادہ تر طلبہ قابلیت کے پیدا کرنے میں مبتلا رہتے ہیں میں اس سے انکار نہیں کرتا میں یہ نہیں کہتا کہ آج سے آپ مطالعے چھوڑ دیجئے، کتابیں نہ دیکھئے، تکرار ختم کر دیجئے، یہ سب کچھ ہو مگر یہ اسباب قابلیت پیدا کرنے کے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباب بھی پیدا کیجئے جن سے مقبولیت بھی پیدا ہو، تادب اور اپنے اخلاق کی درستگی، اپنے اساتذہ کی اطاعت اور ساتھ ساتھ اپنے قلب کے اندر غناء اور استغناء جو علم کا خاص وصف ہے وہ پیدا کرنا ہوگا۔ اس صورت کے پیدا ہو جانے کے بعد اگر من بھر علم

ہوگا تو دس من ہو کے نمایاں ہوگا۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص شان استغناء ہے تبلیغ کیلئے جاتے ہیں تو فرماتے ہیں بلکہ عمل ہی نہیں حکم بھی ہے کہ آپ کہہ دیجئے۔ ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

آپ تو اس پر عمل کرتے ہی ہیں کہنے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی کہلایا گیا کہ اس مقام کا تقاضا یہ ہے اور اس مقام کی معرفت اور پہچان یہی ہے کہ اعلان کیا جائے کہ ہم تم سے پیسے کے طالب نہیں ہیں۔ ہم تم سے محنت اور خدمت کے طالب نہیں ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیسہ بھی آتا ہے اور خدمت بھی ہو جاتی ہے تو اپنے اندر استغناء پیدا کیا جائے، تادب پیدا کیا جائے اور اطاعت کی خو ڈالی جائے سرکشی نہ پیدا کیجائے، سرنگونی پیدا کی جائے اسلئے کہ جب ہم خاک میں سب خاکی النسل ہیں خاک کا کام یہ نہیں ہے کہ آسمان میں جا کے اڑے۔ وہ تو پامال رہے گی تب ہی اچھی رہے گی اگر خاک اڑ کے چلی تو جس پہ گرے گی لوگ دامن جھڑک دیں گے جس آنکھ پہ گرے گی لوگ لعنت بھیجیں گے۔

لیکن اگر جوتوں میں پامال رہے گی تو اس کے اوپر تیمم کریں گے، طاہر ہی نہیں بلکہ مطہر بھی سمجھیں گے، تو خاک کا کام یہ ہے کہ وہ خاک بن کر رہے۔ اگر آتشی بن کر رہے گی تو اس نے اپنا نسب نامہ ابلیس سے ملا دیا ابلیس کو کہا گیا ہے کہ ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ ② تو ہم تو اولادِ آدم ہیں، ابلیس کی اولاد نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ابلیس کے خصائل اختیار کریں آگ بن کے رہیں، خاک بن کے نہ رہیں اور جب خاک بنکے رہیں گے تو خاک وہ چیز ہے کہ پھول پھل اسی سے اُگتے ہیں۔ دنیا میں باغ و بہار کی رونق اسی سے ہے آج تک آگ نے کسی درخت کو نہیں اگایا۔ آج تک کسی آگ کے اندر سے کوئی دریا نہیں نکلا یہ کام مٹی کا ہے کہ خنکی بھی پیدا کرتی ہے پھول پھل پیدا کرتی ہے سکون بھی پیدا کرتی ہے ہاں آگ کو خادم کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً تاپ لیتے ہیں۔ لیکن اگر حدود سے گزرتی ہے تو لوگ اس کو بجھانے کی فکر کرتے ہیں کہ اس کمبخت کے اوپر پانی ڈالو ورنہ یہ تو جلا ڈالے گی۔ تو بہر حال جب ہم خاکی الاصل ہیں تو ہمارا کام خاک بن کے رہنا ہے اور خاک بن کر رہنے کے معنی تادب اور ادب مع اللہ ہی ہیں۔

ادب ہی گوہرِ علم ہے..... قرآن مجید میں جگہ جگہ ادب کو تعلیم دی گئی ہے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ ③

بہر حال اس کا امر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آواز پست رکھو، حدیث میں آتا ہے

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۲۷۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہری الصوت تھے اور فطرتاً بلند آواز تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اتنے آہستہ بولتے تھے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا تھا کہ کیا فرما رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں زور کی آواز نہ نکل جائے اور میرے اعمال حبط ہو جائیں۔ تو اہل اللہ بعید سے بعید احتمالات کو زیر عمل لانا چاہتے ہیں۔ محض مدلولات کی فکر میں نہیں رہتے۔ بعید سے بعید محتمل ہو اسے بھی اپنے تقویٰ باطن کے تحت عمل میں لانا چاہتے ہیں بہر حال ادب سکھایا گیا کہ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آواز بھی بلند نہ کرو بے ادبی سے مت بیٹھو بے وضو مت بیٹھو۔ قرآن کریم کو بے وضو ہاتھ نہ لگاؤ ﴿لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ① تو مساجد کا ادب الگ کعبۃ اللہ کا ادب الگ، شعائر اللہ کا ادب الگ ہے غرض جس چیز کو اللہ سے نسبت ہو جائے اسی کا ادب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ واجب اطاعت ہے اور واجب التادب ہے اس واسطے جو بھی اس کی طرف منسوب ہو گئے درجہ بدرجہ سب میں ادب آتا چلا جائے گا تو ہماری تادب کی بنیاد ادب کے اوپر ہے بے ادبی کے اوپر نہیں۔ ہے ہماری بنیاد اطاعت پر ہے بغاوت پر نہیں ہے ہماری بنیاد درحقیقت اعتراف قصور پر ہے کہ غلطی بھی کریں تو اس کو سنبھالنے کی کوشش اور فکر کریں کیونکہ ہم بڑے مقدس تو ہیں نہیں کہ کبھی غلطی ہمارے سے ہو ہی نہیں سکتی تو جب ادب تادب کی اطاعت اور سرنگونی کی خو پیدا ہو جائے گی تو اس وقت علم کا گوہر چمک کر نمایاں ہوگا۔ اور اگر گستاخی، بے ادبی اور بے تمیزی باقی ہی رہی تو علم ایسا رہے گا جیسے ایک چنگاری ہو اور اس پر راکھ پڑی ہوئی ہو کہ نہ اس کی چمک نمایاں ہوگی نہ اس سے کسی کو روشنی کی توقع ہوگی۔

اہل علم اور ان کی ذمہ داریاں ...... تو یہ چند کلمات آپ حضرات کے سامنے جرأت کر کے میں نے اس لئے عرض کر دیئے کہ آپ حضرات کا مقام بہت بلند و بالا اور بہت ہی اونچا ہے آپ اللہ کا جتنا شکر کریں کم ہے کہ آپ کو ایسا رفیع مقام عطاء کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جتنا اعلیٰ اور رفیع مقام ہوتا ہے اس کے حقوق بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں اس کے واجبات بھی اتنے ہی ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یا تو آپ اس میدان پڑے نہ ہوتے لیکن جب آ گئے ہیں تو حق ادا کرنا پڑے گا۔

حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں سے ہیں اور شاملی کے میدان میں امیر جہاد تھے اور جھنڈا بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان سے کسی نے کہا کہ: حضرت ہیں اپنے بچے کو قرآن حفظ کرانا چاہتا ہوں تو ہنس کہ فرمایا کہ کیوں؟ یعنی عمر بھر کی بیماری اس کو کیوں لگاتا ہے اس لئے کہ قرآن یاد کرائے گا تو عمر بھر لازم ہو جائے گا کہ یہ اس کو پڑھتا رہے یاد کرتا رہے بھولا تو آخرت میں اس پر مصیبت آئے گی۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن حفظ نہ کرو۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب قرآن حفظ کر کے میدان میں آ گئے تو اس کے حقوق بھی لازم ہو جائیں گے اس کی تلاوۃ بھی لازمی ہوگی اور اس کا تحفظ بھی۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

اس بناء پر یا تو آپ اس میدان میں نہ آئے ہوتے اور جب آ گئے تو پھر اخلاقی جرأت سے کام لیکر اس مقام کے حقوق ادا کیجئے مقام تو یہ ہے اور حالت یہ ہے کہ بعض طلباء کے سامنے تو اگر کوئی امیر آ گیا تو وہ اپنی نگاہوں میں اپنے آپکو ضعیف اور ہیچ سمجھتے ہیں اور خود منفعل ہو جاتے ہیں تو گویا ان کے دل میں اپنی وضع قطع کی کوئی عظمت نہیں ہے اس شخص کی وضع قطع کی عظمت ہے جو سامنے ہے جھینپ کے یہی تو معنی ہیں کہ میں ہیچ ہوں اور دوسرا مجھ سے بلند ہے اگر طالب علم کا مقام رکھتے ہوئے دوسرے کے آگے جھینپیں اور سمجھیں کہ یہ مقام اونچا ہے تو اس نے سارے حقوق کو تلف کر دیا اس کا تو یہ کام ہے نہ ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کرے نہ ناصح کی بے جانصیحتوں کی پرواہ کرے۔ اس مقام کی عزت اور شرف کو سنبھالے۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ جب ایران فتح ہوا۔ تو بغداد تشریف لائے تو کھانا کھا رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ تو ہاتھ سے لقمہ زمین پر گر پڑا تو آپ نے لقمہ اٹھا کے مٹی جھاڑی اور صاف کر کے تناول فرمالیا۔ اس غلام نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن ملک ہے فارسیوں کا ملک ہے یہ ایک لقمہ جو کہ گندہ ہو چکا تھا اور آپ نے اسکو اٹھا کر کھالیا......؟ تو حضرت حذیفہؓ نے جواب دیتے ہوئی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی...... بلکہ فرمایا: ''ءَاَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ'' کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں...... تو اس ایک سنت کی وہ عظمت تھی کہ پورے تمدن کی وہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس سنت کا وہ وقار ذہن میں تھا کہ پورے ایران اور خراسان کے تمدن کی کوئی پرواہ نہیں کی یعنی ملامت کرنیوالے ملامت کریں ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہمیں اپنے حبیب پاک کی سنت درکار ہے۔

تو جب تک یہ طمانیت اور اتنا اعتماد اور اتنا اطمینان سنت نبوی کے اوپر نہ ہو اس وقت تک ایک عالم نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنے مقام کو برقرار رکھ سکا اس کا فرض ہے کہ ایک ایک سنت کی اتنی عظمت کرے کہ پوری دنیا و مافیھا کی اس کے قلب کے اندر وہ عظمت نہ ہو۔ پھر جا کے اس مقام کا حق ادا ہوگا۔

تو آپ ماشاء اللہ ان حقوق کو خوب سمجھتے ہیں۔ سب سے زیادہ سمجھتے ہیں، اساتذہ سامنے ہیں کتب سامنے ہیں۔ میری یہ ضرورت نہ تھی کہ میں اہل علم میں کھڑے ہو کر کچھ کہوں، لیکن بہر حال کہنے سننے کیلئے کوئی بڑا ہونا ضروری نہیں چھوٹا بھی اپنے بڑوں سے کہہ سکتا ہے ایک ناقص بھی تو ایک کامل کے سامنے کہہ سکتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تو عالم بشریت اور عالم کائنات میں کوئی نہیں لیکن آپ مشورہ اپنے چھوٹوں سے بھی فرماتے ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض دفعہ رائے قبول بھی فرمالیتے ہیں۔ بعض دفعہ اس رائے کی توقیر بھی فرماتے ہیں۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں۔ اگر کسی سے مشورہ بھی نہ فرماتے تو کوئی ادنی نقص اور کمی نہ رہتی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں اور ملھم من اللہ ہیں۔ مگر تعلیم اور اُسوہ حسنہ کے طور پر آپ نے چھوٹوں کو بھی موقع دیا کہ وہ بات کریں۔ ایک ناقص الاستعداد کو بھی علم دیا ہے کہ وہ ایک کامل الاستعداد

کے سامنے اپنا خیال ظاہر کرے، قابل قبول ہوتو قبول کیا جائے۔ نا قابل قبول ہوتو منہ پر مارا جائے۔

لیکن اگر وہ ناقل ہوتو ناقل کی بات تو ماننا ہی پڑے گی، ہاں اگر اپنی رائے ظاہر کرے تو حق ہے کہ آپ دیوار پہ دے ماریں۔ لیکن اگر وہ نقل کرے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا پھر تو اگر دیوار بھی نقل کرے گی تو اس کی بھی توقیر کرنے پڑے گی اگر چہ دیوار جمادات میں سے ہے اور آپ ماشاء اللہ انسانات میں سے ہیں۔ اشرف المخلوقات میں سے ہیں لیکن اگر دیوار پر بھی نصیحت لکھی ہوئی ہوتو قبول کرنی پڑے گی جبکہ وہ نصیحت حق ہو......تو آپ مجھے ایک دیوار ہی سمجھ لیجئے اور دیوار کیا سمجھ لیجئے ہم سب ہی واقعہ میں دیوار ہیں کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم؟ کیا ہمارا عرفان؟ کوئی کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اپنے بزرگوں کا نام لیتے ہیں ان کے کچھ مقولے یاد ہیں وہ نقل کر لیتے ہیں ایک دفعہ ہمارے شیخ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کی مسجد میں وعظ فرما رہے ہیں تو محبت پیار میں طلبہ کو اکثر جاهلین فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا کہ: جاہلین ہمیں تو روٹیاں بھی اس لئے ملتی ہیں کہ پیغمبر کے چند نام ہم نے یاد کر لئے ہیں۔ انہیں کہتے رہتے ہیں اس کے طفیل میں ہمیں بھی روٹی ملتی رہتی ہے...... تو کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم صرف یہ کہ بزرگوں کے سُنے سُنائے کچھ مقالات یاد کر لئے کچھ انہوں نے کتابوں میں پڑھا دیا۔ تو کچھ کلمات یاد ہو گئے، تو ہم ناقل محض ہیں۔ ہماری ذات کا کیا کمال ہے؟ ذات جب آئے گی تو وہ قابل نفرت ہو گی۔ لیکن اگر نقل کے ساتھ کلام آئے گا تو وہ قابل عظمت ہو گا۔ اس لئے نصیحت کے قبول کرنے میں بڑے چھوٹے کا فرق نہیں سمجھنا چاہئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ اتنا بڑا علم آپ نے کہاں سے حاصل کیا فرمایا کہ: ''لِسَانٌ سَئُوْلٌ وَقَلْبٌ عَقُوْلٌ'' ① بہت زیادہ پوچھ گچھ کرنے والی زبان کی بدولت اور بہت زیادہ سمجھنے والے دل کی بدولت مجھے یہ علم حاصل ہوا۔

تو علم کے میدان میں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کہ کہنے والا چھوٹا ہے یا ناقص الاستعداد ہے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا ذاتی قول ہے یا منقول ہے اگر منقول ہے تو واجب القبول ہے غیر منقول ہے تو پھر وہ غیر معقول بھی ہے اور اسکو قبول کرنا کوئی ضروری بھی نہیں ہے تو پھر جو اس میں غلطی ہے وہ اپنے نفس کی ہے اور جو خیر ہے وہ اللہ اور اسی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور اہل اللہ کی طرف سے ہے اس واسطے اس کے قبول کرنے کی ہمیں توقع رکھنی چاہیے، حق تعالٰے شانہ آپ کو اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور مقبولیت کے راستے عنایت فرمائے۔ اور انجام بخیر فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

① فیض القدیر، ج:۲، ص:۲۲۷.

وعظ یوسفی

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾o صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۱)

بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی اپنا وعظ سنانا مقصود نہیں ہے، بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کا وعظ آپ کے سامنے نقل کرنا ہے اور وہ وعظ بھی گویا نقل در نقل ہے، یعنی اس وعظ کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی کتاب مبین میں نقل فرمایا ہے، اس سے نقل کر کے میں آپ کو سناؤں گا تو وہ وعظ میرا نہیں ہوگا بلکہ پیغمبر کا وعظ ہوگا، جس کے ناقل حق تعالےٰ شانہ ہیں تو نقل بھی اعلیٰ ترین اور اعلیٰ پیمانے کی سچی، وعظ کہنے والے بھی پیغمبر، اس واسطے نقل بھی مکمل اور وعظ بھی مکمل، تو ایسی چیز کے نقل کرنے سے خود ہمارے لئے بھی برکت اور سعادت ہوگی بہ نسبت اس کے کہ ہم اپنے افکار و خیالات پیش کریں وہ چیز کیوں نہ پیش کریں جو اللہ کے ایک رسول نے ارشاد فرمائی ہے اور حق تعالےٰ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔

یہ جلیل القدر پیغمبر جن کا وعظ مجھے اس وقت نقل کرنا ہے، کون ہیں؟ یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کی بہت سی بالکل امتیازی خصوصیات ہیں، ویسے تو سارے انبیاء علیہم السلام کامل اور مکمل ہوئے ہیں ان میں ادنیٰ کی یا ذرہ برابر نقص نہیں ہوتا لیکن ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۲) بعض رسولوں کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے تو ان میں تفاضل ہے، ایک سے ایک بڑھ کر ہے بڑھیا تو سبھی ہیں مگر ایک سے ایک بڑھ کر بھی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیات ...... تو یوسف علیہ السلام بھی انہیں انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں جن کو اللہ نے کچھ امتیازی خصوصیات دی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں سب سے پہلی خصوصیت تو اعلیٰ ترین نسب کی ہے اور وہ بھی سلسلہ وار، یعنی خود بھی جلیل القدر پیغمبر، ان کے والد بزرگوار بھی پیغمبر یعنی حضرت یعقوب

علیہ اسلام یعقوب علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تو نسلاً بعد نسل چوتھی پشت تک پیغمبری کا سلسلہ چلا آیا تو ظاہر بات ہے کہ یہ خود مستقل ایک برکت ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی بندہ صلاح اور نیکی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی پشتوں میں نیکی ڈال دیتا ہے سات پشتوں تک نیک پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں تو جب اُمتیوں کا یہ عالم ہے کہ نیکی میں کوئی جم جائے تو اس کی سات پشتوں تک نیکی کا اثر جاتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کی بڑائی اور بزرگی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ ان سے بڑھ کر دنیا کے اندر نیکی کرنے والا کون ہے؟

اور یہ بھی فرمایا گیا: اگر کوئی مسلم، مومن امت کا کوئی آدمی بدعمل ہوتا ہے تو اس کی نحوست ساتوں پشتوں تک جاتی ہے اور پھیلتی چلی جاتی ہے اس لئے مسلمان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر خدانخواستہ بدعملی برت رہا ہے تو سات پشت کو تباہ کر رہا ہے اگر خود تباہ ہو جائے تو چلو ایک برباد ہے لیکن ایسی بربادی کہ ساتویں پشت تک اولاد کو تباہ اور برباد کر دے۔ اس شخص پر کتنی بڑی ذمہ داری اور کتنا بڑا وبال ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: بدعمل پر میں لعنت کرتا ہوں اور اس لعنت کا اثر ساتویں پشت تک جاتا ہے۔ تو یہی صورت نیکی کی ہے، ایک صالح نیک آدمی دیانت، امانت، عبادت اور معاشرۂ صالحہ کا پابند ہے اس کی اولاد میں نیکی کا اثر آئے گا کہ اولاد در اولاد یہ سلسلہ چلے گا اگر خدانخواستہ بدی (کا ارتکاب) بھی ہوا، اولاد سدھر جائے گی، انجام پھر بھی آبائی نیکی کی وجہ سے صحیح ہو جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خاندانی کرامت ...... تو انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی نیک ہے نہ کوئی صالح ہے نہ کوئی پارسا ہے، تو ان کی پشتہا پشت تک نیکی کا اثر جانا قدرتی بات ہے تو یوسف علیہ السلام خود بھی پیغمبر، ان کے والد پیغمبر، ان کے دادا پیغمبر ا نکے پردادا پیغمبر گویا چاروں پشتوں تک پیغمبری چلی آئی ہے جو نیکی کی جڑ بنیاد ہے۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت میں بیان فرماتے ہیں کہ: ''اَلْکَرِیْمُ ابْنُ الْکَرِیْمِ ابْنِ الْکَرِیْمِ ابْنِ الْکَرِیْمِ'' ① خود بھی کریم باپ بھی کریم دادا بھی کریم، پردادا بھی کریم۔ کرامت آبائی طور پر چلی آرہی ہے تو وعظ کہنے والی وہ شخصیت ہے کہ جس کی خاندانی کرامت اور بزرگی پشتہا پشت سے چلی آرہی ہے اور آگے بھی پشتہا پشت تک چلی، تو وعظ میں بھی کتنی نیکی، کتنی تاثیر ہوگی، اس لئے میں نے اس وعظ کا انتخاب کیا۔

پھر یہ کہ نسب ہی نہیں بلکہ نسبت بھی جو بڑوں کی نسبت ہے، وہ بھی آئی، پردادا پیغمبر تو پیغمبری کی نسبت ان کی اولاد میں آنی چاہیے، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں تو جیسے نسب آیا ہے، ویسے نسبت

① السنن للترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة یوسف ج: ۱۰ ص: ۳۸۵.

بھی آتی ہے.....اور سیرت کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا کیا پوچھنا، انبیاء تو وہ ہیں کوئی بُرائی ان سے سرزد نہیں ہوتی یہ اجماع ہے اور اہلسنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبیرہ اور صغیرہ گناہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ پیغمبری کے بعد اور پہلے بھی تو گویا نیک ہی پیدا کئے جاتے ہیں ان کی طبیعت کی اُفتاد ہی نیک اور صحیح ہوتی ہے مخلی بالطبع ہو کر ان کو کدھر بھی چھوڑ دو، وہ نیکی ہی کی طرف جائے گی، بدی کی طرف مائل نہیں ہوگی تو انبیاء کی فطرت میں صلاح ہوتی ہے، ان کی طبیعتوں کے اندر رشد، بزرگی اور بڑائی ہوتی ہے۔

حالانکہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ طبیعت ہر انسان کی بے شعور ہے، طبیعت میں محض جذبات ہوتے ہیں۔ سمجھ نہیں ہوتی.....بھوک لگتی ہے، طبعی جذبہ ہے سمجھ کے بھوک نہیں لگتی، یہ نہیں ہے کہ آپ دلائل سے بھوک لگوائیں، بلا دلیل لگے گی، یہ طبعی جذبہ ہے بلکہ اگر اس کے خلاف دلیلیں قائم کریں گے جب بھی بھوک نہیں رکے گی، آپ طبیعت کو سمجھائیں کہ اس وقت کھانا بہت مضر ہے بہت برا ہے ہرگز مت کھاؤ، یہ دلیل اور یہ دلیل طبیعت کسی کی نہیں مانے گی وہ تو یکلخت لگ جائے گی پیاس لگے گی تو لگے گی، دلائل سے نہیں لگتی بلکہ دلائل سے مٹتی بھی نہیں اور رکتی بھی نہیں، تو طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں شعور نہیں ہوتا جیسے میں نے عرض کیا کہ: بھوک سمجھ کے تھوڑا لگتی ہے۔ سمجھدار کو بھی لگے گی ناسمجھ کو بھی، حکیم کو بھی بے وقوف کو بھی جو بالکل ایک حرف بھی نہیں جانتا اس کو بھی.....اگر سمجھ کر دلائل سے بھوک لگا کرتی تو جاہل کو کبھی بھوک نہ لگتی، اس لئے کہ وہ بے چارہ دلیلیں نہیں جانتا مگر اُسے بھی لگتی ہے تو بھوک پیاس اور جذبات طبعی سمجھ بوجھ کے محتاج نہیں ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی طبیعت اس رفتار سے پیدا کی جاتی ہے کہ وہ چلتی ہی نیکی کی طرف ہے کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ نبی کی طبیعت میں جب جذبہ اُٹھے گا خیر کا اُٹھے گا شر اور برائی کا کبھی نہیں اُٹھے گا تو تین اشخاص ہوتی ہیں انبیاء علیہم السلام کی، نسب ونسبت اعلیٰ اور پاک طبیعت)

یہی وجہ ہے کہ شریعت تو انبیاء کی طبیعت کے اوپر چلتی ہے جو وہ کہہ دیں وہ شریعت ہے جو کر گذریں وہ شریعت ہے، شریعت کے یہی تو معنی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کیا۔ لہٰذا اُمت بھی یہ کرے، وہ شریعت بن گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اس طرح پڑھی لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ نے حج اس طرح کیا لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے یہ ارشاد فرمایا: وہی شریعت ہے تو نبی کا قول، فعل اور عمل شریعت بنتا ہے، اگر خدانخواستہ طبیعت میں کھوٹ ہو اور غلطی بھی سرزد ہو تو شریعت پر عمل باقی نہیں رہ سکتا، نبی کا کیا ہوا اور کہا ہوا شریعت ہوتی ہے اگر اس میں غلطی ہو جائے تو پھر دنیا کے انسانوں کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، ان کی طبیعت پاک ہوتی ہے وہ جب چلے گی بزرگی اور خیر و برکت کی طرف چلے گی، برائی کی طرف نہیں جائے گی، تو تمام ہی انبیاء کی یہ فطرت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں، صالح، مقدس اور برتر ہیں، کوئی ادنیٰ تصور بھی گناہ کا نہیں ہے تو جیسے نسب اعلیٰ ہے، نسبت اعلیٰ ہے ویسے سیرت بھی اعلیٰ ہے اس لئے کہ سیرت کہتے ہیں پاکیزہ اخلاق، پاکیزہ عادات، پاکیزہ عمل کو تو نبی سے بڑھ کر

کس کی پاک ہو سکتی ہے؟ نبی سے بڑھ کر کس کے اونچے اخلاق ہو سکتے ہیں؟ نبی سے بڑھ کر کس میں صلاح ہو سکتا ہے؟ تو سیرت بھی مقدس اور نسب ونسبت میں بھی اعلیٰ......

حضرت یوسف علیہ السلام کا خلقی حسن اور سیرت باطن......اور خصوصیت سے یہ بات ہے کہ صورت بھی اعلیٰ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو حسن و جمال دیا گیا، اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جب اللہ نے دنیا کو حسن تقسیم کیا تو آدھا حسن و جمال تو کل عالم کو دیا آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا① تو حسن و جمال وہ تھا کہ لوگ دیکھ کر مبہوت ہو جاتے، اپنے آپے میں نہ رہتے تھے یہ کیفیت طاری ہوتی تھی آپ نے تو سُنا ہی ہوگا مشہور قصہ ہے۔

عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام......قرآن کریم میں بھی ہے کہ زلیخا عاشق ہوگئی تھی حضرت یوسف علیہ السلام پر، اور تھے آپ زرخرید غلام۔ ان کو مصر کے بازار میں خرید لیا تھا، بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا، کنوئیں والوں نے نکال کے کنعان کے بازار میں بیچ دیا، عزیز مصر نے خرید لیا تو گویا زرخرید غلام تھے مگر حسن و جمال غیر معمولی تھا اور بزرگی وتقدس نے اس پر اور بھی نورانیت پیدا کردی تھی، تو ایک تو خلقی اور صورت کا حسن و جمال پھر سیرت کی نورانیت، وہ بھی اس جمال میں چمکتی تھی تو وہ اور بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بن گیا، ہزاروں عشاق تھے مگر زلیخا بالکل فنا ہو چکی تھی مصر کے امراء وزراء کی جتنی بیگمات، بی بیاں اور بیٹیاں تھیں، انہیں زلیخا کے اوپر رشک اور حسد تھا وہ یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح سے زلیخا یوسف کو چھوڑ دے اور ہم اس پر قبضا ئیں یوں تو کہہ نہ سکتی تھیں کہ تو چھوڑ دے ہم قبضا ئیں۔ یہ تو بے عزتی کی بات ہوئی زلیخا کو طعنے دیتی تھیں کہ بڑی بدعمل ہے غلام پر عاشق ہوگئی اسطرح ملامتیں کر کے چاہتی تھیں کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام اس کے دل سے اُتر جائیں اور جب اس کا دل ہٹ جائے تو ہم قبضا لیں تو ظاہر میں تو ملامت کرتی تھیں کہ بڑی بے وقوف ہے غلام پر عاشق ہوگئی اور عاشق درحقیقت خود تھیں، یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام ہمارے قبضے میں آجائیں۔

زلیخا جب طعنے سُنتے سُنتے تنگ آگئی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں ایک دن فیصلہ کر دوں تاکہ یہ طعنہ زنی کسی طرح بند ہو، تو اس نے بیگمات مصر کو پارٹی دی اور پارٹی بھی "ٹی پارٹی"......چائے ممکن ہے اس زمانے میں نہ ہو مگر چائے کے لوازم میں فروٹ میوے اور پھل ہیں وہ سب جمع تھے بادشاہ کی بیوی تھی دسترخوان سجایا......جب ہمارے آپ کے دسترخوان پر اتنے کھانے ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے وہ تو بادشاہ کی ملکہ کا دسترخوان تھا، تو پھل پھول اور فروٹ بہت سجائے گئے کہ دسترخوان خود ایک زینت بن گیا۔

دسترخوان سجانے پر ایک حکایت......جیسے آج کے زمانے میں دسترخوان کا سجانا یہ بھی ایک مستقل فن ہے، یورپ میں مستقل کمپنیاں ہیں جو دسترخوان سجاتی ہیں ان کی فیس مقرر ہوتی ہے، ہزاروں روپے فیس کے دیے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السماوات، ج:۷۵، رقم: ۴۱۱.

جاتے ہیں کافی پہلے کی بات ہے کہ وائسرائے کی ہندوستان میں بمبئی کے سیٹھ نے دعوت کی تھی۔لندن کی ایک کمپنی کو یہ آرڈر دیا گیا کہ وہ میز سجائے اور چائے کا سامان لگائے، تو اس نے کیک اور پیسٹریاں اس انداز کی بنائیں کہ ہندوستان بھر کی جتنی مشہور عمارتیں تھیں ان سب کے نقشے بنائے۔ دہلی کی جامع مسجد مجسم بنا کے کھڑی کردی۔ مینار بھی بنے ہوئے ہیں گنبد بھی بنے ہوئے ہیں مصلے بھی بچھے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قمقمے لگا کے ان کے اندر بجلی کی روشنی بھی دوڑائی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ دلی کی جامع مسجد کھڑی ہوئی ہے بس نمازیوں کے آنے کی دیر ہے آگرہ کا تاج محل اس کا کیک بنایا۔ وہی چار مینار، وہی گنبد، وہی نقش ونگار، وہی اس میں رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ مقبرہ آصف الدولہ، مقبرہ ہمایوں، ان سب کے مجسمے بنائے جو کہ وہ کیک پیسٹری تھے اور میز کے اوپر جو کہ دسترخوان تھا، وہ بھی عجیب گل کاری کی ہوئی تھی، غرض جب وائسرائے نے دیکھا کہ میز کیا ہے گویا ہندوستان جمع ہے اس کے اوپر ساری مشہور عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہوگیا۔ اس میز کے سجانے پر ہزار ہا روپیہ خرچ ہوا۔ وائسرائے آکے بیٹھ گئے۔ اس غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ کھانا رکھا ہوا ہے وہ سمجھے عمارتوں کی شکل میں میز سجائی ہے کھانا اب تھوڑی دیر میں آئے گا، جب دس پندرہ منٹ ہوگئے جتنا وقت دیا تھا وہ گذرنے لگا تو وائسرائے نے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھا کہ سیٹھ سے کہو کھانا منگوائیں سیکرٹری نے اشارہ کیا کہ دیر ہورہی ہے میز تو بہت عمدہ سجی ہوئی ہے مگر کھانا بھی تو آنا چاہیے۔ اس نے کہا، یہی تو کھانا رکھا ہے جو عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہوا اور کھانا شروع کردیا۔ اب مینار کو کھائیں تو اور ذائقہ، گنبد توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ مصلے توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ غرض تھوڑی دیر میں وائسرائے اور اُن کے اسٹاف نے ہندوستان کی ساری عمارتیں ختم کردیں، اب ان کو یہ فکر تھی کہ یہ تو سب چیزیں میٹھی تھیں کوئی سلونی نمکین چیز بھی تو آئے، تو سیکرٹری کی طرف دیکھا، اس نے سیٹھ کی طرف دیکھا تو سیٹھ نے کہا یہ جو دسترخوان بچھا ہوا ہے یہ نمکین کھانا ہے اسے توڑ توڑ کے کھایا تو اس میں نمکینی کا ذائقہ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ: کچھ ایسا ذائقہ بھی ہو جو نمک اور مرچ کے ذائقہ کو نیچا کر کے ہضم کردے جیسے چٹنی اچار ہوتا ہے تو اس نے کہا یہ میز جو رکھی ہوئی ہے چٹنی ہے تو میز کے پائے تختے سب توڑ کے کھا گئے۔

زلیخا کی دعوت ...... تو انسان کی فطرت میں جمال پسندی ہے کہ چیز کو استعمال کرے اور خوبصورت بنا کے استعمال کرے۔ تو یہ اس زمانے میں بھی تھی تو زلیخا نے دسترخوان سجایا اور اس میں رنگ برنگ کے پھل اور قسم قسم کے فروٹ یہ سب چیزیں رکھیں اور چھریاں بھی رکھیں کہ کاٹ کاٹ کر لوگ کھائیں اور استعمال کریں، تمام کھانے جمع کئے اور جتنی وہاں مصر کے وزراء کی بیبیاں، امراء کی بیبیاں اور بیٹیاں تھیں سب کی سب جمع تھیں۔ زرق برق لباس پہن کر اور سنگھار کرکے آئیں مقصد یہ تھا کہ یوسف ہمیں پسند کرکے زلیخا کو چھوڑ دے۔

دسترخوان سجایا پھل پھول چھریاں رکھیں اور کہا بسم اللہ کرو، کھانا شروع کرو، چھریاں لے کے انہوں نے پھلوں کو کاٹنا شروع کیا حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپا رکھا تھا اور کہا جب تک میں اجازت نہ دوں تو آپ باہر نہ

نکلیں جب انہوں نے کاٹ کر کھانا شروع کیا تو یوسف علیہ السلام کو اشارہ کیا کہ باہر آ جاؤ۔ باہر آنا تھا کہ ان کا جمال دیکھ کر ہر عورت اتنی مبتلا ہوئی کہ ہوش حواس کھودیے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے کسی نے اپنی انگلی کاٹ لی، کسی نے انگوٹھا کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا سب عورتیں لہولہان اور زخمی ہو گئیں۔ اور یہ کہا کہ۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ① خدا کی قسم یہ کوئی انسان اور بشر نہیں معلوم ہوتا یہ تو کوئی فرشتہ ہے اللہ کا جو آسمان سے اتر آیا۔ اس لئے کہ ملکیت کی نورانیت بھی موجود حسن و جمال بھی موجود، جمال میں نورانیت اور چمک بھی موجود تو کہا واللہ یہ انسان معلوم نہیں ہوتا کوئی فرشتہ ہے۔ ان کی صورت اور جمال میں مائل ہو کر ہوش، حواس بھی گم ہو گئے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے ہاتھ کی انگلیاں اور کھونچیں کاٹ لیں، کپڑے بھی خراب ہو گئے تو اس وقت زلیخا نے کہا کہ ﴿فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ﴾ ② یہی ہے وہ جس کے بارے میں مجھے ملامت کیا کرتی تھیں، تم نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لئے؟ اپنی انگلیاں کیوں کاٹ لیں؟ میں نے تو آج تک ایک انگلی نہیں کاٹی تم نے انگلیاں تک کیوں قلم کر دیں؟ یہ وہی تو غلام ہے جس کے بارے میں تم مجھکو طعنہ دیتی تھیں تمہیں شرم نہیں آتی۔ اب توبہ کر کے واپس ہوئیں کہ اب کچھ نہیں کہیں گی، زلیخا ہم پر غالب ہے، یہ تو ایسا محبوب ہے کہ سارے عالم کو عاشق بننا چاہیے، زلیخا بے چاری کا کیا قصور ہے؟ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نسب وہ اعلیٰ تھا، نسبت وہ اعلیٰ تھی، سیرت وہ اعلیٰ تھی، صورت بھی اعلیٰ تھی تو ایسی ذات مقدس جس کا نسب نسبت، سیرت اور صورت سب اُونچا ہو، اس کا وعظ جب پیش کیا جائے گا۔

تو وعظ بھی تو اونچا ہو گا کتنا عالی مقام ہو گا وہ کلام جو ایسی برگزیدہ شخصیت کی زبان سے نکلا ہو اور حق تعالیٰ شانہ حکایت فرمائیں کہ یوسف نے یہ وعظ کہا تھا تو اللہ میاں کو بھی پسند آیا۔ تو جو پیغمبر کہے۔ اللہ میاں پسند کرے اس کی نقل کیجائے تو اس سے بہتر وعظ نہیں ہو سکتا، اس واسطے مجھے کوئی اپنا وعظ کہنا نہیں ہے بلکہ ایسے جلیل القدر پیغمبر کا وعظ سنانا ہے جس کی شخصیت یہ ہے جو میں نے عرض کی ہے یہ وعظ کون سے موقع پر کہا گیا؟ یوسف علیہ السلام نے کب فرمایا؟ تو قرآن نے اس کا واقعہ بیان کیا ہے اسی وجہ سے مجھے یہ رکوع پڑھنا پڑا۔ ورنہ ایک دو آیت کافی تھیں مگر چونکہ واقعہ متعلق ہے اس واسطے میں نے کئی آیتیں پڑھیں۔

زلیخا کی آخری تدبیر...... اس کا واقعہ یہ ہوا کہ عزیز مصر بادشاہ مصر کے دو خادم تھے، ایک شراب پلانے والا، اور ایک دستر خوان بچھانے والا باورچی، گویا ایک مطبخ کا انچارج آفیسر تھا اور ایک شراب پلانے کا انچارج آفیسر تھا ان پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے کھانے میں زہر ملایا۔ بادشاہ کو یہ قتل کرنا چاہتے تھے ادھر حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب زلیخا عاشق ہو چکی زلیخا نے ہر چند چاہا کہ میری طرف حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوں مگر مائل نہیں ہوئے، وہ تو پیغمبر اور مقدس تھے تب اس نے یہ کیا کہ ایک بڑا عالیشان

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۲.

مکان بنوایا اور اس کو فرنیچر سے آراستہ کیا اس میں زرق برق لباس پہن کر خود بیٹھی، اس کے اردگرد ایک اور مکان اس کے آگے ایک اور کمرہ سات کمروں کے اندر جو ساتواں کمرہ تھا، اس کو سجایا اور نہایت ہی فاخرہ لباس پہن کر وہاں بیٹھی اور یوسف علیہ السلام کو وہاں بلوایا مقصد یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام پیغمبر سہی مگر ہیں تو انسان اور انسان میں جنسی جذبات ہوتے ہیں تو جب میرا حسن و جمال دیکھیں گے خلوت اور تنہائی میسر ہوگی تو طبعاً میلان ہو جائے گا اور تدبیریں تو بیکار ہوگئی تھیں یہ تدبیر آخری تھی کہ جذبات کو اکھاڑ جائے تو جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ یوسف علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ آپ کو حکم پہنچا کہ اندر پہنچو، وہ پہنچ گئے اور ملازموں کو یہ حکم دیا تھا کہ جب ایک کمرے میں داخل ہوں تو اس کا اندر سے تالا بند کردو دوسرے میں داخل ہوں تو اسکا بھی تالا بند کردو اور تیسرے میں بھی اور ساتویں کمرے میں خود بیٹھی جب آپ اس میں پہنچے تو اس کا بھی تالا بند ہوگیا اب تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں تو خلوت، زلیخا کا حسن و جمال، آرائش اور پھر بہرحال بشریت بھی ہے یہ ایسی تدبیر تھی اگر پیغمبر اور معصوم نہ ہوں تو پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

یوسف علیہ السلام پہنچے تو دوسرا حال دیکھا کہ بڑی زرق برق بیٹھی ہے زلیخا نے اپنا مطلب پیش کیا، قرآن کریم میں اس کو فرمایا گیا۔ ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ ① تو ممکن تھا کہ بشریت اکھڑی جاتی لیکن چونکہ اللہ کی حجتیں اور پیغمبر کی برکت کے آثار سامنے تھے اس لئے بچ گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی منجانب اللہ حفاظت...... بعض احادیث میں ہے کہ: حضرت یوسف علیہ السلام نے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو چھت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں ② تو اللہ کی طرف سے حفاظت ہوتی ہے پیغمبروں کی طبیعت بھی پاک ہوتی ہے اور من جانب اللہ حفاظت بھی کیجاتی ہے۔

تو اس آیت کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام وہاں سے بھاگے۔ اب تالے لگے ہوئے تھے مگر یہ پیغمبر کا معجزہ تھا کہ جس تالے پر ہاتھ ڈالا وہ کھل کر گر پڑا۔ آگے گئے دوسرے تالے پہ ہاتھ ڈالا، وہ گرا، ساتوں تالے کھل کر گر پڑے اور آپ باہر آ گئے۔

اب زلیخا کو فکر ہوئی کہ یہ باہر جا کر سارا قصہ سنائیں گے تو میں بادشاہ کی بیوی بدنام ہوں گی...... تو پھر عورتوں میں مکاری تو ہوتی ہے ﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ ③ شیطان کے لئے کہا گیا۔ ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ ④ شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے اور عورت کا مکر بہت قوی اور مضبوط ہے شیطان تو چھپ کر کرتا ہے یہ سامنے آ کے کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ اتار چڑھاؤں کی باتیں اس طرح کرتی ہیں کہ بڑے بڑے عقلمند بھی بے وقوف بن جاتے ہیں...... شادی غمی کی جتنی رسوم ہیں جب یہ مرد کرتے ہیں تو انہیں ملامت کی جاتی ہے کہ یہ

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴. ② تفسیر الطبری، سورۃ یوسف، ج: ۲۴ ص: ۲۳۷.
③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۸. ④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۷۶.

حرکتیں کیوں کرتے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ عورتیں نہیں مانتیں عورتیں ان کے اوپر حکام ہیں کہ آرڈر وہاں سے ہوتا ہے تعمیل کرنے والے یہ ہیں، یہ انہیں چلاتی ہیں بے چاروں کے پاس گنجائش نہیں ہوتی۔ آدمی مبتلا ہوجاتا ہے جیسے حدیث میں فرمایا گیا:

''مَارَاَیْتُ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ'' ① کہ یہ عورتیں کیا ہیں....؟ ہیں تو ناقص العقل مگر بڑے بڑے عقلمندوں کی عقل اُچک لیتی ہیں۔

زلیخا نے دیکھا کہ اب میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میں بدنام ہوجاؤں گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام اصلیت کھول دیں گے تو دوڑ کر خود بھی باہر آئی اور شور مچایا کہ یوسف علیہ السلام بہت برے ارادے سے آئے تھے۔ میں اگر نہ بچتی تو مجھے خراب کر دیا ہوتا۔ لوگ جمع ہوگئے اور اس نے شور مچایا کہ مجھے خدا نے بچایا ان کا ارادہ تو غلط تھا۔ معاذ اللہ، زلیخا کا خاوند بادشاہ مصر نے دیکھا میری بیوی شور مچاتی ہے اور الزام ان پر رکھتی ہے، اس کے دل میں نہیں بیٹھتی تھی مگر اس نے کچھ ایسے اتار چڑھاؤ سے تقریر کی کہ خود بادشاہ کے دل میں بھی آ گئی کہ ممکن ہے یوسف علیہ السلام نے بُرا ارادہ کرلیا ہو! بادشاہ کے حشم و خدم بھی جمع ہوگئے۔ غرض زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ میں تو بری ثابت ہوں۔ سارا الزام یوسف علیہ السلام پر آجائے۔

حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر کی برأت کرنی مقصود تھی، تو ﴿شَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ اَھْلِھَا﴾ ② ایک چھوٹا سا بچہ جسے کوئی عقل نہ شعور، اس نے کہا کہ دیکھو فیصلہ کی ایک صورت ہے بات کھل جائے گی کہ قصور یوسفؑ کا ہے یا زلیخا کا یوسف کا کرتہ دیکھو اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے تو سمجھو کہ یوسف کا قصور ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو زلیخا کا قصور ہے یوسف جب بھاگے تو زلیخا نے کرتہ پکڑا تو وہ پیچھے سے پھٹ گیا تھا دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا بات کھل گئی کہ قصور زلیخا کا ہے یہ محض مبتلا کرنے کو اور اپنے کو بری ثابت کرنے کے لئے مکر و فریب کر رہی ہے ﴿اِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَھُوَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ○ وَاِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَھُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ﴾ ③ جب دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا۔

تو انہوں نے کہا یہ تو زلیخا کی حرکت معلوم ہوتی ہے یوسف سچے معلوم ہوتے ہیں تب عزیز مصر نے معذرت کی کہ ﴿یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِکِ اِنَّکِ کُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ﴾ ④ ''اے یوسف! درگذر کرو، شرارت زلیخا کی ہے معاف کرو، بات صاف ہوگئی''۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل کیوں کر گئے؟ ......عزیز مصر نے یہ سوچا اگر یونہی کہہ دیا تو میری بیوی تو بدنام ہوگئی، اس واسطے بدنامی سے بچنے کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل خانے میں بھیج دیا کہ دنیا پر واضح ہو کہ قصور

① الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم ج: ۲ ص: ۳. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۶. ③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۷، ۲۸. ④ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۹.

یوسف علیہ السلام ہی کا ہے گھر میں اعتراف کرلیا کہ آپ کا کچھ قصور نہیں مگر پبلک کو دکھانے کے لئے جیل بھیجدیا تاکہ بادشاہ کی بیوی کے بارے میں پروپیگنڈہ غلط نہ ہو۔

جیل پہنچے تو دونو جوان بھی جیل پہنچے جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے، ایک بادشاہ کا باورچی تھا جو کھانا پکاتا تھا اور ایک شراب پلانے والا اس کا انچارج آفیسر تھا ان دونوں پر الزام یہ تھا کہ بادشاہ کو انہوں نے زہر دیا، وہ دونوں بھی جیل خانے میں آئے، یوسف علیہ السلام پہلے سے موجود تھے جیل پہنچ کر ان دونوں ملازموں نے خواب دیکھے جس کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا ہے ﴿قَالَ اَحَدُ هُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا﴾ ① ایک نے دیکھا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں ﴿وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ﴾ ② دوسرے نے دیکھا کہ میرے سر پر ایک ٹوکرا ہے اس میں روٹیاں رکھی ہوئی ہیں اور چیل کوے ان روٹیوں کو کھا کر جا رہے ہیں دونوں ملازم یہ دونوں خواب لے کر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے اور کہا۔

تعبیر خواب ایک مستقل فن...... ﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ﴾ ③ اے یوسفؑ آپ ہمیں خواب کی تعبیر دیں ﴿اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ ④ ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ علیہ السلام کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ عارف باللہ بھی ہیں کامل بھی ہیں بزرگ بھی ہیں اور عالم غیب سے آپ کا رشتہ بھی ہے خواب غیب کی چیز ہوتی ہے تو جس کا تعلق امور غیبیہ سے ہو وہی خواب کی تعبیر بہتر دے سکتا ہے اس پر غیب کے عالم منکشف ہوتے ہیں حدیث میں فرمایا گیا ہے "لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ" ⑤

دنیا میں نبوت ختم ہوگئی۔ میرے آنے کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ہاں مبشرات باقی رہیں گی یعنی سچے خواب باقی رہیں گے جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں سچے خواب نبوت کا ایک حصہ ہیں جو اکثر و بیشتر ایمان والوں کو نصیب ہوتے ہیں گویا وہ عالم غیب سے ایک رشتہ ہوتا ہے تو خواب چونکہ رموز میں ہوتی ہے، اشارے ہوتے ہیں اور ان اشاروں کو وہ لوگ زیادہ پہچانتے ہیں جن کو غیبی عالم اور معاملات سے مناسبت ہوتی ہے وہ بتلا دیتے ہیں کہ اس اشارہ کا یہ مطلب ہے۔ اس سے یہ واقعہ مراد ہے تو قرآن و حدیث میں اس کے اصول قائم کردیے گئے تعبیر خواب کی ایک مستقل فن کی صورت اسلام میں ہوگئی۔ بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں تعبیر خواب کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ بڑے بڑے امام پیدا ہوئے جنہوں نے خواب کی اعلیٰ ترین تعبیریں دی ہیں۔

ایک خواب اور اُس کی تعبیر...... ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ مشہور امام ہیں خواب کی تعبیر دینے کے امام سمجھے گئے ہیں ان کی کتاب "تَاْثِیْرُ الْاَنَامِ فِیْ تَعْبِیْرِ الْمَنَامِ" دو جلدوں میں بڑی ضخیم ہے اس میں اصول اور قواعد خواب کی تعبیر نکالنے کے بیان کئے گئے ہیں اس میں بڑے عجائبات ہیں۔

---

①②③④ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۶.

⑤ الصحیح للبخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات، ص: ۵۸۳ رقم: ۶۹۹۰.

بات یاد آ گئی۔ بات تو ذرا طویل ہو رہی ہے لیکن جب پر زبان پر آ جائے تو رُکنا بھی مشکل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ: حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے آگ کے انگارے دھک رہے ہیں کیا تعبیر ہے؟ فرمایا جلدی جاؤ اور گھر سے بیوی بچوں کو نکال دو... تیرا گھر گرنے والا ہے وہ دوڑا ہوا آیا گھر سے بیوی بچوں اور سامان کو نکالا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد پوری بلڈنگ آ پڑی خواب کی تعبیر ہو بہو پوری ہوگئی چار پانچ مہینے کے بعد پھر ایک شخص آیا کہ حضرت میں نے خواب دیکھا ہے، فرمایا کہ: میری چار پائی کے نیچے انگارے دہک رہے ہیں وہی خواب جو پہلے نے بیان کیا تھا فرمایا جا کر کھدائی شروع کر خزانہ نکلے گا چار پائی کے نیچے سے لاکھوں روپے کی تعداد کا سرخ سونا نکلے گا، اس نے آ کر کھدائی شروع کی تو بڑی بھاری دیگ نکلی جس میں زرِ خالص اور سونے کے ٹکے بھرے ہوئے تھے لوگوں نے ابن سیرین سے عرض کیا کہ: خواب دونوں نے ایک دیکھا ہے ایک کا آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو لاکھوں روپے دلوا دیے، کیا بات ہے؟ فرمایا کہ: پہلے شخص نے جو خواب دیکھا تھا، وہ موسم گرما تھا۔ گرمی کے موسم میں چار پائی کے نیچے آگ ہونا یہ بنیاد کا منہدم ہونا ہے اس لئے میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا اور دوسرے نے یہ خواب سردی کے موسم میں دیکھا اور سردی میں چار پائی کے نیچے انگاروں کا ہونا یہ عظیم ترین نعمت ہے اور آگ کی صورت خالص سونے کی ہے تو میں نے یہ تعبیر دی کہ سونا نکلے گا تو خواب یکساں مگر تعبیر الگ الگ اس سے معلوم ہوا کہ خواب دیکھنے میں موسموں کو بھی دخل ہے یہ نہیں کہ خواب کے لفظ سُن کے جس طرح چاہیں تعبیر دیں، یہ تو ایک مستقل فن ہے اس میں موسموں کی بھی رعایت ہوتی ہے اور اصول کی بھی......

دوسرا خواب اور اس کی تعبیر...... حضرت قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قاضی القضاۃ تھے بھوپال میں اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) کا زمانہ تھا یہ اہل حدیث تھے اور بڑے عالم تھے ان کی بہت سی بڑی بڑی کتابیں اور تصانیف ہیں قاضی صاحب تعبیر میں بڑے مشہور تھے بڑے اعلیٰ درجہ کے معبر تھے، خواب کی جو تعبیر دیتے وہ ہاتھ واقعہ کی صورت میں آ جاتی۔

ایک نوجوان نے یہ خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑی جماعت نماز کے لئے کھڑی ہوئی ہے اور صف اولیٰ میں ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام ہیں نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ ہزاروں لاکھوں آدمی شریک ہیں اس کے ذہن میں یہ تھا کہ اس میں کوئی نواب صاحب کی فضیلت نکلے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کریں۔

قاضی صاحب نے فرمایا کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ بناوٹی تو نہیں؟ اس نے کہا نہیں حضرت واللہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے فرمایا کہ: اگر تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خان کا انتقال ہو چکا ہے، یہ اس کی تعبیر ہے، یہ کہہ رہے ہیں تھوڑی دیر میں سرکاری طور پر اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے ہاتھ کے ہاتھ تعبیر صحیح ہوگئی۔ اس پر ماتمی طریق سے جتنے سرکاری لوگ تھے، بھوپال کی

طرف دوڑ گئے کفن دفن میں شریک ہوئے تین دن رسمی طور پر ماتم رہا.....دفاتر بند رہے بہرحال ایک والیِ ملک تھے جب تین دن گذر گئے تو وہ نوجوان اہلِ حدیث خواب دیکھنے والا قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت تعبیر تو ہو بہو سامنے آگئی، مگر اس خواب سے آپ نے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ نواب صاحب کی اس میں بزرگی سامنے آگئی۔ یہ کیسے آپ سمجھے کہ نواب صاحب کا انتقال ہوگیا.......؟ تو کیا عجیب بات فرمائی، فرمایا کہ: نبی کی موجودگی میں کسی کو امام بننے کا حق حاصل نہیں ہے کہ آگے بڑھے، یہ نبی کا حق ہے، پھر بھی نبی کی موجودگی میں جو آگے ہوگا وہ جنازہ تو ہوسکتا ہے زندہ کو حق نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھے اس لئے میں نے یہ تعبیر دی کہ ان کا انتقال ہوگیا، زندہ ہو کر وہ نبی کے سامنے نہیں آسکتے، مردہ ہو کر جنازہ کی صورت میں آسکتے ہیں تو قواعد شرعیہ بھی خواب کی تعبیر دینے میں (ملحوظ) ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا کہ: ہر کس و ناکس کے سامنے خواب کا ذکر مت کرو، جو زبان سے نکلے گا وہی اس کی تعبیر ہو جاتی ہے ایسے شخص کے سامنے ذکر کرو جو اصول کے مطابق قواعد کے مطابق صحیح تعبیر دے، اور خواب دیکھنے والے کے حق میں بہتری ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر کیوں چاہی؟......تو یہ بات ان دونوں ملازموں نے سمجھی کہ خواب ہم جیلر کے سامنے ذکر نہیں کرتے یہ جیل حکام خواب کی تعبیر کیا جانیں؟ ان کے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر انوارِ نبوت برستے رہتے تھے، سب جانتے تھے کہ یہ مقدس ہیں وہ سمجھ گئے کہ یہی تعبیر دے سکتے ہیں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے نہ کسی اور کا ذہن جا سکتا ہے اس لئے کہا کہ: ﴿نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ اِنَّا نَرٰٮكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ ① آپ ہی تعبیر دیں اس لئے کہ آپ کی صورت پر ''احسان'' جھلک رہا ہے احسان کہتے ہیں اس طرح سے اللہ کی عبادت کرو گویا اللہ کو اپنی آنکھوں سے آدمی دیکھ رہا ہے یہ احسان ہے، ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ ایسے عابد ہیں کہ عبادت میں گویا اللہ آپ کے سامنے ہوتا ہے اتنا حضورِ قلب کیساتھ آپ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو جو ایسا بڑا عابد زاہد اور متقی ہو وہی خواب کی تعبیر دے سکتا ہے اس لئے آپ ہمیں تعبیر دیں۔

حکمتِ نبوت اور طریقِ تبلیغ......اب آگے حکمتِ نبوت کا ذکر ہے تعبیر دینے بیٹھے مگر یہ نہیں کہا یہ تعبیر ہے، اس پر غور کیا کہ ان دونوں کے دل میں میری کچھ عقیدت پیدا ہوئی اور میرے ساتھ حسنِ ظن پیدا ہوا جبھی تو خواب کی تعبیر مانگنے آئے، اس عقیدت سے مجھے فائدہ اٹھانا چاہیے، کہ ان کے سامنے دین پیش کروں (ممکن ہے) یہ اس عقیدت مندی میں اسلام قبول کرلیں۔ تو نبی کو طمع یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح لوگ حق پر آجائیں ذرا سی گنجائش دیکھی تو فوراً تبلیغ کرنے کی نیت کی انہیں تبلیغ کرنے کے لئے حیلہ چاہیے۔ اس لئے کہ انہیں بے انتہاء شفقت ہوتی ہے جذبہ یہ ہوتا ہے کہ سارا عالم کسی طرح سے حق کے راستہ پر آجائے۔ تو دیکھا کہ ان دونوں کے دل میں میرا اعتقاد جم گیا ہے اس سے میں تھوڑا بہت فائدہ اٹھاؤں کیوں نہ تبلیغ کروں؟ تو خواب کی تعبیر دینے کی بجائے پہلا جملہ یہ

ارشاد فرمایا: ﴿قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا﴾ ① میں تمہارے خواب کی تعبیر دوں گا اور دیر بھی نہیں لگاؤں گا اتنی جلدی تعبیر دوں گا کہ دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائیگا.......تو فرمایا: دل میں اشتیاق بڑھکر عقیدت بڑھ جائے تو جو میں کہنے والا ہوں دل میں اثر کرے گا یہ قاعدہ کی بات ہوتی ہے اگر کوئی شخص بے پرواہ ہو تو اس کے سامنے وعظ نہیں کرنا چاہیے اس کو فائدہ نہیں ہوگا جو دل سے سننے کیلئے آئے اس کے سامنے کہنا چاہیے وعظ اس کے دل میں اترے گا اثر کریگا تو انبیاء علیہم السلام جب یہ دیکھ لیتے ہیں کہ دل میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے قبول حق کی استعداد آ گئی۔ اس وقت وعظ کرتے ہیں تو کہاان دونوں نوجوانوں میں استعداد ہے عقیدت ہے اس عقیدت کو اور زیادہ بڑھادیا اور وعدہ کیا کہ میں ضرور تعبیر دوں گا۔ اور دوں گا بھی جلدی کو دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائے گا۔ اب وہ مطمئن ہوگئے۔ لیکن اب بھی تعبیر نہیں دی وعدہ تو دیدیا جس سے اشتیاق پیدا کردیا۔

آگے فرمایا ﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ﴾ ② یہ جو میں تعبیر دوں گا یہ محض میرا تخیل نہیں ہوگا کہ اختراع کر کے میں کچھ کہدوں بلکہ میرے پروردگار نے جو میرے اندر (تعبیر) خواب کا علم ڈالا ہے اس علم کی رو سے تعبیر دوں گا اس تعبیر کی رو سے خواب کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوگا۔ اگر محض اپنے تخیل سے تعبیر دوں تو بہت ممکن ہے تعبیر واقع نہ ہو۔ اس لئے یہ بھی اطمینان دلادیا کہ تعبیر دوں گا جلدی دوں گا۔ اور علم النبی سے دوں گا جس کے اندر کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں۔ تو یہ وہ تعبیر ہوگی جو پروردگار نے میرے قلب میں القاء فرمائی ہے وحی کے ذریعہ یہ واقعہ مجھے بتلادیا ہے وہ واقعہ میں تمہارے سامنے پیش کردوں گا تو اور زیادہ شوق بڑھ گیا کہ بہترین جگہ ہم آئے ہیں سچے خواب کی سچی تعبیر مل جائے گی بات کھل جائے گی۔ دل کی گرہیں کھل جائیں گی۔ لیکن اب بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر نہیں دی اشتیاق اور شوق کو بڑھکا دیا تا کہ جو بات میں نے ان کو کہنی ہے اس کیلئے اور زیادہ شوق بڑھ جائے، تعبیر بعد میں دیکھی جائے گی۔ اب وہ سراسر اشتیاق بن گئے کہ کسی طرح ہے جلدی تعبیر دیدیں۔

اپنا تعارف اور فکر آخرت......اسکے بعد یہ فرمایا: ﴿اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ ③ میری شخصیت کو تم پہلے سمجھ لو میری پوزیشن جان لو کہ میں ہوں کون.........؟ اس واسطے کہ کتنا بھی اعلیٰ کلام ہو لیکن شخصیت کا اثر پڑتا ہے وہی ایک بات میں کہوں تو اسکی کوئی وقعت نہیں اور وہی بات اگر حکومت کا سربراہ پریزیڈنٹ اور سیکرٹری کہے تو دنیا میں شور مچ جاتا ہے سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے قیاس آرائیاں شروع ہوجاتی ہیں وہی جملہ اخبارات میں کہوں تو کوئی بھی نہیں سنتا۔ اگر صدر جمہوریہ کہدیں تو دنیا میں پھیل جاتا ہے یہ شخصیت کی وجہ سے لوگ اثر لیتے ہیں، ایسے لوگ کم ہیں جو کلام کو دیکھ کر اثر لیتے ہیں کہ کلام حق ہے لہٰذا ہمیں متاثر ہونا چاہیے معمولی کلام بھی ہوگا تو شخصیت کی وجہ سے اعلیٰ کلام ہو جائے گا تو لوگ شخصیت کو دیکھتے ہیں اس لئے

① پارہ: ۱۲، سورۂ یوسف، الآیۃ: ۳۷. ② پارہ: ۱۲ سورۂ یوسف، الآیۃ: ۳۷. ③ پارہ: ۱۲، سورۂ یوسف، الآیۃ: ۳۷.

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ جب میں تعبیر دے رہا ہوں تو تعبیر سے پہلے اپنی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوزیشن بتلا دوں تا کہ تم سمجھ لو کہ میں کون ہوں۔ تو میرے کلام کا تم پر اثر ہو۔

تو میں وہ ہوں کہ اِنِّیْ تَرَکْتُ الخ کہ میں اس ملت اور قوم کو چھوڑے رہوں۔ اس قوم کے مسلک و مشرب کو چھوڑ دے رہوں جو اللہ و رسول پر ایمان نہیں لاتی۔ نہ آخرت کو مانتی ہے نہ اس کے دل میں کوئی ایمانی جذبہ موجود ہے میں تو اللہ اس کے رسولوں کو بھی مانتا ہوں آخرت کا بھی قائل ہوں کہ مجھے ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور دنیا کی زندگی سے ہر ہر فعل عمل اور قول کا جواب دینا ہے میری زندگی کا حساب ہونا ہے مجھے اپنی آخرت کی فکر ہے تو میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بے فکری قوم ہے جسے آخرت کی کوئی پرواہ نہیں وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں رہ لیا۔ کھالیا پی لیا عیش اڑا لیا اور بات ختم ہوگئی۔

یہ جو کچھ عیش اڑایا جا رہا ہے اس سے ایک دن سوال ہوتا ہے۔ ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ: ایک وقت آئیگا تم سے سوال کیا جائیگا کہ ان نعمتوں کا حساب دو جو دنیا میں استعمال کر کے آئے ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی اور گرمی کے زمانے میں ٹھنڈا پانی ''نعیم'' میں داخل ہے اس کا حساب ہوگا ② کہ تم نے اس نعمت کو استعمال کیا تو بدلے میں کتنے سجدے شکر کے ادا کیے، اتنے قطرے ٹھنڈے پانی کے استعمال کیے اس کے بدلے میں کتنا شکر ادا کیا ناشکری تو نہیں کی؟ کفرانِ نعمت تو نہیں کیا تو گرمی میں ٹھنڈا پانی اور سردی میں گرم پانی بھی نعیم اور نعمت ہے تو اس سے اوپر کی نعمتوں، کا اندازہ کیجئے ان نعمتوں کے بارے میں کتنے سوالات ہوں گے؟ آخرت کی جب یہ فکر ہوتی ہے تو آدمی نعمتوں کے استعمال میں کچھ پابند ہو جاتا ہے کہ جو نعمتوں کا مالک ہے اس سے پوچھ کر کے استعمال کروں کہ کہاں تک جائز ہے اور کس حد تک نہیں ہے یہ فکرِ آخرت ہے۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: میری پوزیشن تو یہ ہے میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بے فکری قوم ہے جس کے سامنے نہ آخرت ہے نہ اللہ کی ذات نہ رسول کی ذات، نہ قیامت کی پیشی اور حاضری کا خطرہ، مجھے تو آخرت کی بھی فکر ہے، اللہ کا بھی معتقد ہوں اس کے رسولوں کا بھی البتہ اس قوم میں سے نہیں جو اللہ و رسول اور آخرت کی منکر ہے اعتقاداً منکر ہے جیسے دھریہ قسم کے لوگ جن کا عقیدہ ہے ﴿مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ③ یہ زندگی تو یونہی چلی آرہی ہے، ختم ہو جائے گی مر جائیں گے تو دوسرے پیدا ہو جائیں گے، اور پیدا ہو جائیں گے تو وہ بھی مر جائیں گے لہٰذا عیش اڑالو، پھر دنیا میں آنا تو ہے نہیں ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تو یہ وہ کر سکتا ہے جو بے فکر ہو اور جسے یہ فکر ہو کہ میری پوری زندگی دھرائی جائے گی اور آخرت میں پائی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکاثر، الآیۃ: ۸۔ ② المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۴ ص: ۱۴۴، رقم: ۱۵۹۱۲۔

③ پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۲۴۔

سامنے آجائے گی۔ ذرہ برابر نیکی کی ہے تو وہ بھی سامنے پیش کردی جائے گی ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ① تو فرمایا کہ: میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آخرت کے منکر ہوں اعتقادی طور پر...... یا بعض لوگ آخرت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر عمل ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، بہت سے مومن مسلم بھی ہوتے ہیں جو ایمان کے درجے میں جانتے ہیں کہ آخرت ہے گی مگر قلب پر اثر نہیں ہے، ان کی زندگیاں بتلائی ہیں کہ بے فکری زندگی ہے انہیں بھول کے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں مرنا ہے قبر میں جانا ہے، حشر میں جانا ہے اللہ کے سامنے کھڑے ہونا ہے گو اعتقاداً وہ منکر نہیں مگر عملاً وہ معاملہ ہے جو منکر کا ہوتا ہے تو یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے نفی فرمادی کہ میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو منکر ہے آخرت کی خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً...... میں عملاً بھی مان رہا ہوں اور اعتقاداً بھی تو اب تک خواب کی تعبیر نہیں دی یہ فرمایا کہ: خواب کی تعبیر دوں گا، جلد دوں گا، علم النبی سے دوں گا جو سچی بھی ہوگی اور میری پوزیشن کو سمجھ لو کہ میں اللہ، اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا قائل ہوں منکرین میں سے نہیں ہوں۔ اب بھی خواب کی تعبیر نہیں دی بلکہ ایک اور جملہ ارشاد فرمایا......

فرمایا: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ ② میری پوزیشن کو ذرا اور جان لو، یہ تو منفی بات تھی کہ ان میں سے تو میں نہیں ہوں، جو آخرت کے منکر ہیں تو پھر کن میں سے ہو...؟ اس پارٹی سے تو آپ کا تعلق نہیں لیکن کس پارٹی سے آپ کا تعلق ہے....؟ اب مثبت پہلو سے سمجھایا، فرمایا میں متبع، پیرو اور ماننے والا ہوں اپنے آباؤ اجداد کی بات کا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحٰق وحضرت یعقوب علیہم السلام کی بات کا یہ میرے آباء پیغمبروں کی مسند پر تھے، ان کے پاس اللہ کی وحی آتی تھی، جو دین لیکر یہ آئے تھے اسی دین کے اوپر میں ہوں اور دین کا پہلا مطلب یہ ہے کہ مبداء اور معاد کو مانے، مبداء اللہ کی ذات ہے کہ ہماری ابتداء یہاں سے ہوتی ہے اور معاد یعنی لوٹ کے کہاں جانا ہے وہ آخرت ہے اس آنے اور جانے کے بیچ میں زندگی کس طرح گزارے یہ شریعت ہے، تو یہ تین بنیادیں ہیں، جن پر ایمان ہوتا ہے اللہ کی ذات، آخرت اور بیچ میں شریعت، اگر اللہ کو نہیں مانتا تو دین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوسکتی، اللہ کو مانتا ہے لیکن آخرت کو نہیں مانتا تو بے فکری زندگی ہوگی۔ جی ہوا نہ ہوا برابر ہوگیا دونوں کو مانتا ہے شریعت کا قائل نہیں تو عمل نہیں کرسکتا۔ تو تینوں چیزیں لازم ہیں اس کے بغیر آدمی متبع حق نہیں بن سکتا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد کیا کہ: تم سمجھ لو کہ میں کس پارٹی سے متعلق ہوں، وہ جماعت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے نسباً میں ان کی اولاد ہوں تو نسبتہً بھی ان کے راستہ پر ہوں۔

تین پیغمبروں کے اسمائے مبارکہ ذکر کرنے کی حکمت...... ایک پیغمبر کا ذکر نہیں کیا اکٹھے تین پیغمبروں کا ذکر کیا یعنی میرا راستہ وہ ہے جو نبیوں کے راستہ سے مسلسل چلا آرہا ہے اول تو ایک پیغمبر بھی غلطی پر نہیں ہوسکتا جب کہ

① پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ ۷۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸۔

دو کا عدد وہ ہے جو بڑے بڑے مقدمات میں بھی فیصلہ کر دیتا ہے۔ ﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ ① شرعی اصول کے مطابق اگر آپ مدعی ہیں تو دو سچ گواہ پیش کر دیں، دعوی ڈگری ہو جائے گا قاضی فیصلہ دے دے گا۔ تو جب دو عادل گواہوں کی گواہی سے مقدمات کے فیصلے ہو سکتے ہیں تو دو پیغمبروں کی گواہی سے ایمان کا فیصلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور جب دو سے بھی زیادہ تین ہوں تو خبر متواتر ہو جائے گی۔ پھر تو ویسے ہی انکار کی وجہ باقی نہیں رہتی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بتلا دیا کہ میں اس پارٹی میں سے ہوں اور اس پارٹی میں داخل ہوں جو پیغمبروں کا طبقہ ہے اب گویا ان دو قیدیوں کے دل میں عظمت جم گئی...... پہلے سے عقیدت لے کر آئے۔ شوق دلانے سے شوق بڑھ گیا اور یہ کہنے سے کہ وحی الٰہی سے تعبیر دوں گا اور زیادہ عقیدت پیدا ہو گئی اور یہ بتلانے سے کہ منکروں سے میرا تعلق نہیں برگزیدگی واضح ہو گئی اور یہ کہنے سے کہ پیغمبروں سے میرا تعلق ہے اور زیادہ رشد و کمال اور برکت نمایاں ہو گئی تو کتنا زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا ہو گا۔ ان دونوں قیدیوں کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو یہی اعتقاد پیدا کرنا مقصود تھا تا کہ آگے جو بات کہوں ان کے دل میں اترتی چلی جائے کوئی شک و شبہ نہ رہے یہ انبیاء علیہم السلام کا خاص طریقہ ہے کہ وہ اس طرح وعظ سے قبل دل میں صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں تا کہ ماننے میں رکاوٹ نہ رہے۔

نصیحت کے لئے متوجہ کرنا...... حدیث میں ایک واقعہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار تھے اور اس پر جو زین تھی اس زین پر میں بھی سوار تھا گویا ایک سواری پر دو سوار آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور میں اتنا قریب ہوں کہ بس بیچ میں ایک کھونٹی تھی جو زین پر لگی ہوئی ہوتی ہے، سواری پر آگے بیٹھنے والا تو لگام پکڑتا ہے اور پیچھے بیٹھنے والا اس کو تھام لیتا ہے تا کہ گرنے نہ پائے تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زین پر اگلے حصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے اور پچھلے حصہ میں میں تھا۔ تو آپ نے آواز دی یَا مُعَاذُ! اے معاذ میں نے عرض کیا لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! یارسول اللہ میں حاضر ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یارسول اللہ میں حاضر ہوں تو تیسری مرتبہ فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یارسول اللہ میں حاضر ہوں، تب آپ نے وہ بات فرمائی جو ارشاد فرمائی تھی۔ ② یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت معاذ تو سواری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوئے بیٹھے تھے صرف ایک دفعہ آواز دیں تو بات تھی دوبارہ سہ بار کس طرح آواز دیں؟ حالانکہ انتہائی قرب میں ہیں ایک سواری پر سوار ہیں اس طرح سے تین دفعہ پکارنے کا کیا مطلب......؟ علماء یہی لکھتے ہیں کہ تین دفعہ پکارا تا کہ توجہ اور شوق ہو کہ حضور کیا فرمانا چاہتے ہیں تو اس طرح دل میں شوق

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲. ② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم ص ۱۰

پیدا کر دیا پھر آپ نے وہ بات فرمائی جو کہنی تھی، وہ دل میں اترتی چلی گئی تو یہ انبیاء علیہم السلام کی حکمت ہوتی ہے کہ دلوں کو ہموار کرنے کے لئے پہلے کچھ باتیں ایسی کرتے ہیں کہ دلوں میں شوق پیدا ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چار پانچ جملے کہہ کے شوق کو بڑھا دیا، اعتقاد کو بھی اُونچا کر دیا۔ اس کے بعد وہ بات کہی جو کہنی تھی اور خواب کی تعبیر اب بھی ذکر نہیں کی...... تو وہ حیلے تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح حق بات ان تک پہنچا دیں آگے وہ بات فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا درس توحید...... ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [1] ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک اختیار کریں۔ دو خدا مان لیں یا ایک ہی مان لیں مگر عملاً عبادت میں شریک کریں کہ کچھ خدا کی عبادت کریں اور کچھ غیر اللہ کی سامنے بت رکھے ہوں ان کے سامنے جھکیں اور یوں کہیں کہ یہ تو قبلہ کی مانند ہیں ہم تو اللہ کے آگے جھکے ہیں اور بیچ میں بتوں کا واسطہ ڈال لیں یا یہ کہ خدا ایک ہی مان لیں مگر بہت سے اعمال میں بہت سی چیزوں میں دوسرے خدا کو تسلیم کر لیں کہ چھوٹے موٹے خدا علم دیتے ہیں، اولاد دیتے ہیں بڑا خدا بڑے کام کرتا ہے، آسمان زمین بنانا بڑے خدا کا کام ہے یہ بھی توحید نہیں تو خدا کی ذات یا صفات یا افعال میں کسی کو شریک کرنا یہ توحید کے خلاف ہے انبیاء علیہم السلام جو دین لے کر آئے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ جس کی عبادت کر رہے ہیں اس کی ذات بھی یکتا ہے نہ اس کا شریک ہے نہ ہمسر نہ برابری ہے اس کی صفات بھی لاشریک ہیں اس کی رحیمی کریمی سمع، بصر، قدرت اور حیات ایسی ایسی صفات بھی لامثال ہیں ہم میں حیات عارضی ہے، اس میں حیات اصلی ہے، اس کا وجود ذاتی ہے ہمارا وجود اس کا دیا ہوا ہے ہم چھوٹے افعال کرتے ہیں وہ فعل کرے تو آسمان بنا دے، زمینیں بنا دے جہاں بنا دے، ہم نہ زمین بنا سکیں نہ آسمان بنا سکیں، وہ چاہے چاند سورج ستارے بنا دے ہم ایک سورج بھی نہیں بنا سکتے تو موجد وہ ہے ہم موجد نہیں ہیں مصور وہ ہے ہم مصور نہیں ہیں۔

ہماری ایجاد کا حاصل جوڑ اور توڑ ہے یعنی دنیا کے دو مادوں کو ملا کر تیسری چیز بنا دی، ایجاد ہو گئی یا ایک چیز کی تحلیل اور تجزیہ کر کے صحیح اجزاء نکال دیے یہ ہماری ایجاد ہو گئی بنے بنائے مادوں کو جوڑتے رہنا توڑتے رہنا یہ ہماری ایجاد کا حاصل ہے انسان کوئی مادہ پیدا کر دیں آسمان و زمین بنا دیں یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے تو انسانی ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل ہے دو چیزوں کو جوڑ کر چیز بنا لینا یا جڑی ہوئی چیز کو کیمیائی طریق پر الگ کر لینا یہ ''ایجاد بندہ'' ہے اللہ کی ایجاد ہے کہ شئی نہیں ہے اور از سر نو وجود دے دیا، زمین بنائی تو خود بخود بنا دی۔

آسمان اعلیٰ مثال کھڑے کر دیے اس کی صفات اس کے افعال بھی بے مثل جن کی کوئی نظیر نہیں وہ جانداروں کو پیدا کرتا ہے، ہم پیدا نہیں کرتے، ہم پرندہ بنا دیں گے اس میں پٹرول بھی بھر دیں گے اس کو اڑا دیں گے اس کے اندر حرکت بھی ہو جائے گی مگر حیات اور شعور اس میں نہیں ہوگا اور وہ حرکت بھی ہماری ہوتی ہے اس کی نہیں

ہوتی ہوائی جہاز کو ہم اڑاتے ہیں اور شکل ایسی بنادیتے ہیں جیسے مچھلی کی ہوتی ہے، وہ ہواؤں میں تیرتا ہوا جاتا ہے تو ہوائی جہاز بنایا اس میں پیڑول کی روح پھونک دی جس سے وہ حرکت کرنے لگا، مگر ہوائی جہاز میں کوئی عقل وشعور نہیں یہ حیات نہیں کہلائے گی اس سے زیادہ حیات تو ہم میں ہے وہ ہمارا بنایا ہوا ہے خود اس میں کوئی جان یا علم وادراک نہیں اور حق تعالیٰ جس کو بناتے ہیں اس میں شعور علم وادراک بھی دیتے ہیں تو اصل بنانے والے اللہ ہیں اور ہم نقل محض کرتے ہیں اور وہ بھی شکل کی ہم تصویر بناتے ہیں، صورت بناسکتے، صورت بناتے ہیں تو اس میں حقیقت نہیں ڈال سکتے تو اصل میں یہ کام اللہ کا ہے۔

بہر حال اس کی صفات بھی بے مثل عقل بھی بے مثل۔ اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [1] فرماتے ہیں حق تعالیٰ: کہہ دو کہ وہ ایک ہے اور ایک کے معنی یہ نہیں کہ ایک تو دوسرا ہے ایسے تو ہم بھی ہیں اس لئے کہ ہم اپنی ذات میں ایک ہی ہیں اور ہمارے اندر تو کوئی دوسرا نہیں احد کے معنی ایک کے نہیں یکتا کے ہیں، اس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں بے مثال اور بے ضد ہے کوئی اس کا کنبہ نہیں کوئی شریک نہیں اللہ الصمد اس کی شان یہ ہے کہ وہ صمد ہے صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں بندہ صمد نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اسے ہر ہر چیز میں اللہ کی احتیاج ہے، زندہ رہنے میں کھانے میں ارادہ کرنے میں اس کا محتاج ہے دیکھنے میں محتاج، بینائی نہ دے تو دیکھیں کیسے؟ تو مھد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک ہر قدم پر اللہ کے محتاج ہیں اور وہ کسی ذرے کا بھی محتاج نہیں نہ انسان کا نہ کائنات کا وہ چاہے تو جہاں بنادے چاہے تو انہیں مٹادے تو صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں اور وہ از خود موجود ہو۔ کسی کے دیے سے اس کا وجود نہ ہو تو فرمایا کہ: "لَمْ یَلِدْ" وہ پیدا نہیں ہوا کہ اس کے ماں باپ ہوں "وَلَمْ یُوْلَدْ" نہ اس سے کوئی پیدا کیا گیا کہ اس کی کوئی اولاد ہو جائے اس لئے کہ اولاد ماں باپ کے مشابہہ ہوتی ہے نمونہ ہوتی ہے اور جب نمونہ بن گیا تو خدائی باقی نہ رہی خدا وہ ہے جس کا کوئی نمونہ نہ ہو مثال نہ ہو وحدہ لاشریک اگر اس کے اولاد ہو جائے تو اس کی مثال پیدا ہوگئی اگر وہ کسی کی اولاد ہے تو وہ مثال ہے دوسرے کی تو یہ بھی خدائی نہیں ہے۔

تو فرمایا: ﴿لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ﴾ اس لئے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے وجود میں اصل کا محتاج ہوتا ہے، ہم پیدا ہونے میں اپنے ماں باپ کے محتاج تھے ماں باپ نہ ہوتے تو ہم پیدا نہ ہوسکتے جو وجود میں دوسرے کا محتاج ہو گیا، وہ خدا کا کیا ہوگا؟ خدا تو کہتے ہیں اس کو جو ذرہ برابر محتاج نہ ہو، غنی مطلق ہو۔

﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ نہ اس کا کوئی برابر ہے نہ اس کا کوئی کفو ہے یعنی اس کی بیوی اور رفیقہ حیات بھی نہیں ہے تو نہ بیوی نہ اولاد نہ اس کا باپ نہ وہ خود کسی کا باپ تو ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ میں توحید بتلائی جو ذات ایسی

[1] پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص۔

خالص ہو کہ ذات میں بھی یکتا صفات میں بھی یکتا اس کے ساتھ شریک کرنا کتنی بڑی بدعقلی کی بات ہوگی تو (حضرت یوسف علیہ السلام) نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ﴾ ① ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں جو بے مثال ہے، اس کا کہاں کوئی شریک کہ اس کے ساتھ اُسے شریک کریں۔

ردعیسائیت پر ایک دلچسپ واقعہ...... مجھے واقعہ یاد آیا۔ دارالعلوم دیوبند کا ابتدائی دور ہے دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل عارف باللہ صاحب کشف و کرامت تھے بڑے اکابر اولیاء میں سے تھے ان کے دور میں دارالعلوم کا ایک طالبعلم تھا۔ وہ کوئی منتہی نہ تھا کہ حدیث قرآن پڑھ رہا ہو ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ وہ کہیں ڈیرہ دون چلا گیا وہاں وعظ کہنے لگا، وہاں پر عیسائیوں کے بڑے بڑے چرچ اور اسکول و کالج بھی ہیں وہاں ایک پادری صاحب وعظ کہہ رہے تھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے یہ طالب علم بھی شریک ہوگیا، پادری صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کو وہ اپنے طور پر ثابت کر رہا تھا، طالب علم اس سے الجھ پڑا۔ طالب علم نے کہا یہ بالکل غلط ہے خدا کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ اس نے دلائل دینے شروع کئے، اس نے دلائل توڑنا شروع کر دیئے مگر وہ پادری بڑا سمجھدار تھا یہ بے چارہ مبتدی طالب علم تھا، پادری کے سامنے چل نہ سکا، عوام پر اس کا بڑا برا اثر پڑا، عوام کو کیا خبر تھی کہ یہ طالب علم ہے وہ تو یہ سمجھے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک عالم ہے پادری نے اس کو ہرادیا اور وہ پادری کے آگے بول نہ سکا۔ اب اس کی تحقیق کون کرتا کہ یہ شرح جامی پڑھتا ہے حدیث وقرآن پڑھا ہوا نہیں ہے۔

قریب میں ایک بٹھیارے کی دکان تھی وہ کھانا بیچتا تھا اس کو بڑی غیرت آئی اس نے کہا ہمارا دارالعلوم دیوبند اور بدنام ہو جائے، وہ دکان سے کود کے آگیا اور طالب علم کو ایک طرف کر دیا اور کہا مولوی صاحب یہاں سے ہٹ جاؤ یہ پادری جاہل ہے اور جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے عالم کا کام نہیں، اسے میں سمجھتا ہوں اس طالب علم کو بھی غنیمت معلوم ہوا کہ جان چھوٹی آرام تو پایا، وہ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ بٹھیارہ آگے آیا اور کہا ہاں جی پادری صاحب! کیا کہتے ہو؟ کہا: ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اچھا آپ یہ کہتے ہو وہ اللہ کے بیٹے ہیں؟ اللہ میاں ان کے باپ ہیں (بٹھیارے نے پوچھا) اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ پادری بولا، بے وقوف اللہ میاں کی عمر! اللہ میاں ازل ابد سے ہیں ان کی عمر کیسے معلوم ہو؟ عمر تو اس کی پوچھ جو پہلے نہ ہو بعد میں ہوگیا ہو اور پھر ختم ہو جائے فلاں تاریخ پیدا ہوا فلاں تاریخ انتقال ہوگیا یہ بیچ میں اس کی عمر ہے جو ازل سے ابدالآباد تک ہے اس کی عمر تھوڑی پوچھی جاتی ہے، یہ تو بڑی بے ادبی کی بات ہے بٹھیارہ نے کہا اتنی لمبی زندگی میں کتنی اولاد ہوئی؟ کہا: ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کہا: ''لاحول ولا قوۃ الاباللہ'' ارے میں بٹھیارہ باون (۵۲) برس کی عمر میں بارہ بچوں کو جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی لاکھوں کروڑوں اور اربوں کھربوں سال عمر اور ایک اولاد، بارہ

اولاد تو صرف میری ہوگئی، یہ ہٹے کٹے جوان سب سامنے پڑے ہوئے ہیں، اب پادری غریب کے پاس اس کا کیا جواب تھا، وہ کچھ کہنے لگا عوام نے کہا بھائی ٹھیک تو کہہ رہا ہے بھٹیارہ بے چارہ جب اتنی بڑی عمر ہے تو اربوں کھربوں سال اولاد ہونی چاہیے لے دے کے صرف ایک اولاد، یہ تو انسانوں میں بھی عیب کی بات سمجھی جاتی ہے کہ عمر تو ہو سو برس اور لے دے کے بچہ ایک پیدا ہو لوگ کہیں گے کس چکی کا کھایا تو نے؟ کوئی جان بھی ہے تیرے اندر یا نہیں؟ تو اتنی لمبی عمر ازل سے ابد تک، طاقت دیکھو تو لامحدود اور بیٹا کل ایک تو عوام پر اتنا اثر ہوا کہ لوگوں نے تالیاں پیٹ دیں کہ ہار گیا پادری اور وہ بے چارہ چلا رہا ہے کہ بات تو سنو لوگوں نے کہا تو جھوٹا ہے تیرے سے جواب نہیں بن رہا ہے غرض مسلمان مناظرہ جیت گئے اور اشتہار دے دیا کہ پادری صاحب ہار گئے اور مسلمان جیت گئے..... خیر مجھے بات یہ کہنی تھی کہ یہ واقعہ حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو مولانا نے فرمایا بھٹیارے نے یہ جواب بڑا عالمانہ دیا مگر اس کے پاس علمی الفاظ نہ تھے بات جو کہی وہ بڑی علمی ہے۔

تو فرمایا کہ: اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر اللہ کے لئے اولاد ہونا کوئی کمال کی بات ہے تو اللہ پاک کا ہر کمال لامحدود ہوتا ہے تو اولاد بھی بے انتہا ہوتی کہ کوئی گنتی نہ ہو سکتی، اور اگر اللہ کے لئے اولاد کا ہونا کمال نہیں تو ایک بیٹا ہوگا وہ بھی عیب ہوگا تو ایک اولاد سے بھی بری ہے تو فرمایا یہ مطلب تھا بھٹیارے کا مگر اس کے پاس علم کے لفظ نہیں تھے بے چارہ نے اپنے جاہلانہ انداز میں بات کہی مگر بات سچی کہی۔

تو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ① کہ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ جیسی برتر مقدس اور بے مثل ذات کے ساتھ شریک کریں، اعتقاد یا عبادت میں شریک کریں عبادت میں شریک نہ کریں تو افعال میں شریک کریں۔

آغاز شرک...... یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شرک کا انتہائی طور پر رد کیا ہے اور مذاہب جو حق ہیں ان میں بھی شرک کا رد ہے مگر اسلام نے فقط شرک کا ہی رد نہیں کیا بلکہ اسباب شرک کو بھی دفع کیا ہے تو اور مذاہب نے شرک کا مقابلہ کیا اسلام نے جتنے شرک کے اسباب تھے ان کا بھی مقابلہ کیا کہ شرک آنے ہی نہ پائے مثلاً تصویر ہے شرعاً اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ شرک کی ابتداء تصویر سے ہوتی ہے تو ہر تصویر سے منع کیا گیا کہ تصویر مت لو اور مت بناؤ اپنی تصویر...... ایک تو مجبوری کی بات ہوتی ہے کہ جب آپ حج کو جا رہے ہیں، بغیر تصویر کے پاسپورٹ قابل قبول نہیں یہ آپ کا فعل نہیں آپ مجبور ہیں یا تو فرض ترک کر دیں یا فرض کی ادائیگی کرنی ہے تو تصویر کھنچوانی پڑے گی بعض باتیں ممنوع ہیں جیسے جہاد ہو اور مجاہدین میں کچھ جہلاء ہوں وہ باجے گانے بجائیں تو اس میں علماء کو بھی شامل ہونا پڑے گا جہاد کا فریضہ نہیں چھوڑیں گے تو بعض صورتیں ہوتی ہیں۔ مجبوری کی مگر اس میں بھی جنس ممنوع رہتی ہے صرف بعض مخصوص صورتوں میں فقہاء نے جواز کا فتوے دیا ہے وہ مجبوری کی شکلیں ہیں جو پیش آتی

ہیں غیر جاندار کی تصویر میں کوئی حرج نہیں جیسے سبزی ہے پہاڑ ہے دریا ہے لیکن بلاضرورت بلا مجبوری خود بخود تصویر کا شوق رکھنا یہ شرک کی عادت پیدا کرتا ہے۔

یہیں سے شرک کا آغاز ہوا ہے قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم سے شرک شروع ہوا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں ہابیل اور قابیل میں سے قابیل نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کیا تھا قابیل کی ساتویں پشت سے کفر ظاہر ہوا، اس قتل، ناحق پر اللہ نے لعنت کی تو اس کی نحوست کا اثر ساتویں پشت تک گیا تو قابیل کی نسل میں ساتویں پشت میں جا کر شرک پیدا ہوا اور جتنی قاتل قومیں ہیں وہ اکثر وبیشتر قابیل کی اولاد میں سے ہیں حضرت نوح علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے اس قوم میں پانچ بزرگ تھے، جن کا نام قرآن میں ہے۔

وَدّ ،سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر یہ پانچ صالح بندے تھے انکی مجالس میں بیٹھ کر قوم کا علم وایمان تازہ ہوتا تھا ان کی ہدایت سے نیکی کی طرف توجہ ہوتی تھی جب ان بزرگوں کا انتقال ہوا قوم نے ماتم منایا کہ صالحین اٹھ گئے، اب کن کی مجلس میں جائیں اور کن سے ہدایات حاصل کریں۔ شیطان نے دل میں یہ بات پھونک دی کہ وہ بزرگ تو چلے گئے اچھی صورت یہ ہے کہ ان کے بت بنا کر اپنی عبادت گاہوں میں رکھ لو، تاکہ ان کی شکلیں دیکھ کر تمہیں خدا یاد آئے اور دل میں ذکر اللہ پیدا ہوتا رہے، تو انہوں نے ان پانچوں بزرگوں کے بت تراشے اور مساجد وعبادت گاہوں میں رکھ دیئے مقصد یہ نہیں تھا کہ شرک کریں مقصد یہ تھا کہ ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلس یاد آ جائیں گی اور دل میں ایمان تازہ ہوگا تو ہم اچھی طرح عبادت کر سکیں گے۔

چنانچہ ابتداء کی نسل یہی کرتی رہی۔ اس نے قطعاً بت پرستی نہیں کی بتوں کو تذکیر اور یاد دہانی کا آلہ بنایا۔ دوسری نسل جب آئی اس کے ذہن میں یہ معرفت نہیں تھی جو پہلی میں تھی تو اس نے کچھ کچھ ان بتوں کی تعظیم کی اور عبادت اللہ کی کرتے رہے۔ تیسری نسل میں آکر ان بتوں ہی کے سامنے سجدہ شروع ہو گیا منتیں مانی جانے لگیں، نذر و نیاز ہونے لگے اب خدا کو تو بھول گئے اور ان پانچ بتوں کے بندے بن گئے عبادت نیاز ان بتوں کی، ان کے سامنے سجدہ کرنا، ان سے مرادیں مانگنا ان سے اولاد کی خواہش کرنا اب یہ شروع ہو گیا۔ یہی شرک کا آغاز ہے جس کی اصلاح کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا تو بت پرستی کا آغاز تصویر سازی سے ہوئی! اس لئے اسلام نے سرے سے شرک کی جڑ اکھاڑ دی کہ مسلمان اس سے کوئی مناسبت پیدا نہ کرے کوئی مجبوری پیش آئے، عالم فتوے دے تو گنجائش ہے لیکن شوق اور شغف سے ممنوع ہے مکانات کی زینت تصویر بن جائے اور اخبارات کی بھی بن جائے اور اس درجے پر پہنچ جائے کہ چاقو پہ تصویر قلم پہ تصویر چمچے پر تصویر، لیٹر پر، تمغہ وسکہ پر تصویر یہ انتہائی طور پر تصویر سازی اور تصویر بازی ہے اس سے شریعت نے روک دیا اس لئے کہ یہ شرک کا سبب بنا ہے تو اسلام نے ان اسباب کو قطع کر دیا جن سے شرک کی طرف توجہ منعطف ہو۔

تصویر سازی پر ایک شبہ کا جواب...... اب آپ یہ کہیں گے کہ مثلاً عیسائیوں میں تصویر سازی ہے مگر بت

پرستی نہیں ہے تو پھر تصویر سازی سے بت پرستی کہاں پیدا ہوئی؟ ہم بھی اگر گھر میں تصویریں ٹانگ لیں اور بت پرستی نہ کریں تو کیا حرج ہے....؟

اول تو یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ عیسائیوں میں بت پرستی نہیں حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصاویر گرجاؤں میں ہوتی ہے یہاں تو دیکھنے میں نہیں آئیں مگر ایسٹ افریقہ جانا ہوا، وہاں پر غالباً رومن کیتھولک پارٹی کے عیسائی زیادہ ہیں چرچ بھی بہت ہیں۔ ہر ہر گاؤں اور شہر میں چرچ ہے وہاں میں نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت جگہ جگہ بنا ہوا ہے تو جب وہاں سے گذرتے ہیں تو جھک کر گذرتے ہیں یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر یہ کہ جو تصویر بنائی ہے یہ ضروری تو نہیں کہ بعینہ وہی صورت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تھی یہ تو فرضی طور پر بنالی کہ یہ بنا کے رکھدو اور یہ فرض کرلو کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ورنہ اس کی کیا سند ہے کہ یہ بعینہ وہی شکل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت مریم علیہا السلام کی تھی اور جب نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صورت نہیں نام ہی نام ہے اسی کو قرآن نے فرمایا ہے۔

﴿اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ [1] یہ بتوں پر نام رکھ لئے ہیں کہ یہ فلاں ہے حالانکہ یہ صورت ان فلاں کے مطابق نہیں ہے تو فرضی ناموں کی عبادت کر رہے ہو ہوائی عبادت ہے تمہارے سامنے نہ کوئی شخصیت ہے نہ کوئی معبود ہے اسماء اور نام رکھے ہوتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ﴾ [2]

ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم شرک اختیار کریں اللہ کا سہیم اور شریک بنا کر اس کی عبادت کریں اور یہ بھی فرمایا کہ: یہ شرک سے بچنا عقل کا ثمرہ نہیں ہے یہ تو جب اللہ کا فضل ہوتا ہے تو آدمی اس برائی سے بچتا ہے محض عقل برائی سے نہیں بچا سکتی بڑے بڑے عقلمند بھی مشرک گزرے ہیں آج بھی شرک کرنے والے بڑے دانا بڑے عقلمند ہیں دنیا کی حکومتوں کے معاملات ان کی عقلوں پر طے ہوتے ہیں اور وہ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں بت پرستی میں مبتلا ہیں۔

توفیق خداوندی پر ایک واقعہ...... مجھے بات یاد آئی ایک صاحب کے ہاں ایک بوڑھا شخص ملازم تھا، اس کے آقا کی تو یہ حالت تھی کہ نہ کبھی مسجد میں گئے اور نہ کبھی کوئی سجدہ کیا۔ ایک دن آقا بازار گئے تو اس بوڑھے ملازم کو ساتھ لیا تا کہ جو سامان خریدیں وہ ملازم کے سر پر لاددیں وہ گھر پہنچائے، راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، اذان ہوئی تو بوڑھے نے کہا، صاحب! میں تو نماز پڑھنے جاتا ہوں، وہ بڑے خفا ہوئے کہ یہ بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، نماز کے سوا اور بھی اسے کوئی کام رہ گیا ہے؟ وہ بے چارہ تلملایا اس نے کہا بہر حال صاحب آپ آقا ہیں جو چاہیں کہہ لیں مگر مجھے نماز تو پڑھنی ہے وہ نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا، ا

در آقا مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوگئے، وہ مسجد کے اندر داخل نہیں ہوئے بوڑھے نے فرض ادا کئے اس کے بعد سنتوں کی نیت باندھی سنتوں کا سلام پھیرا تو آقا کو خیال آیا کہ اب آ جائے گا اس نے اوابین کی نیت باندھ لی اب انہیں باہر کھڑے پریشانی بڑی مشکل سے صبر کیا جب دو رکعتوں پر سلام پھیرا تو زور سے کہا ارے بھائی جلدی سے آؤ اس نے کہا جی مجھے آنے نہیں دیتے یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی آقا پھر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

جب اس نے دوسری دو رکعتوں کا سلام پھیرا تو کہنے لگا جلدی کیوں نہیں آتا کہ ''جی مجھے آنے نہیں دیتے'' یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب انہیں غصہ آ رہا ہے کہ یہ عجیب بے ڈھنگا ملازم میرے کام کا حرج ہو رہا ہے، وقت ضائع ہو رہا ہے اور یہ کہے جا رہا ہے کہ آنے نہیں دیتے جب چھ رکعت پر سلام پھیر تو اس نے کہا ''کون نہیں آنے دیتے''؟ اس نے کہا جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے تو حقیقت یہ ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ اپنے جذبے سے نہیں وہ خدا کی توفیق سے پڑھتا ہے اگر توفیق نہ دیں تو لاکھوں عقلمند مارے مارے پھرتے ہیں انہیں سجدہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی، تو سجدہ نہ کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ وہ سجدہ نہیں کر رہا بلکہ اس سے کرایا نہیں جاتا اور جو سجدہ کر رہا ہے وہ خود سے نہیں کر رہا ہے اسے قبول کر لیا گیا ہے اس سے سجدہ کرا رہے ہیں عبادتیں کرا رہے ہیں تو عبادت کا چھوڑنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے عبادت چھوڑ دی، اس کی کیا مجال تھی کہ وہ چھوڑتا اسے قبول نہیں کیا گیا سے دھتکار دیا گیا اس واسطے وہ عبادت نہیں کرتا اور جو کر رہا ہے۔ وہ اپنی عقل اور جذبے کا ثمرہ نہ سمجھے یہ تو توفیق خداوندی ہے شکر کرے کہ وہ پکڑ نہیں کرتے تو اس بوڑھے نے ٹھیک کہا جو تجھ کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتے، وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتے۔ تو یہ اس کی توفیق ہے ایک کو دے دی اس نے نماز پڑھ لی اور جس کو نہیں دی وہ نماز کا تارک ہو گیا تو آدمی نیکی کر کے کبھی غرور نہ کرے کہ میں نے نیکی کی ہے۔

غرور اعمال کو ضائع کر دیتا ہے...... حدیث میں ہے اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی ہے میں نے روزہ رکھا ہے تو حق تعالیٰ فوراً جواب دیتے ہیں، نامعقول تو نے کیا کیا......؟ ارے جاہل قوت تو تجھے میں نے دی ارادہ تیرے اندر میں نے پیدا کیا طاقت تجھے میں نے بخشی تو نے کیا کیا....؟ اور اگر سب کچھ کر کے کوئی یوں کہتا ہے اے اللہ مجھ سے تو کچھ بھی نہ بن پڑا بس جو کچھ ہے تیرا فضل ہے اگر تو فضل نہ فرماتا میں نیت بھی نہ کر پاتا میں ارادہ و عمل بھی نہ کر سکتا۔ یہ تیرے کرائے کر رہا ہوں میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تو اس کو سراہتے ہیں فرماتے ہیں ارادہ تو تو نے ہی کیا تھا نیت تو تو نے ہی کی تھی، مسجد تک تو تو ہی گیا تھا تو نے سب کچھ کر لیا تو جو خود کہتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہے اسے رد کر دیتے ہیں اور جو سب کچھ کر کے کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میرے سے کچھ نہیں بن پڑا، فضل تھا...... حق تعالیٰ فرماتے ہیں بیشک فضل تو ہمارا تھا مگر کام تو نے کیا ارادہ تو نے کیا تو اس کی نیکی کو سراہتے ہیں تو اسلام میں جو کام چلتا ہے فضل خداوندی سے چلتا ہے عقل و جذبہ کام نہیں دیتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَنْ يُنْجِيَ أَحَدَكُمْ

عَمَلُهٗ'' تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ آخرت میں نجات فضل خداوندی سے ہوگی اس پر حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللہِ!'' یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ پیغمبر کا عمل کتنا وزنی اور کتنا عظیم ہوتا ہے تو آپ کا عمل؟ فرمایا: ''لَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللہُ بِرَحْمَتِہٖ'' مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا ① جب تک اللہ ہی کا فضل شامل حال نہ ہو تو حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ بھی نجات و توفیق ہے فضل خداوندی سے ہے ہمارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب..... مگر بھائی ایسا مت کی جیو کہ جب نجات فضل خداوندی سے ہوتی ہے تو پھر آج سے عمل چھوڑ دیں عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جب فضل ہو جائے گا نجات ہو جائے گی عمل تو نجات نہیں دلائے گا۔

ایسا مت کرنا! بلاشبہ اللہ کے فضل سے نجات ہوگی ہمارے عمل سے نہیں مگر ہمارا عمل اللہ کے فضل کی علامت ہے عمل کرنے والا جب عمل کر رہا ہے تو یہ اللہ کا فضل متوجہ ہونے کی دلیل ہے عمل اگر چھوڑ دیا تو یہ علامت ہوگی کہ اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے تو نجات تو فضل سے ہوگی عمل سے نہیں ہوگی مگر عمل کا ہونا اللہ کے فضل کے متوجہ ہونے کی دلیل ہے بلا فضل ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے۔ ②

آدابِ دُعا..... اس کی حکمتوں اور اس کی شان کے پہچاننے والے انبیاء ہیں اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے توجہ دلائی کہ تمہارا کام یہ ہے کہ مانگو تو اللہ سے مانگو، حکمت اور ڈھنگ سے مانگو، اس طرح مت مانگو جو اس معبود کی شان کے مناسب نہ ہو۔ لاچی ماری بات وہاں نہیں چلتی، بے پرواہ کی بھی وہاں نہیں سنی جاتی ''لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ'' ③ دل کو متوجہ کر کے اللہ کو حاضر و ناظر اور اپنے کو بے چارہ سمجھ کر اور اس یقین کے ساتھ کہ لے کے ہٹوں گا، ویسے نہیں جاؤں گا، اس سے مانگے یعنی استغنا کے ساتھ نہ مانگے، اس طرح مانگنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

''یَارَبِّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ'' اللہ میاں! اگر آپ چاہیں تو میری مغفرت کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تو نہیں چاہتا آپ کا جی چاہے تو بخش دیجئے گا مجھے تو آپ کی مغفرت کی ضرورت نہیں ہے تو یہ مانگتا ہے یا اپنے استغناء کا اظہار کرنا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ: ان شئت، اے اللہ اگر تو چاہے کا کیا مطلب؟ یوں کہو رَبِّ اغْفِرْلِیْ اے اللہ بخش دیجئے وہ تو جبھی بخشیں گے، جب چاہیں گے مگر تم کون ہو یہ کہنے والے کہ اگر آپ چاہیں اس کا مطلب تو یہ نکلا کہ میں تو نہیں چاہتا، آپ کا جی چاہے تو دے دیں نہیں تو میں مستغنی ہوں یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں اس سے تو

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة رقم: ۵۹۸۲. ② یہاں تقریر کا کچھ حصہ فنی خرابی کے باعث ریکارڈ نہ ہو سکا اس لئے وہ ضبط تحریر میں نہ آسکا ﴿مَا کَانَ لَنَا اَنْ نُشْرِکَ بِاللہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیة: ۳۸) کا بیان ہو چکا ہے آگے ﴿ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیة: ۳۸) کا بیان ہے، درمیان میں رہ جانے والا حصہ زیادہ نہیں ہے، تاہم اس پر مرتب بھی معذرت خواہ ہے۔

③ السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳.

غنا ملے گی مُراد تھوڑا ہی ملے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جیسے ایک اعرابی نے دعاء مانگی تھی "ارحمنی ومحمد ولاترحم معنا احداً" یا اللہ میری مغفرت کردے اور کسی کو نہ کی جیو پورے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" ① بندہ خدا یہ کوئی مانگنے کا ڈھنگ ہے لامحدود رحمت کو سمیٹ کر تو نے صرف اپنے لئے کرلیا اور ساری دنیا کو محروم کردیا، اپنے لئے بھی مانگو مگر دوسروں کو کیوں محروم کرتے ہو......؟

یا جیسے ایک اور اعرابی نے دعا مانگی تھی "اَللّٰهُمَّ هَبْ لِیَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ فِی الْجَنَّةِ" ② یا اللہ مجھے جنت میں سفید محل دیجیو وائٹ ہال مجھے عطا کردیجئے یہ دعا مانگی آپ نے فرمایا کہ: یہ کیا دعا ہے کہ وہ اس رنگ کا ہو کرسیاں ایسی ہوں فرنیچر ایسا ہو گویا اللہ میاں کو مشورہ دے رہے ہو، یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں ہے بہرحال دعاء کے آداب سکھائے گئے، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مانگنے کے ڈھنگ کون جانتا ہے اس واسطے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جو خالق ہے وہ حاکم بھی ہے اسی کے حکم کا اتباع کرنا پڑے گا مانگنے میں، سوال میں، استعانت میں مدد چاہنے میں بھی، اب یہ وعظ جو حضرت یوسف علیہ السلام نے سنایا تو ان دونوں جوانوں کے دل میں اثر کرگیا اور انہوں نے ایمان قبول کرلیا، یہی مقصد وعظ تھا۔

خواب کی تعبیر...... جب مومن بن گئے تو اب تعبیر بتلادی کہ یہ خواب کی تعبیر ہے اور فرمایا: جس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اس کی خطا معاف کی جائے گی وہ بدستور بادشاہ کا شراب پلانے والا رہے گا اور جس نے یہ دیکھا ہے کہ سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور چیل کوے کھا کھا کے جارہے ہیں وہ باورچی ہے اس کو پھانسی دیجائیگی، چنانچہ یہی ہوا جیل سے دونوں لیجائے گئے اور عدلیہ میں پیش ہوئے تو ایک کو بخش دیا گیا اور بخش کراس کی ملازمت بحال کردی گئی اور ایک کو پھانسی دے دی گئی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد حاصل ہوگیا تھا کہ دونوں مومن ہوگئے تھے اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُ كُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَّاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ . قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ﴾ ③ ......ایک کی خطا معاف اور ملازمت بحال کردی جائے گی اور ایک کو پھانسی ہوگی اور چیل، کوے اس کو نوچیں گے، بات پکی ہوگئی، اب ردّوبدل نہیں ہوگا جو تعبیر مانگتے تھے وہ ہوگئی۔

باہمی خیر خواہی میں آخرت کا تقدم...... تو تعبیر دی مگر درمیان میں اتنا وعظ اتنی نصیحت فرمادی کہ دلوں کا رشتہ

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب الارض يصيبها البول ج: ۱ ص: ۲۶۲.

② لم اجد هذه الرواية بهذا السياق الا ان الامام ابا داؤد اخرجه فی سننه بلفظ: ان عبدالله بن مغفل سمع ابنه يقول: اللهم انی اسئلک القصر الابيض عن يمين الجنة، کتاب الطهارة، باب الاسراف فی الماء ج: ۱ ص: ۱۳۴.

③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۴۱.

درست فرمایا۔ دلوں میں ایمان پیدا کر دیا تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ وہ کلمۂ حق پہنچانے کے لئے حیلے تلاش کرتے ہیں...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں آپ اور ساری اُمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے آپ کو حرص تھی کہ ساری دنیا اسلام قبول کر لے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت سے چاہتے تھے کہ ایک ایک آدمی کلمۂ حق کا تابع بن جائے تو جب یہ ساری امت مل کر قائم مقام، تابع اور خلیفہ ہے اپنے پیغمبر کی تو ہمارا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں ہر وقت مگن رہیں اور دنیا سے زیادہ ایک دوسرے کی آخرت کی خیر خواہی ہے کسی سے بُرائی سرزد ہوا سے پیار سے سمجھایا جائے، شفقت سے بتلایا جائے لڑائی کی صورت نہ پیدا کی جائے، سخت دلی سے نصیحت نہ کی جائے، وہ موثر نہیں ہوتی۔

طرزِ نصیحت کیسا ہو؟...... محبت اور اس جذبے سے نصیحت کی جائے کہ کسی طرح قبول کر لے بعض اس جذبے سے نصیحت کرتے ہیں کہ میرا فرض ادا ہو جائے یہ چاہے جہنم میں جائے یا جنت میں یہ نصیحت کا طرز نہیں انبیاء علیہم السلام اس طرح نصیحت نہیں کرتے وہ تو یہ چاہتے ہیں جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ کسی طرح مان جائے، کبھی لالچ دیتا ہے، کبھی گھورتا ہے، کبھی مارتا پیٹتا ہے، باپ کا یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ میں نصیحت کر دوں، اب یہ چاہے جنت میں جائے یا جہنم میں، چاہے بدنام ہو برباد ہو، مجھے پرواہ نہیں! وہ تو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ سیدھے راستے پر آ جائے یہی انبیاء کی شان ہے وہ اپنے کو ذمہ سے بری کرنے کیلئے نہیں بلکہ مخلوق کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے نصیحت کرتے ہیں تو کبھی ڈراتے ہیں کبھی پیار کرتے ہیں کبھی دنیا کا لالچ اور کبھی آخرت کی نعمتوں کا لالچ کہ کسی طرح بندہ مان جائے تو جو امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اس کا بھی یہی فرض ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے تا کہ امت کا راستہ صحیح ہو جائے، یہ نہ ہو کہ ہم کسی کو برائی میں دیکھیں اور کسی وقت بھی اُسے متنبہ نہ کریں ایسا ہوگا تو ساری امت کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث ہوگا، کسی نہ کسی وقت موقع پا کر شفقت سے سمجھا دیا جائے کہ بھائی تیرے اندر یہ برائی ہے اسے چھوڑ دو، وہ آج نہیں تو کل کل نہیں تو کبھی تو مانے گا تو مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے اور سختی سے بھی پیش نہ آنا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ بڑے ولی کامل محدث اور عالم کبیر گزرے ہیں مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے ایک نوجوان آیا۔ جلدی جلدی وضو کی تو پاؤں کے ٹخنے خشک رہ گئے، پیر دھوئے مگر ایڑیاں خشک رہ گئیں اور حدیث میں ہے کہ۔

''وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ'' ① جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلے گی...... شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کی مگر کس عجیب طریق سے نصیحت فرمائی.... یہ نہیں کہا او نوجوان! تیری وضو نہیں ہوئی، جاؤ وضو کر اور

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من رفع بالعلم صوتاً ج: ۱ ص: ۱۰۵.

تیری ایڑیاں جہنم میں جلیں گی..... فرمایا: بیٹا! ذرا میرے پاس آنا وہ نوجوان آیا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھا، فرمایا بیٹا میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور وضو کرنے میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایڑیاں خشک رہ جاتی ہیں اور حدیث میں فرمایا گیا ہے جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلائی جائے گی۔ تو ذرا میرا پیر دیکھنا کہیں ایڑی خشک تو نہیں رہ گئی وہ نوجوان رو پڑا اور اس نے کہا حضرت آپ کی ایڑی تو کیوں خشک ہو یہ گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا وضو مکمل کیا کروں گا،...... پھر چمکایا پیار کیا فرمایا: جزاک اللہ بارک اللہ سعادت مند نوجوانوں کا یہی کام ہوتا ہے اس کا دل بڑھ گیا...... اور اگر یوں فرماتے او نوجوانوں! جاؤ وضو کر تیری ایڑی جہنم میں جلے گی، وہ کہتا جناب، مجھے اپنی قبر میں سونا ہے تمہیں اپنی قبر میں اپنی فکر کریں میری فکر میں کیوں پڑے؟ میرے اوپر تو گذرے گی جلنے دو جہنم میں تمہیں کیوں درد اٹھ رہا ہے اس کا یہ جواب ہوتا۔ اور یہ شفقت کا جو طرز اختیار کیا تو اس کا جواب یہ تھا، رو کے ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا، تو نصیحت کرنے کا بھی ڈھنگ ہے محبت شفقت اور مخاطب کی ذہنیت پہچان کر اس کے مطابق بات کی جائے تو دل میں اثر ہوگا۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام کے وعظ سے عبرت پکڑی جائے کہ ذرا سا موقع ملا تو فوراً نصیحت فرمائی اور دل میں ایمان اتار دیا یہی ہم سب کا فرض ہونا چاہیے کہ ذرا بھی ماننے کی استعداد اور صلاحیت دیکھیں تو کلمۂ حق کہنے سے نہ چوکیں مگر شفقت و حکمت کے ساتھ لاٹھی ماری والی بات نہ ہو، ورنہ اس کا برا اثر ہوتا ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ طریقہ بتلا دیا اور اس کو اللہ نے نقل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی وحی آئی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں تعلیم دے رہے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے ہمیں عبرت دلا رہے ہیں کہ دین کا پہنچانا فرض ہے مخلوق کے راستے کو درست کرنا فرض ہے جیسے جیل کے دو نوجوان بھٹکے ہوئے تھے۔

استعداد پیدا ہونے پر نصیحت کرنا...... بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، ہمارے بھی عزیزوں میں سے تھے۔ نوجوانی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت ہو چکے تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن یہ تھا چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ ٹخنے ڈھکے ہوئے اور چست اچکن جو بالکل بدن کے اوپر چپکا ہوا ہو اور سر پر عمامہ اس پر گوٹا لگا ہوا اور ہاتھوں پر مہندی لگی ہوتی اور چاندی کے چھلے بھی پڑے ہوئے ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی حافظ صاحب اسی لباس میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے اس میں بہت سی باتیں ناجائز ہیں ڈاڑھی چڑھانا ممنوع ہے ٹخنوں سے نیچا پائنچہ بھی شرعاً ممنوع ہے اور چوڑی دار پاجامہ تو بالکل عورتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے یہ بھی ممنوع ہے مگر حضرت فرماتے کچھ نہیں تھے اور علمی باتیں ہوتی رہتیں...... لوگوں کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ حافظ صاحب اتنے منکرات میں مبتلا ہیں حضرت سے بیعت بھی ہیں اور حضرت ان کو نصیحت نہیں کرتے ورنہ حکم تو یہ ہے کہ کسی منکر کو دیکھے تو نصیحت کرے، یہ تو معاذ اللہ مداہنت اور برائی پر سکوت ہے لیکن

حضرت اس کا انتظار کر رہے تھے کہ حافظ صاحب کے دل میں قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے تب نصیحت کروں گا، استعداد پیدا ہو جانے سے پہلے نصیحت رائیگاں جاتی ہے تو چار چھ مہینے کے بعد حضرت کو اندازہ ہوا کہ اب ان کے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہو چکی ہے اب عقیدت پوری طرح گھر کر چکی ہے اب نصیحت کرنے کا موقع آ گیا ہے۔

تو نصیحت بھی کس انداز سے کی یہ نہیں فرمایا کہ بھائی کس برائی میں مبتلا ہو چھوڑ دو بلکہ فرمایا، بھائی حافظ جی! ہمیں تم سے محبت اور تمہیں بھی ہم سے محبت ہے تو ہم میں اور تم میں دوستی ہے تو ہم دوست ہیں اور دو وضع میں رہیں۔ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا یا آج سے ہم بھی ڈاڑھی چڑھانا شروع کر دیں اور چوڑی دار پاجامے پہنیں یا تم چھوڑ دو جو دوست ہوں ان کو ایک وضع پہ رہنا چاہیے، یہ غلط ہے کہ ہم مشرق جا رہے ہیں تو تم مغرب کو دل کے اندر عقیدت آ چکی تھی محبت غالب آ چکی تھی بس دو جملے کہنے کی دیر تھی جیسے قلعی گر کے پاس آپ جب برتن لے جاتے ہیں تو برتن لاتے ہی اسی پر رانگ نہیں مل دیتا پہلے اسے آگ پر رکھ کے تپاتا ہے اور مانجھتا ہے جب یہ منجھ کر صاف ہو جاتا ہے آگ کی گرمی سرایت کر جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب اس کو چمکدار کرنے کا موقع آ گیا تو اس وقت رانگ لگا کر ذرا روئی پھیر دی اور پھر برتن چاندی جیسا چمک گیا اور اگر تپانے سے پہلے ہی رانگ ملے، تو ساری رانگ ختم ہو جائے گی برتن میں چمک نہیں آئے گی، اسی طرح سے دل کا برتن جب زنگ آلود ہو، اسے تپایا جاتا ہے اسے مانجا جاتا ہے تب تپا کر جب محبت وعقیدت اثر کر جاتی ہے ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے ذرا ایک رانگ لگائی ہاتھ پھیرا اور قلب کا برتن چمک گیا تو حضرت نے یہ دیکھا اور وہ دو منٹ بھر میں چمک گئے، حافظ محمد احسن رو پڑے اور مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جتنے چوڑی دار پاجامے تھے وہ تو بیوی کو دیے کہ یہ اب تو پہنتی رہو، میرے تو اب یہ کام کے نہیں رہے اور پندرہ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے جب تک کہ وہ مہندی کا اثر ہاتھوں پر سے گیا نہیں اور مہندی کی سرخی جاتی نہ رہی، چھلے بھی بیوی کو دیئے اور وہ جو عمامہ تھا اس کا گوٹا اتار کر اس کی ٹوپی بنوائی۔ ڈاڑھی جو چڑھی ہوئی تھی پندرہ بیس دن کے بعد وہ مقطع ڈاڑھی ہو گئی چوکنی ٹوپی اوڑھی، کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہنا۔ لانبہ کرتا پہن کر آئے اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑے عالم خواجہ خضر آ گئے ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ کر فرمایا بھائی سبحان اللہ! کیسی نورانی شکل ہے کیسی ایمان کی تازگی برس رہی ہے، معانقہ کیا اور لپٹ گئے تو اثر ہو گیا تھا۔ نصیحت قبول کر لی اور اگر پہلے ہی کہتے کہ بہت بری بات ہے یہ ہے اور وہ ہے، وہ آنا بھی چھوڑ دیتے ملنا بھی چھوڑ دیتے تو بعض دفعہ استعداد پیدا ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے جب صلاحیت آ جاتی ہے بس پھر ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے یہی کام ہمارا بھی ہونا چاہیے جو ہمارا بھائی کسی برائی میں مبتلا ہے تو سب کے اوپر اس کی خیر خواہی فرض ہے یہ فقط کسی عالم یا مولوی کے ذمہ نہیں ہے۔ ہر شخص کو امر بالمعروف بنایا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر بھی کرے۔

نصیحت کی زینت ......اور نصیحت کی زینت یہ ہے کہ وہ تنہائی میں ہو بھرے مجمع میں کسی کو خطاب کر کے فصیحت کرنا اسے شرمندہ ورسوا کرنا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس

مبارک میں صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا۔ کسی کی وضوٹوٹ گئی، ریح خارج ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہماری مجلس میں کوئی بے وضونہ بیٹھے وہ شخص جاکے وضوکرے جس کی وضونہ ہو، اب اس بیچارے کو مجلس سے اٹھنا بھاری ہوگیا۔ اس لئے کہ اگراٹھتا تو سب دیکھتے کہ جس کی وضوٹوٹی تھی وہ شرمندہ ہوتا اور نشانہ بنتا، اس سے نہ اٹھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: وہ شخص اٹھ جائے۔ اچھا یہ تھا جس کی وضونہیں ہے۔ ہماری مجلس میں بے وضونہ بیٹھے پھر بھی اٹھنے کی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ پھر نہ اٹھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اجازت دیجئے ہم سارے کے سارے وضوکرلیں۔ جن کی وضو ہے وہ دوبارہ کرلیں ان کی وضوتازہ ہوجائے گی اور جن کی نہیں ہے ان کی وضوہوجائے گی تو آپ نے اجازت دی اور سب نے اٹھ کر وضوکرلیا تو سب کا پردہ رہ گیا۔ تو بھرے مجمع میں اگر خطاب کرکے نصیحت کی جائے تو رسوائی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو تنہائی میں نصیحت ہو، اور اگر مجمع میں ہو تو کسی کا نام لے کر نہ ہو، کسی کو خطاب کرکے نہ ہو۔

مجمع میں نصیحت کا طریقِ کار...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہوجائے تو فرماتے کہ مسجد میں جمع ہوجاؤ لوگ مسجد میں جمع ہوجاتے، آپ اس طرح نہیں فرماتے کہ فلاں نے غلطی کی ہے فلاں سے یہ برائی سرزد ہوئی ہے بلکہ فرماتے "مَابَالُ اَقْوَامٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا" ① لوگوں کو کیا ہوا ایسی ایسی حرکت کرتے ہیں ایسی ایسی برائیاں کرتے ہیں۔ کسی کا نام نہیں لیتے تھے تاکہ اس کو شرمندگی نہ ہو تو نصیحت میں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کو خجل نہ کیا جائے، شرمندہ ورسوانہ کیا جائے۔ محبت وشفقت پیار اور حکمت سے نصیحت کی جائے۔

نصیحت کرنا صرف علما کا کام نہیں...... تو یوسف علیہ السلام کے وعظ کا واقعہ سنایا کہ یہ فریضہ ہم پر بھی عائد ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ چکے ہیں اب عام طور پر یہ ماحول پیدا ہوگیا کہ نصیحت کرنا صرف علماء کا کام ہے عام لوگوں کا کام نہیں ہے، یہ غلط ہے علما اپنی جگہ نصیحت کریں، عام لوگ اپنی جگہ ہر ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی ذمہ داری پوری کرے اس کا ایک اثر تو یہ ہوگا کہ جب آدمی دوسرے کو برائی سے روکے گا تو کم ازکم خود اس برائی میں کبھی مبتلا نہ ہوگا ورنہ اس کے دل میں خیال ہوگا کہ میں دوسرے کو کس منہ سے نصیحت کروں گا وہ کہے گا بھائی تم بھی اسی برائی میں مبتلا ہو۔ اس لئے جب انسان نصیحت کرنے کھڑا ہوگا پہلے اپنی اصلاح کرے گا اسے ڈر ہوگا کہ میں رسوانہ ہوں تو خود کی نصیحت سے خود کو بھی اور دوسروں کو بھی نفع پہنچتا ہے۔ تو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تبلیغ حق مسائل کا پہنچانا اور اپنے بھائیوں کو سمجھانا یہ ضروریات دین میں سے ہے اور ہر مومن مرد وعورت کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا وعظ سنایا۔ میرا وعظ ہوتا ممکن ہے آپ کہتے ہم تو آپ کا وعظ نہیں سننا چاہتے لیکن جب پیغمبر کا وعظ سنایا گیا تو وہ تو سننا ہی پڑے گا، ماننا ہی پڑے گا، اس واسطے میں نے یہ وعظ نقل کیا اور اس کی کچھ

① احیاء علوم الدین ج:۴ ص:۲۴۵۔ علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجه ابو داؤد من حدیث عائشةؓ دون قوله "وکان لایعیره" ورجاله رجال الصحیح

تشریح کی، اب میرے خیال میں وقت بھی کافی ہوگیا اوران آیات کی بقدر ضرورت تشریح بھی ہوگئی۔

اور مقصد بھی سامنے آ گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دین کی نصیحت عام ہونی چاہیے۔ اور یہ جب علم ہوگی جب علم ہوگا تعلیم عام ہوگی، تو اس وقت یہ چیز عام ہو جائے گی لیکن اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ کسی کو ایک مسئلہ معلوم ہو وہ ایک ہی بیان کرے۔ کسی کو دو معلوم ہوں وہ دو ہی بیان کر دے۔ کسی عالم کو پچاس معلوم ہوں وہ پچاس بیان کر دے۔ مگر دین کا چرچا ہونا چاہیے جس کو آج کل کے زمانے میں پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔ مگر پروپیگنڈہ افواہی چیز کا بھی ہوتا اس لئے دین کے مسائل کا چرچا ہونا چاہیے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)